اردو کا کلاسیکی ادب

یادگارِ غالب

از

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی

مرتبہ

خلیل الرحمان داؤدی

مجلس ترقی ادب ○ لاہور

طبع اول : دسمبر ، ۱۹۶۳ء

تعداد : ۲۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقیٔ ادب ، لاہور

مطبع : شفیق پریس ، لاہور

مہتمم : ایس - ایم - شفیق

سر ورق : زرین آرٹ پریس ، لاہور

قیمت : سفید کاغذ : نو روپے
اخباری کاغذ : سات روپے

بعونِ صناعِ مکین و مکان بفضلِ خلاقِ زمین و زمان

اُردو کا کلاسیکی ادب

یادگارِ غالب

از

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی

ناشر

مجلسِ ترقّیِ ادب ۲- نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

فہرست مطالب

پہلا حصہ

مرزا کے اخلاق و عادات و خیالات

دوسرا حصہ

مرزا کے کلام پر ریویو اور اس کا انتخاب

نثر فارسی

انتخاب از مکاتبات

مقدمه

از

خلیل الرحمان داؤدی

حالات مصنف

کیفیت آبا و اجداد

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کے حالات پر مشتمل مبسوط کتابیں موجود ہیں، اس لیے میں ان کے حالات انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کر رہا ہوں تاکہ 'یادگار غالب' کا مطالعہ کرنے والوں کو اس کے مصنف کے حالات زندگی کے لیے دوسری کتابوں کی تلاش و جستجو نہ کرنی پڑے۔

مولانا حالی کے آبا و اجداد کے سلسلے میں صرف ایک ہی ماخذ ہے جس سے حالی کے تمام تذکرہ نگاروں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ ماخذ خواجہ الطاف حسین حالی کے خود نوشت حالات زندگی ہیں جو انھوں نے نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کی فرمائش پر ۱۹۰۱ء کے آغاز میں قلم بند فرمائے تھے۔ حالی کی یہ خود نوشت سوانح عمری مکتوبات حالی اور مقالات حالی کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ حامد حسن قادری صاحب نے بھی اسے 'داستان تاریخ اردو[1]'

۱۔ داستان تاریخ اردو، طبع دوم، عزیزی پریس آگرہ ۱۹۵۷ء، صفحات ۵۲۷ تا ۵۳۵۔

اشراف خاندان کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد علماء و شعراء و دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدر دان تھا اس لیے اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے - اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہند پر آمادہ کیا تھا - چناں چہ سلطان غیاث الدین نے انھیں عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ آراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و تشخیص نرخ بازار اور تولیت مزارات آئمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت عیدین ان سے متعلق کر دی - پانی پت میں اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے، وہ انھیں بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے - میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں، بیٹی تھیں -''

خواجہ ملک علی کے ساتھ ان کے دو صاحب زادے خواجہ محمد مسعود اور خواجہ محمد نصیر الدین بھی پانی پت آئے تھے - ان کے ورود کا سن صحیح طور پر معلوم نہیں - ایک صاحب نے نہ معلوم کس سند کی بنا پر ۶۷۵ھ

مطابق ۱۲۷۶ء لکھا ہے۱ - خواجہ ملک علی نے پہلے سلطنت مغلیہ کے عہد میں اور بعد میں شاہان اودھ کے دربار میں بڑا رسوخ و اقتدار حاصل کیا تھا - خواجہ حالی خود لکھتے ہیں کہ ان کے اجداد میں سے کسی نے ملازمت نہیں کی اور اسی ملک و مدد معاش پر قانع رہے، جو سلاطین اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً ان کو عطا ہوتی رہی۔ البتہ خواجہ حالی کے والد خواجہ ایزد بخش اس خاندان کے پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے محکمۂ نمک میں سرکار انگلشیہ کی ملازمت اختیار کی -

مولانا حالی کے حالات پر سب سے پہلی کتاب یا رسالہ وہ ہے جو 'حالات حالی' کے عنوان سے دار الاشاعت، صوفی ، پنڈی

---

۱ - یہی بزرگ اس سے قبل خواجہ عبداللہ انصاری کا سن وفات ۴۸۱ھ اور آق خواجہ کو سلطان مسعود بن محمود غزنوی کا شکست خوردہ لکھ چکے ہیں - خواجہ عبداللہ انصاری کے سال وفات سے یہ واضح ہے کہ وہ خود سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے عہد کے بزرگ ہیں - اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خواجہ عبداللہ انصاری اور آق خواجہ دونوں معاصر ہیں ، حالاں کہ یہ غلط ہے - خواجہ حالی نے اپنے خود نوشت حالات میں خود لکھا ہے کہ خواجہ ملک علی کا سلسلۂ نسب ۱۸ واسطے سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطے سے آق خواجہ تک پہنچتا ہے - اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری اور آق خواجہ دو مختلف العہد بزرگ ہیں اور ان کے زمانوں میں کم از کم ۸ واسطوں کا فصل ہے - انھیں بزرگ نے جو سلسلۂ نسب دیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے : ''آق خواجہ بن خواجہ محمد بن خواجہ فضل اللہ بن خواجہ عبداللہ بن خواجہ اسعد بن شیخ محمد ثانی بن شیخ نصیر بن شیخ محمد اول بن شیخ الکرام خواجہ عبداللہ انصاری -

بہاؤالدین ضلع گجرات سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس رسالے کے مصنف جناب سیماب اکبر آبادی ہیں۔ اگرچہ یہ صرف ۳۶ صفحات کا رسالہ ہے لیکن چوں کہ حالی کے حالات پر پہلی کتاب ہے اس لیے لائق توجہ ہے۔ اس سے قبل حالی خود اپنے حالات ۱۹۰۱ء میں لکھ چکے تھے۔ تعجب ہے کہ سیماب صاحب نے اس رسالے میں بعض حد درجہ فاحش غلطیاں کی ہیں۔ مولانا حالی کے والد صاحب کا نام تک صحیح نہیں لکھا۔ خواجہ ملک علی (جو غیاث الدین بلبن کے عہد میں وارد ہند ہوئے) کو حالی کا والد لکھا گیا ہے اور اس پر بار بار اصرار کیا گیا ہے کہ خواجہ ملک علی کو ہی حالی کا والد سمجھا جائے۔ ان کے رسالے کے چند جملے نقل کرتا ہوں:

> ''آپ کے والد ماجد کا نام خواجہ ملک علی تھا ...... آپ کے والد ماجد بھی ہرات ہی سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ حسن خدمات کے صلے میں پانی پت اور اس کا ملحقہ علاقہ کفالت کے لیے خواجہ ملک علی کو دے دیا گیا۔ آپ اس پرگنے میں منصب قضاءت پر بھی مامور رہے۔ نماز عیدین کی امامت، درگاہوں اور بزرگوں کی خانقاہوں کی تولیت، نرخ بازار کا تعلق سب کچھ آپ ہی کے ذمے تھا ..... آپ ابھی کم سن ہی تھے کہ خواجہ ملک علی نے اختلاج قلب کے ناقابل برداشت حملوں سے تنگ آکر داعی اجل کو لبیک کہا اور آپ یتیم ہو گئے۔ اگر قدرت استعداد عطا کرتی تو عجب

نہ تھا کہ باپ کے آپ سچے جانشین ہوتے اور وہی فرائض جو خواجہ ملک علی ادا کیا کرتے تھے، آپ کی ذات سے بھی اس زمانے میں اسی طرح پورے ہوتے ۔ مگر تقاضائے کم سنی سے آپ مجبور رہے اور وہ خدمات کسی اور شخص پر منتقل ہو گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

سیماب صاحب کو اصرار ہے کہ ہم مولانا حالی کے مورث اعلیٰ کو ان کا والد سمجھ لیں جن کے زمانوں میں تقریباً چھ سو برس کا فاصلہ ہے ۔

ولادت ، تعلیم و تربیت

مولانا حالی اپنے خود نوشت حالات میں رقم طراز ہیں :

"میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بہ مقام پانی پت جو شاہ جہاں آباد سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے ، واقع ہوئی ۔"

تقریباً تمام تذکرہ نگار اس سے متفق ہیں ۔ لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ سیماب صاحب کس شہادت کی بنا پر سن ولادت ۱۸۳۴ء قرار دیتے ہیں[1] ۔ سیماب صاحب کے علاوہ ایک بزرگ اور بھی ہیں جو سال ولادت ۱۸۳۶ء لکھتے ہیں[2] ۔

---

۱ ۔ 'حالات حالی' از سیماب اکبرآبادی ناشر دارالاشاعت صوفی، پنڈی بہاؤالدین ضلع گجرات ، مطبوعہ ۱۹۲۰ء ، صفحہ ۱ ۔

۲ ۔ 'تذکرۂ حالی' مطبوعہ حالی بک ڈپو پانی پت ۱۹۳۵ء ، صفحہ ۳۱ ۔

مولانا حالی کی عمر صرف ۹ سال کی تھی کہ اُن کے والد ایزد بخش کا انتقال ہو گیا - ناصح زاہدی صاحب لکھتے ہیں کہ والدہ پہلے ہی فوت ہوچکی تھیں[۱] - حالی اپنے خود نوشت حالات میں بیان کرتے ہیں :

''میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور میرے والد نے سن کہولت میں انتقال کیا جب کہ میں ۹ برس کا تھا - اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہ پایا -''

حالی کی اس تحریر سے صاف واضح ہے کہ حالی کی والدہ مختل الحواس تھیں ، لیکن اس کے باوجود ایک صاحب لکھتے ہیں :

''خانگی تفکرات کی وجہ سے ایک استغراق کے عالم میں رہتی تھیں[۲] -''

چناں‌چہ جس شخص کی کیفیت یہ ہو کہ وہ ہوش سنبھالتے ہی خود کو یتیم پائے اُس کی تعلیم و تربیت کا کیا انتظام ہو سکتا ہے - بہر حال بھائی بہنوں نے خواجہ حالی کو حافظ قاری ممتاز علی صاحب سے قرآن حفظ کرایا - اس کے بعد انھیں باقاعدہ تعلیم کا موقع نہ ملا ، گو حالی کی طبیعت میں اکتساب علوم کا جذبہ بہ درجۂ اتم موجود تھا - بہر حال

۱ - مختصر حالات زندگی مولانا حالی از ناصح زاہدی مشمولہ 'حالی میری نظر میں'- ناشر گوشۂ ادب ، لاہور (۱۹۵۱ء)، صفحہ ۹ -
۲ - تذکرۂ حالی ، حالی بک ڈپو پانی پت (۱۹۳۵ء) -

پانی پت میں رہ کر ہی انھوں نے سید جعفر علی مرحوم[1] سے فارسی کی ابتدائی دو چار کتابیں، پڑھیں۔ سید جعفر علی صاحب کی صحبت سے ہی حالی کو فارسی ادب کا ذوق پیدا ہوا۔ اس کے بعد عربی علوم کی تحصیل کی جانب متوجہ ہوئے تو اسی زمانے میں مولوی حاجی ابراهیم حسین انصاری لکھنؤ سے سند امامت لے کر پانی پت پہنچے تھے۔ چناں چہ عربی کے سلسلے میں مولانا حالی نے زانوے ادب آن کے سامنے تہہ کیا اور عربی زبان و قواعد کی ابتدئی کتابیں ان سے پڑھیں[2]۔

۱ - یہ میر نظام الدین ممنون دهلوی کے برادر زادے اور داماد تھے جو 'بہ تعلق زنا شوئی پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر، تاریخ اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔'

۲ - مولوی خواجہ ابراهیم حسین انصاری صاحب کا انتقال ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں بمقام پانی پت ہوا۔ ان کی قبر پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس کے متعلق بعض احباب کا خیال ہے کہ وہ مولانا حالی کا لکھا ہوا ہے۔ بہرحال اس کتبے سے خواجہ ابراهیم حسین صاحب کے متعلق چند باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، اسی لیے میں اسے یہاں نقل کر رہا ہوں:

''ولادت ایشاں در ماہ رجب ۱۲۳۶ھ در پانی پت واقع شدہ، بعد از تعلیم ضروریات دین در آغاز شباب برائے تکمیل علم ترک وطن اختیار کردند و از مولانا فضل حق خیر آبادی در سہارنپور و از مولانا واجد علی در لکھنؤ علوم عقلیہ اخذ نمودند۔ باز از سید میرن صاحب قبلہ کسب دینیات از فقہ و تفسیر و کلام پرداختند و هفت سالہ در لکھنؤ اقامت داشتہ، سند اجتہاد و امامت مذهب اثنا عشریہ از جناب مجتہدالعصر سید محمد صاحب لکھنوی، غفرلہ حاصل کردہ بہ پانی پت مراجعت فرمودند و پنجاہ سال در درس و تدریس و وعظ و تذکرہ مرجع انام و مقبول خاص و عام ماندہ چہاردهم رجب ۱۳۰۸ھ داعی اجل را لبیک اجابت گفتند۔''

تعلیم ابھی ناتمام ہی تھی کہ بہنوں نے تاہل پر مجبور کیا۔ مولانا حالی خود کہتے ہیں: ”اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گزارا تھا کہ یہ جؤا میرے کندھوں پر رکھا گیا۔ اب بہ ظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود تھے۔ سب کی خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکہ آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں مشہور واعظ اور مدرس تھے، پڑھیں۔“

چوں کہ مولانا حالی کی پیدائش ۱۸۳۷ء کی ہے اس لیے ان کی شادی ۱۸۵۴ء میں ہوئی ہوگی[۱]۔ اسی سال وہ پانی پت سے بھاگ کر دھلی پہنچے ہوں گے۔ دھلی پہنچ کر خواجہ حالی نے علوم مشرقیہ کی مشہور درس گاہ مدرسۂ حسین بخش میں اکتساب علوم کیا۔ اس زمانے میں قدیم دھلی کالج کی بھی بڑی شہرت تھی۔ لیکن مولانا حالی نے جس ماحول میں تربیت پائی تھی اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کا دھلی کالج کی

۱۔ یہ دونوں باتیں خواجہ حالی نے خود لکھی ہیں کہ آن کی پیدائش ۱۸۳۷ء کی ہے اور ۱۷ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ اس حساب سے مولانا حالی کی شادی ۱۸۵۴ء میں ہوتی ہے۔ لیکن معلوم نہیں ہو سکا کہ صاحب تذکرۂ حالی، (حالی بکڈپو پانی پت ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۹) خواجہ حالی کی شادی کا سال ۱۸۵۲ء کیوں قرار دیتے ہیں۔

طرف جانا ہی غیر ممکن تھا ۔ مولانا حالی خود نوشت سوانح حیات میں رقم طراز ہیں :

”اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا ۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا اور اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے ، نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے ۔ بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء مجہلے کہتے تھے ۔ دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھے روز و شب رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلباء کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے ۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرا تھا ۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا ۔ اس عرصے میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ کبھی ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے ، جیسے مولوی ذکاءاللہ ، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ ۔“

دہلی کے دوران قیام میں مولانا حالی نے شرح سلم ، ملا حسین اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ بہ قول حالی

''سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار دلی چھوڑنا پڑا اور پانی پت واپس آنا پڑا ۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے ۔'' دلی کے اس ڈیڑھ سالہ قیام میں مولانا حالی کی آمد و رفت مرزا غالب کے یہاں ہو گئی تھی اور حالی اُن کے اردو اور فارسی کے دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معانی ان سے پوچھا کرتے تھے اور مرزا غالب نے چند فارسی قصیدے بھی اپنے دیوان سے مولانا حالی کو درساً پڑھائے تھے ۔ اسی زمانے میں مولانا حالی نے دلی کے مشاعروں میں شرکت بھی کی تھی اور مرزا غالب سے داد بھی لی تھی ۔

مولانا حالی کے بیان سے واضح ہے کہ وہ ۱۸۵۴ء کے آغاز میں دہلی گئے اور وہاں ڈیڑھ سال قیام کے بعد ۱۸۵۵ء میں پانی پت واپس آ گئے ۔ پانی پت واپس آ کر وہ ڈیڑھ سال تک بالکل بے کار رہے ۔

مشاغل حیات

مولانا حالی کو سب سے پہلی ملازمت ضلع حصار کی کلکٹری میں ۱۸۵۶ء میں ملی ۔ یہ ایک قلیل المشاہرہ اسامی تھی جس پر مولانا حالی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک فائز رہے ۔ یہ ملازمت بھی ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی نذر ہو گئی اور مولانا پھر اپنے وطن پانی پت چلے آئے ۔ مولانا کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے چار برس کے قریب پھر پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزارے ۔ البتہ اس زمانے میں مولانا کو اکتساب علوم کا موقع مل گیا اور انھوں نے پانی پت کے مشہور فضلاء مولوی عبدالرحمان صاحب ،

مولوی محب اللہ صاحب اور مولوی قلندر علی مرحوم وغیرہ سے منطق ، فلسفہ ، حدیث اور تفسیر کے اسباق پڑھے ۔ جب کبھی ان حضرات میں سے کوئی بھی پانی پت میں موجود نہ ہوتا تھا تو وہ خود ہی علم و ادب کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے ۔ اسی زمانے میں مولانا حالی نے عربی نظم و نثر بھی لکھنے کی مہارت حاصل کر لی تھی ۔ اس کے بعد مولانا حالی کو تحصیل علم کا موقع نہیں ملا ۔

مولانا کا اپنا بیان ہے کہ وہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں حصار کی ملازمت ترک کر کے پانی پت آ گئے تھے ۔ یہاں چار سال تک بے کار رہے ۔ اس کے بعد گھر سے نکلے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بچوں کے اتالیق ہو کر جہانگیر آباد ضلع بلند شہر چلے گئے ۔ اس سلسلے میں مولانا حالی کا بیان پیش کرتا ہوں :

> ”غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا ۔ حسن اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دھلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا ذوق رکھتے تھے، شناسائی ہو گئی اور آٹھ برس تک بطور مصاحب کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ۔ . . . . نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ ڈپو میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی ۔“

غدر کے بعد کے بیکاری کے زمانے کے متعلق خواجہ حالی پہلے لکھ چکے ہیں :

"۱۸۵۷ء میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عمل‌داری اٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزارے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا حالی زیادہ سے زیادہ ۱۸۶۱ء کے اختتام تک پانی پت میں رہے اور وہ ۱۸۶۱ء کے اختتام پر ہی نواب شیفتہ کے یہاں چلے گئے۔ مولانا حالی نے شیفتہ کے یہاں جانے کا سن ۱۸۶۳ء دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں مولانا حالی کو سہو ہوا ہے۔ اس کے اسباب یہ ہیں :

(الف) مولانا حالی نے جہاں شیفتہ کے یہاں جانے کا سن ۱۸۶۳ء دیا ہے وہیں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ۸ سال تک شیفتہ کے مصاحب رہے اور شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں لاہور چلے گئے۔

(ب) شیفتہ کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا ہے۔

(ج) شیفتہ کی وفات تک خواجہ حالی کی مصاحبت کو ۸ سال ہوگئے تھے۔ چوں کہ شیفتہ کی وفات ۱۸۶۹ء میں ہوئی ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ خواجہ صاحب شیفتہ کے یہاں ۱۸۶۱ء کے اختتام پر پہنچے ہوں گے۔ لہذا ان کا یہ کہنا کہ وہ ۱۸۶۳ء میں شیفتہ کے یہاں پہنچے اور

ان کی وفات تک ۸ سال وہاں رہے، غلط ہے۔ وہ ۱۸۶۱ء کے اختتام پر ہی شیفتہ کے یہاں پہنچ گئے تھے۔ یہ سن (۱۸۶۱ء) اس لیے درست معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے ہی اسی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ وہ پانی پت میں غدر کے بعد چار سال بے کار رہے اور اس کے بعد شیفتہ کے یہاں چلے گئے۔

چناں چہ مولانا حالی ۱۸۶۱ء کے اختتام پر پانی پت سے نکل کر شیفتہ کے پاس پہنچے اور آٹھ سال تک وہاں رہے۔ کچھ صاحبان مولانا حالی کے اس سہو کی اس طرح تاویل کرتے ہیں کہ مولانا حالی ۱۸۶۱ء میں پہلے دہلی پہنچے اور دو سال تک وہاں رہے۔ اس کے بعد ۱۸۶۳ء میں وہ شیفتہ کی مصاحبت میں چلے گئے۔ وہ صاحبان خواجہ حالی کے اس دو سال کے عرصے (۱۸۶۱ تا ۱۸۶۳ء) کی دہلی کی مصروفیات میں مرزا غالب کے یہاں آمد و رفت اور شاگردی بھی سمجھتے ہیں۔ ایک دو نہیں متعدد بزرگوں نے یہی لکھا ہے کہ خواجہ حالی غدر کے بعد کے دو سال میں مرزا غالب سے ملے تھے۔ غدر سے پہلے جو ڈیڑھ سال کا عرصہ خواجہ حالی نے دہلی میں گزارا تھا اس وقت وہ مرزا غالب سے دور ہی رہے تھے۔ ان صاحبان کی یہ رائے خواجہ حالی کے اپنے بیان کے خلاف ہے۔ خواجہ حالی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''جس زمانے میں میرا دلی جانا ہوا تھا مرزا اسد اللہ غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے ۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے ۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دھلی میں شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا ۔ غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا ۔ حسن اتفاق سے ١٨٦٣ء میں نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دھلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے . . . . ''

اتنی واضح شہادت کے بعد بھی کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ حالی کی غالب سے واقفیت غدر کے بعد دو سالہ قیام میں ہوئی ہوگی ؟ معلوم نہیں یہ غلط فہمی

کیوں پیدا ہوئی - خواجہ حالی کی اپنی خود نوشت سوانح عمری کے علاوہ اور تحریریں بھی ایسی موجود ہیں جن سے اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے - مثلاً ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب خواجہ حالی پر مضمون لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں[۱] :

''حالی گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلے آئے اور ڈیڑھ برس وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی پڑھیں - یہاں انھیں غالب کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا - مرزا کے فارسی اور اردو شعر جو سمجھ میں نہیں آتے تھے وہ ان سے حل کیا کرتے تھے اور ان کے چند فارسی قصیدے بھی ان سے پڑھے - شاعری کا جوہر جو فطرت نے حالی کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا ، غالب کے فیض تربیت سے ابھرنے لگا - ایک آدھ غزل اردو فارسی کی کہہ کر غالب کو دکھائی تو انھوں نے کہا ''اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے -'' سترہ اٹھارہ برس کی عمر کے لڑکے سے غالب جیسے جوہر شناس نے یہ بات کچھ دیکھ کر اور کچھ سمجھ کر کہی ہوگی - بزرگوں

---

۱ - ماہنامہ 'جامعہ' دہلی بابت اکتوبر ۱۹۳۵ء صفحہ ۷۸۱ و ۷۸۲ -

اور عزیزوں کے جبر سے حالی کو اپنی تعلیم
ادھوری چھوڑ کر پانی پت واپس جانا پڑا۔
حصار میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں داخل
ہوئے مگر ۵۷ء کی بد امنی میں گھر چلے آئے۔''

مجھے افسوس ہے کہ اقتباس طویل ہو گیا اور بہت سی باتوں کا تکرار ہو گیا لیکن یہ ضروری تھا۔ مجھے اتنے مکمل اقتباس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ قاری کو سمجھنے میں سہولت ہو جائے کہ حالی کا یہ سفر دھلی کون سا ہے؟ انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہے یا بعد کا؟ ناصح زاھدی صاحب نے بھی اپنے مقالے میں یہی کہا ہے[1] کہ حالی کی مرزا غالب سے ملاقات ان کے سفر دھلی بابت ۱۸۵۴-۵۵ء میں ہوئی تھی۔

بہر حال خواجہ حالی ۱۸۶۱ء کے اختتام پر پانی پت سے نکل کر شیفتہ کے یہاں پہنچے۔ شیفتہ کے متعلق خواجہ حالی اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

''نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اردو
کے شاعر تھے، اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شعری
بہ مراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔
انہوں نے ابتداء میں اپنا فارسی اور اردو کلام
مومن خاں کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے
کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے
لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا

---

۱ - 'حالی میری نظر میں' ناشر گوشۂ ادب، لاہور ۱۹۵۱ء
صفحہ ۱۰

شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا، تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا میلان طبعی بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا، چمک اٹھا۔ اس زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ کہنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا مگر در حقیقت مرزا کے مشورے و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا، بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغے کو نا پسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادھی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دل فریب بنانا اس کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب متنفر تھے۔ نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے انیس کے مرثیے کا یہ پہلا مصرعہ پڑا:

'آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے'

اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا۔ یہی ایک مصرعہ بجائے خود ایک مرثیے کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا۔"

شیفتہ سے استفادے کے متعلق حالی نے کیا خوب کہا ہے ۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا، مقلد ہوں میر کا

شیفتہ کے انتقال کے بعد خواجہ حالی کو گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ایک اسامی مل گئی[۱] ۔ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے خواجہ صاحب ان کی عبارت درست کرتے تھے ۔ خواجہ حالی ۱۸۷۰ء میں لاہور پہنچے اور چار سال تک اس خدمت پر مامور رہے ۔ یہاں رہ کر خواجہ حالی کے علم میں وسعت پیدا ہوئی اور ان کا مذاق نکھر آیا ۔ انگریزی ادب کے ذریعے انگریزی خیالات سے شناسائی ہوئی اور مشرقی لٹریچر کی خامیاں آشکارا ہوئیں ۔ ''لاہور ہی میں کرنل ہالرآئڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایماء سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا ۔ یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک ماہانہ مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرعہ طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات نظم میں ظاہر کریں'' ۔ چناں چہ خواجہ حالی نے بھی اس زمانے میں ۱۸۷۴ء کے چار جلسوں میں شرکت کی اور چار مثنویاں 'برکھا رت'، 'نشاط امید'، 'مناظرۂ رحم و انصاف' اور 'حب وطن' لکھیں ۔

---

۱ ۔ سر رشتۂ تعلیم پنجاب میں اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر تھے (حواشی مقدمۂ شعر و شاعری از ڈاکٹر وحید قریشی، ناشر مکتبۂ جدید لاہور صفحہ ۴۳)

جس زمانے (۱۸۷۰ء) میں مولانا حالی لاہور پہنچے ہیں تو میجر فلر ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ بک ڈپو کی ملازمت کے ساتھ ساتھ مولانا حالی کچھ عرصے کے لیے سر رشتۂ تعلیمات پنجاب کے ماہنامہ 'اتالیق پنجاب' کے نائب مدیر بھی رہے۔ لاہور کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی اور نہ انھیں لاہور میں دوست ہی میسر آئے، اس لیے وہ لاہور سے بہت زیادہ اکتا گئے۔ لاہور سے اکتانے کی ایک وجہ آزاد کے حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے اور بھی لکھی ہے[1]: ''محکمے میں وہابیوں کا زور ہو گیا تھا۔'' وجہ کوئی بھی ہو مولانا حالی لاہور سے بہت بے زار تھے اور دلی کی یاد انھیں بہت تڑپا رہی تھی۔ چناں چہ اس کا اظہار مولانا اس نے طرح کیا ہے:

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد
نہ میں بلبل، نہ میرا گھر چمن ہے

کروں تجھ سے بیاں کچھ درد غربت
مگر جوش سخن مہر دہن ہے

رہا لاہور میں آکر سو جانے
یہی دنیا، یہی دارالمحن ہے

یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام
کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

مجھے تنہا نہ سمجھیں اہل لاہور
تصور میں مرے اک انجمن ہے

۱۔ 'حواشی مقدمۂ شعرو شاعری' از ڈاکٹر وحید قریشی، ناشر مکتبۂ جدید لاہور صفحہ ۴۴۔

مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم
خموشی میں مری ذوق سخن ہے

بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول
جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے

بتاؤں تم کو ہوں کس مصر کی بو
جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے

نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام
یہی گر جذبۂ حب وطن ہے

لاہور کے اس چار سالہ دوران قیام میں خواجہ حالی نے چند کتابیں بھی لکھیں جن کا تذکرہ 'تصانیف' کے ذیل میں آئے گا۔

۱۸۷۵ء میں خواجہ حالی کا تبادلہ اینگلوعربک اسکول دہلی کی مدرسی پر ہو گیا اور حالی دلی چلے گئے[۱]۔ دہلی

۱- سیماب نے معلوم نہیں کس شہادت کی بنیاد پر لکھا ہے: "۱۸۶۱ء میں جب کہ آن کا دل لاہور سے بالکل آچاٹ تھا، اینگلو عربک اسکول دہلی سے ان کے نام مدرسی کا پروانہ آیا اور لاہور سے دہلی چلے آئے۔"

('حالات حالی' از سیماب اکبرآبادی، مطبوعہ دارالاشاعت صوفی پنڈی بہاوالدین ضلع گجرات ۱۹۲۰ء)۔ اس سے بھی بڑی غلطی سیماب نے ایک اور کی ہے۔ لکھتے ہیں: "عربک اسکول دہلی کی ملازمت مولانا حالی کے لیے کتاب شاعری کا دیباچہ تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ مرزا اسداللہ خاں غالب اکبر آبادی ثم دہلوی کا آفتاب سخن مطلع ہندوستان پر چمک رہا تھا۔ حالی کی متجسس نگاہوں نے ان سے بہتر رہ نمائے فن نہ پایا تو انھیں کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کر دیا۔" حالی عربک اسکول دہلی میں ۱۸۷۵ء میں پہنچے ہیں جب کہ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہو چکا تھا۔

سے ایک مرتبہ اور حالی لاہور میں ایچیسن کالج کے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ ہو کر آئے ۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی تحقیق کے مطابق ۵ جون ۱۸۸۷ء کو حالی واپس دھلی پہنچ گئے[۱] ۔ دھلی کے اس دوران قیام (۱۸۷۵ تا ۱۸۸۷ء) کے حالات کا سراغ نہیں ملتا ۔ 'مکتوبات حالی' میں ۱۸۸۷ء سے قبل کے خطوط موجود نہیں ہیں ۔ اس زمانے میں حالی سرسید کے زیادہ قریب رہے ہیں ۔

۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء) میں جب کہ حالی اینگلو عربک اسکول دھلی میں مدرس عربی تھے ، نواب سر آسمان جاہ بہادر مدارالمہام سرکار عالی نظام اثنا ئے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظے کے لیے سرسید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فرو کش تھے ۔ اس وقت حالی بھی علی گڑھ میں موجود تھے ۔ چناں چہ سرسید نے حالی کا تعارف کرایا ۔ نواب سر آسمان جاہ معارف پرور اور علم دوست تھے ۔ حالی سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ایک وظیفہ پچھتر (۷۵) روپے ماھوار کا بہ صیغۂ امداد مصنفین مقرر کردیا ۔ ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۲ء) میں سر سید کی قیادت میں محمڈن کالج علی گڑھ کے ٹرسٹیوں کا ایک وفد حیدر آباد گیا جس میں مولانا حالی بھی شریک تھے ۔ اس مرتبہ حالی کا وظیفہ ۷۵ روپے سے بڑھا کر ۱۰۰ روپے ماھوار کر دیا گیا ۔ مولانا حالی ۱۹۰۱ء میں رقم طراز ہیں :

"۱۳۰۹ھ میں جب کہ سر سید مرحوم کے ھمراہ

---

۱ ۔ حواشی 'مقدمۂ شعر و شاعری' از ڈاکٹر وحید قریشی ناشر مکتبۂ جدید لاہور صفحہ ۴۴ ۔

--- حیدر آباد گیا تھا اس وظیفے میں پچیس رو۔
ماہ وار کا اضافہ کر کے سو روپے سکۂ حالی
کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اب تک
مجھ کو ماہ بہ ماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور
اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول کا تعلق
قطع کر دیا ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۲ء) میں حالی نے ملازمت ترک کر دی تھی۔ اس کے بعد حالی کہیں ملازم نہیں ہوئے۔ ان کا زیادہ وقت اپنے وطن پانی پت میں گزرا۔ کبھی کبھی علی گڑھ اور دھلی آتے جاتے رہتے تھے۔

۱۹۰۴ء میں حکومت نے مولانا حالی کی علمی و ادبی خدمات کی قدر کرتے ہوئے 'شمس العلماء' کا خطاب دیا۔ ۱۹۰۵ء میں نظام حیدر آباد کے جشن چہل سالہ کی روئداد مرتب کرنے کے لیے دکن گئے۔ ۱۹۰۵ء میں ھی پانی پت میں 'وکٹوریہ پبلک لائبریری' قائم کی۔ ۱۹۰۷ء میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے کراچی گئے۔

تصانیف حالی

(نثر)

مولانا کی اولین تصنیف تو وھی رسالہ کہا جائے گا جو انھوں نے اپنے دھلی کے قیام ۱۸۵۵ء - ۱۸۵۴ء میں بہ زبان عربی لکھا تھا - اس رسالے میں ایک منطقی مسئلہ نواب سید محمد صدیق حسن خاں بہادر کی تائید میں موضوع بحث تھا - مولانا حالی کی عمر اس وقت ۱۸ سال کے قریب تھی اور وہ مدرسۂ حسین بخش میں زیر تعلیم تھے - اس رسالے کو پڑھ کر اُن کے استاد کو رنج ھوا کیوں کہ وہ ایک کٹر حنفی بزرگ تھے اور رسالہ ایک وھابی شخص کی تائید میں لکھا گیا تھا - بہر حال اُسے چاک کر دیا گیا[1] اور آج اس کا کہیں پتا نہیں - چوں کہ وہ رسالہ ناپید ھے اس لیے ھم اسے مولانا حالی کی تصانیف میں شمار کرنے سے قاصر ھیں - اس کے بعد مولانا حالی کی نثری تصنیفات و تالیفات کی کیفیت

---

۱ - 'سیرت حالی' از محمد یحیٰ تنہا مشمولہ 'حالی میری نظر میں' مطبوعہ گوشۂ ادب لاھور، ۱۹۵۱ء، صفحہ ۳۵ -

حسب ذیل ہے :

۱ - مولود شریف :

دیباچے میں خواجہ سجاد حسین صاحب (پسر مصنف) نے قراین سے اندازہ لگایا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۶۴ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیانی عرصے میں لکھی گئی ہو گی اور غالباً یہ حالی کی اولین تصنیف ہے ۔ میرے پیش نظر حالی پریس پانی پت کا مطبوعہ وہ نسخہ ہے جو خواجہ فرزند علی کے اہتمام سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا ۔ غالباً یہ حالی کی حیات میں شائع نہیں ہوسکا ۔

۲ - تریاق مسموم :

یہ کتاب ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء میں لکھی گئی جو خواجہ حالی کے ہم وطن پادری عمادالدین کی کتاب 'تحقیق الایمان' کا جواب ہے ۔ یہ مجلہ 'خیرالمواعظ' دهلی میں بالاقساط شائع ہوئی تھی ۔

۳ - پادری عمادالدین کی تاریخ محمدی پر رائے منصفانہ : مطبوعہ ۱۸۷۱ء ۔

۴ - "طباق الارض" یا "مبادئ علم جیولوجی" :

علم الارض پر فرانسیسی زبان کی ایک تصنیف کے عربی ترجمے سے حالی نے یہ اردو ترجمہ کیا جسے پنجاب یونیورسٹی نے ۱۸۶۸ء میں چھاپا[1] ۔ بعد میں یہ پنجاب یونیورسٹی کے

---

۱ - 'داستان تاریخ اردو' از حامد حسن قادری ، طبع دوم مطبع عزیزی پریس آگرہ ۱۹۵۷ء، صفحہ ۵۴۶ -

ایماء سے ۱۸۸۳ء میں بہ منظوری جناب رجسٹرار پنجاب یونیوسٹی مطبع انجمن پنجاب لاھور میں بہ اھتمام نظام الدین چھپی تھی[1] -

۵ - اصول فارسی :

زمانۂ تالیف ۱۸٦۸ء -

٦ - مجالس النساء (دو حصے) :

زمانۂ تالیف ۱۸۷۴ء - مطبوعہ لاهور - اس کتاب کی تالیف پر کرنل ھالرائڈ ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب نے مولانا حالی کے لیے انعام کی سفارش کی تھی - چناں چہ لارڈ نارتھ بروک نے ایجوکیشنل دربار دھلی میں مولانا حالی کو مبلغ چار سو روپیہ انعام دیا -

۷ - شواھد الالہام :

زمانۂ تصنیف ۱۸۷۵ء مطابق ۱۲۹۲ھ -

۸ - سوانح حکیم ناصر خسرو :

زمانۂ تالیف ۱۸۸۱ء - سفر نامۂ ناصر خسرو علوی کے ساتھ ۳۲ صفحات کی یہ سوانح عمری ۱۸۸۲ء مطابق ۱۲۹۹ھ میں 'مطبع خیر خواہ ھند' دھلی میں چھپی تھی - یہ فارسی زبان میں ہے -

---

۱ - صحیفہ ، لاھور (۷) صفحہ ٦۸ -

۹ - حیات سعدی :

زمانۂ تالیف ۱۸۸۴ء مطابق ۱۳۰۱ھ - لیکن اس کی اشاعت اول ۱۸۸۶ء میں ہوئی -

۱۰ - مقدمہ دیوان حالی :

دیوان حالی کے ساتھ مطبع انصاری دہلی میں ۱۸۹۳ء مطابق ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوا -

۱۱ - یادگار غالب :

۱۸۹۷ء میں مطبع نامی کان پور سے شائع ہوئی -

۱۲ - حیات جاوید :

اتمام تالیف ۱۹۰۱ء مطابق ۱۳۱۸ھ ، مطبوعہ نامی پریس کان پور ، ۱۹۰۱ء -

۱۳ - سوانح عمری مولانا عبدالرحمان پانی پتی :

یہ بزرگ مولانا حالی کے استاد تھے -

۱۴ - مضامین حالی :

۱۸۷۵ء (۱۲۹۲ھ) سے ۱۹۰۱ء (۱۳۱۸ھ) تک جو مضامین مولانا حالی نے 'تہذیب الاخلاق' ، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ، کالج میگزین ، معارف وغیرہ میں لکھے تھے ، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی نے ان کو ۱۹۰۲ء میں ترتیب دیا تھا - یہ مجموعہ پنجاب نیشنل ایجنسی پانی پت

سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔

۱۵ - مقالات حالی :

مضامین حالی کے بعد انجمن ترقیٔ اردو (ہند) نے مقالات حالی دو جلدوں میں ۱۹۳۵ء میں شائع کیے۔

۱۶ - مکتوبات حالی

مولانا حالی کے صاحب زادے خواجہ سجاد حسین صاحب نے حالی کے انتقال کے بعد ان کے خطوط جمع کیے اور انہیں دو جلدوں میں ترتیب دے کر ۱۹۲۵ء میں حالی پریس پانی پت سے شائع کیا۔ ابتدا میں مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ ہے۔

۱۷ - مکاتیب حالی

ناشر اردو مرکز لاہور ۱۹۵۰ء

۱۸ - رقعات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ :

اس کی ترتیب میں مولانا حالی نے اس درجہ کاوش کی ہے کہ ایک تالیف بن گئی ہے۔

(نظم)

مولانا حالی نے انقلاب ۱۸۵۷ء تک صرف چند غزلیں کہی تھیں۔ شیفتہ کی مصاحبت میں پہنچ جانے کے بعد (۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۹ء) حالی نے کثرت سے غزلیں کہیں۔ اس کے بعد ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۴ء تک لاہور کے دوران قیام میں

مولانا حالی کے رجحانات میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی جس کی وجہ سے ان کا انداز اور اسلوب ہی بدل گیا ۔ چناں چہ ۱۸۷۴ء میں لاہور کے مشاعروں کی چار نشستوں میں مولانا نے چار نظمیں برکھا رت ، نشاط امید ، مناظرۂ رحم و انصاف اور حب وطن لکھیں ۔ اس کے بعد مولانا لاہور سے اینگلو عربک اسکول دہلی چلے آئے جہاں انھوں نے کچھ قومی اور دوسری نظمیں لکھیں ۔ ۱۸۷۹ء میں 'مسدس مد و جزر اسلام' ۱۸۸۲ء میں 'مثنوی تعصب و انصاف'، ۱۸۸۳ء میں 'مناظرۂ واعظ و شاعر' ۱۸۸۶ء میں 'مناجات بیوہ'، ۱۸۸۶ء میں ہی 'شکوۂ ہند'، ۱۸۸۷ء میں 'مثنوی حقوق اولاد'، ۱۸۸۷ء میں ہی 'مسدس ننگ خدمت' اور ۱۸۸۹ء میں 'مسلمانوں کی تعلیم' وغیرہ ۔

مولانا حالی نے ۱۸۹۳ء میں اپنا دیوان ترتیب دیا اور اسے ایک فاضلانہ مقدمے کے ساتھ اسی سال (۱۸۹۳ء) مطبع انصاری دہلی سے طبع کرا کے شائع کیا ۔

دیوان حالی کے علاوہ مولانا نے 'مجموعۂ نظم حالی' ترتیب دیا جس کا دیباچہ خود لکھا ۔ مولانا حالی کی وفات کے بعد 'رباعیات حالی' ۱۹۱۸ء میں علیحدہ شائع ہوئیں ۔

مولانا کی وہ نظمیں جو مختلف رسالوں یا اخبارات میں شائع ہوئی تھیں ، ۱۹۲۳ء میں مرتب کی گئیں ۔ خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے اس مجموعے کا دیباچہ لکھا ۔ یہ مجموعہ ۱۹۲۳ء میں عزیزی پریس آگرہ سے شائع ہوا ۔

مولانا حالی کی نظم و نثر فارسی و عربی کا ایک مجموعہ مولانا حالی اپنے 'اردو کلیات نظم حالی' کے ساتھ بہ طور ضمیمہ

شائع کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ مولانا نے اپنی تمام نظم و نثر فارسی و عربی کا مجموعہ 'ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی' کے عنوان سے ترتیب دیا جو مولانا حالی کی حیات میں ھی تحفۂ ہند پریس دھلی سے اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ھو گیا تھا۔ یہ آخری کتاب تھی جو مولانا کی زندگی میں شائع ہوئی تھی۔

مولانا حالی کے معاصر تذکرہ نویس لالہ سری رام دھلوی نے 'خمخانہ جاوید' جلد دوم مطبوعہ ۱۹۱۱ء کے صفحہ ۳۵۸ پر لکھا ھے: ''مولانا حالی کچھ عرصے سے نواب فصیح الملک مرزا داغ مرحوم کے کلام کا انتخاب فرما رھے ھیں جس کے شائع ھونے کا ھر ایک مشتاق سخن کو نہایت اشتیاق سے انتظار ھے۔'' افسوس ھے کہ حالی کے مرتبہ اس انتخاب، داغ کی حسرت ھی رہ گئی اور وہ کبھی منصۂ شہود پر جلوہ افروز نہ ھو سکا۔

'یادگار غالب' کا زمانۂ تصنیف

خواجہ حالی نے اپنے قیام دھلی بہ دوران ملازمت اینگلو عربک اسکول مرزا غالب مرحوم کے سوانح حیات مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اس سلسلے میں ضروری مواد بھی فراھم کر لیا تھا، لیکن اس مواد کو مرتب نہیں کر سکے تھے کہ وہ دیگر امور میں مصروف ھو گئے۔ خواجہ حالی ۱۸۸۹ء تک اینگلو عربک اسکول دھلی میں رھے۔ ظاھر ھے کہ 'یادگار غالب' کا مواد اسی زمانے میں فراھم کیا گیا۔ اس کے بعد بہ قول حالی ''کئی برس تک وہ تمام یاد داشتیں

کاغذ کے مٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں[۱]۔'' بعد میں پھر دوستوں کے تقاضے سے مجبور ہوئے اور ایک انتہائی ضروری کام کو ملتوی کر کے 'یادگار غالب' کی ترتیب کی طرف مائل ہوئے۔ میرے خیال میں وہ ''ضروری کام'' سر سید احمد خان کے سوانح حیات کی ترتیب تھی۔

جو کام خواجہ حالی نے اپنے قیام دھلی میں شروع کیا تھا بالآخر اس کی تکمیل ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ ۱۸۹۶ء کے اختتام پر ''یادگار غالب'' مکمل ہو گئی اور طباعت کے لیے دے دی گئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن نامی پریس کان پور سے ۱۸۹۷ء میں منشی رحمت اللہ رعد نے شائع کیا۔

حالی نے اگرچہ اپنی یادداشتیں ۱۸۸۹ء سے قبل ھی قلم بند کر لی تھیں لیکن مواد کی صحیح طور پر فراھمی کا زمانہ ۱۸۹۶ء ھی ھے، اس لیے 'یادگار غالب' کا زمانۂ تصنیف ۱۸۹۶ء ھی کہا جائے گا۔

'یادگار غالب' کا سبب تصنیف

'یادگار غالب' کے سبب تصنیف کے سلسلے میں خود خواجہ حالی 'یادگار غالب' کے خاتمے میں لکھتے ھیں[۲]:

''راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق

---

۱ - 'یادگار غالب' ناشر شیخ مبارک علی تاجر کتب لاھور، تمہید صفحہ ۳۔

۲ - 'یادگار غالب' ناشر شیخ مبارک علی تاجر کتب لاھور صفحہ ۳۷۵

بدو شعور سے آج تک چلا آتا ہے، اس کو چاہو اس معتقدانہ جوشِ عصبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے اور چاہو اس یقین کا ثمرہ خیال کرو جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے؛ بہر تقدیر یہی وہ چیز تھی جس نے ہم کو اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ پس نہ ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اس تالیف سے پبلک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے اور نہ یہ خیال ہے کہ محض ملک کی خیرخواہی اس کے لکھنے کا باعث ہوئی ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو کام محض طبیعت کے اقتضاء سے، نہ کہ عقل کی صواب دید سے سرانجام کیا جائے اس سے لوگوں کو بہ واسطہ کسی طرح کچھ فائدہ نہ پہنچے۔ ہوا جو اپنی موج میں چلتی ہے اور دریا جو اپنے جوش میں بہتا ہے، گو ان کو خود خبر نہیں کہ یہ کہاں جا رہے ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی سعی محض بےحاصل اور ان کی کوشش سراسر بے سود ہے۔''

'یادگار غالب' کی تمہید میں بھی خواجہ حالی نے اس طرف اشارہ کیا ہے:

''اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری اور انشاپردازی کے سوا نظر نہیں آتا مگر صرف اسی کام نے ان کی لائف کو

دارالخلافے کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان
واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس
ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہوگیا
اور اردو نظم ونثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان
نہیں ہے ، اس لیے کبھی کبھی مجھ کو اس بات کا
خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات
جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں
اور ان کی شاعری و انشا پردازی کے متعلق جو
امور کہ احاطۂ بیان میں آسکیں اور ابنائے زمان
کی فہم سے بالاتر نہ ہوں ، ان کو اپنے سلیقے کے
موافق قلم بند کروں[1] ۔''

'یادگار غالب' مرزا غالب کے حالات پر اولین کتاب ہے جو ۱۸۹۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی ۔ در اصل یہ 'آب حیات' مصنفہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دهلوی کا رد عمل تھا ۔ آزاد نے 'آب حیات' لکھی تو اس میں اپنے استاد ذوق کا حال انتہائی شرح و بسط سے قلم بند کیا اور انھیں اردو کا سب سے بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ ذوق کے مقابلے میں غالب کا حال اچھا خاصا پھیکا تھا اور ان کی فارسی شاعری و انشا پردازی کی تعریف کر کے یہ ثابت کرنا چاہا کہ مرزا غالب فارسی کے زبردست استاد تھے ۔ اس طرح سے اردو کا میدان ان کے استاد ذوق کے هاتھ آ جاتا تھا ۔ 'آب حیات' میں ذوق کا بیان ۶۵ صفحات[2] پر اور غالب کا

---

۱ - یادگار غالب مذکور ، صفحہ ۳ (تمہید)

۲ - آب حیات ، ناشر شیخ مبارک علی تاجر کتب لاهور صفحات ۴۳۵ تا ۵۰۰

ذکر ۳۶ صفحات پر ہے[1] - آب حیات ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی - مولانا حالی کو یہ دیکھ کر قلق ہوا - وہ اس زمانے میں اینگلو عربک اسکول دھلی میں مدرس عربی تھے - چناں چہ انھوں نے اس زمانے میں طے کر لیا کہ وہ اپنے استاد غالب کے سوانح حیات قلم بند فرمائیں گے جو بالآخر یادگار غالب کی صورت میں منظر عام پر آئے - مظفر علی سید صاحب 'غالب کے نقاد' کا عنوان قائم کر کے فرماتے ہیں[2]:

> ''چوں کہ سر سید انگریز پرست سے زیادہ قوم پرست تھے، انھوں نے نہ تو غالب کی تقریظ (آئین اکبری) کو اپنے ایڈیشن میں شامل کیا اور نہ پھر کبھی ان کا نام زبان قلم پر لائے - اس تغافل کا بدلہ چکانے کی غرض سے یا کسی وجہ سے سر سید کے ایک پانی پتی چیلے نے غالب کی حیات اور شاعری کے بارے میں ایک یادگار کتاب لکھنی شروع کی - اس سے پہلے لاہور کا ایک پروفیسر جو سر سید سے کہیں زیادہ آئین اکبری کا شیدا تھا اور غالب سے کہیں زیادہ انگریز پرستی پر مائل تھا (یہاں تک کہ اس نے انگریز کی جاسوسی بھی کی)، غالب کا نام لے چکا تھا - یہ آدمی یعنی محمد حسین آزاد غالب کو فارسی کا بہت بڑا شاعر سمجھتا تھا کہ اردو میں اس کے اپنے استاد کی برتری مان لی جائے - حالی

۱- 'آب حیات' مذکور صفحات ۵۰۰ تا ۵۳۶

۲- ماہنامۂ 'تحریک'، دھلی، بابت اپریل ۱۹۶۱ء' صفحہ ۹۴ -

ایک طرف تو سرسید کے چیلے تھے، دوسری طرف آزاد کے ساتھی بھی - آزاد کی استاد پرستی کو دیکھ کر ان کے دل میں بھی اس جذبے نے جوش مارنا شروع کر دیا - تاریخ ادب کا یہ عجیب پہلو ہے کہ نہ آزاد کو صحیح معنوں میں ذوق کا شاگرد کہا جا سکتا ہے، نہ حالی کو غالب کا - البتہ پرستش کے لیے جو خیالات و افکار ذہن میں جاری و ساری ہونے چاہییں وہ بھی تیار تھے - بہر حال حالی نے آزاد سے اثر لے کر یادگار غالب لکھی جو دلی جذبے کے اعتبار سے ان کے مرثیۂ غالب کو تو نہیں پہنچتی مگر اردو زبان میں غالب پرستی کا یہیں سے آغاز ہوتا ہے -''

بہر حال اس میں شک نہیں کہ مولانا حالی کے دل میں 'آب حیات' کو دیکھ کر ہی غالب کے سوانح حیات لکھنے کا خیال پیدا ہوا تھا - اگرچہ اس کی تکمیل کو دوسرے امور مانع رہے لیکن اس مقام پر ایک خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مولانا حالی کو 'آب حیات' دیکھ کر 'یادگار غالب' لکھنے کی تحریک ہوئی تو وہ ۱۸۹۶ء تک کیوں دبی رہی ؛ حالاں کہ اس سے قبل اور 'آب حیات' کی اشاعت (۱۸۸۰ء) کے بعد مولانا حالی کی ایک اور عظیم الشان سوانح عمری 'حیات سعدی' ۱۸۸۶ء میں شائع ہو گئی - شیخ سعدی دور کے بزرگ تھے اور ان کے سوانح حیات لکھنے کے لیے کوئی ایسا مؤثر جذبہ بھی موجود نہیں تھا جس کی تحریک سے وہ اتنے مجبور ہو گئے ہوں کہ تمام کام چھوڑ کر 'حیات سعدی' لکھنے بیٹھ گئے -

دوسری بات یہ ہے کہ یادگار غالب کا مواد حالی کے قول کے مطابق ان کے قیام دہلی میں فراہم کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد کئی سال تک حالی اس طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۶ء میں بھی وہ اپنی خواہش سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ دوستوں کے اصرار سے اس کی تکمیل کی طرف مایل ہوئے۔ یادگار غالب کی تمہید میں خود خواجہ حالی فرماتے ہیں[۱]:

> ”ان دنوں میں دوستوں کا پھر تقاضا اور بہت سخت تقاضا ہوا اور باوجودے کہ میں ایک نہایت اہم اور ضروری کام میں مصروف تھا، دوستوں کے تقاضے نے یہاں تک مجبور کیا کہ اس ضروری کام کو چند روز کے لیے ملتوی کرنا پڑا اور یہ خیال کیا گیا کو جو یادداشتیں مرزا کی لائف کے متعلق بڑی کوشش سے جمع کی گئی ہیں اور جو تھوڑی سی توجہ سے مرتب ہوسکتی ہیں، ان کو اب زیادہ حالت منتظری میں رکھنا مناسب نہیں۔“

مولانا حالی کے اس بیان سے واضح ہے کہ یادگار غالب کی تحریر میں مولانا حالی کا شوق، جذبہ اور ولولہ کس حد تک تھا۔

۱۔ ’یادگار غالب‘ ناشر شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور صفحہ ۴ (تمہید)

یادگار غالب کی ترتیب

مولانا حالی نے یادگار غالب کی ترتیب پر اس کی تمہید میں خود روشنی ڈالی ہے ۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کے قیام دہلی کے زمانے میں ''بعض احباب کی تحریک سے'' 'یادگار غالب' کی تحریر کے خیال کو تقویت پہنچی ۔ چناں چہ خواجہ حالی نے مرزا غالب کی تصانیف دوستوں سے مستعار لے کر مطالعہ فرمائیں اور ''جس قدر مرزا کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ان کی تصانیف سے مل سکا انھیں قلم بند کیا'' اور جو باتیں اُن کے اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں ان کو بھی ضبط تحریر میں لائے ۔ لیکن وہ اس تمام مواد کو ترتیب نہیں دے سکے اور کئی سال تک وہ تمام یادداشتیں کاغذ کے مٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں ۔

کئی سال کے بعد حالی کے دوستوں نے پھر تقاضا شروع کیا اور اس حد تک اصرار کیا کہ حالی دوسرے کاموں کو چھوڑ کر یادگار غالب کی ۔ تب کی جانب متوجہ ہو گئے ۔ چناں چہ مولانا حالی 'یادگار غالب' کی تمہید میں لکھتے ہیں :

> ''میں نے ان مٹھوں کو کھولا اور ان یادداشتوں کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا ، مگر ان کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی اور اس کے سوا کچھ اور کتابیں بھی درکار ہوں گی ۔ میں نے دلی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو

لکھا اور انھوں نے مہربانی فرما کر میری تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات آن کو معلوم ہو سکے ، لکھ کر میرے پاس بھیج دیے اور اس طرح مرزا کی لائف جہاں تک کہ اس کی تکمیل ہو سکتی تھی ، مکمل کی گئی ۔''

دلی کے جن بزرگوں کو خواجہ حالی نے مرزا غالب کے حالات کے سلسلے میں لکھا تھا ان کے نام یہ ھیں : نواب سعیدالدین احمد خاں طالب ، سید اکبر مرزا و سید مظفر مرزا ، نواب حسام الدین حیدر خاں ، میر مہدی حسین مجروح اور لالہ بہاری لال مشتاق ۔

کتاب کے مطالب اور موضوعات کے سلسلے میں خود خواجہ حالی نے 'یادگار غالب' کی تمہید میں صراحت کر دی ہے :

''میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مرزا کی لائف میں کوئی مہتم بالشان واقعہ ان کی شاعری و انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا ، لہذا جس قدر واقعات ان کی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ھیں ، ان کو ضمنی اور اسطراوی سمجھنا چاھیے ۔ اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب و غریب ملکے کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالے نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرائے میں ، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں ، کبھی عشق بازی اور

رندمشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف[۲] اور حب اہل بیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا - پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا اس کو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے -''

'یادگار غالب' کے دو حصے ہیں - پہلے حصے میں سوانح حیات ہیں اور دوسرے حصے میں مرزا کے کلام پر ریویو اور اس کا انتخاب - پہلا حصہ مختصر ہے اور دوسرا طویل - دوسرے حصے کے متعلق خواجہ حالی فرماتے ہیں :

''ہم نے دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام کو چار قسموں پر تقسیم کیا ہے : نظم اردو ، نثر اردو ، نظم فارسی اور نثر فارسی اور اسی ترتیب سے ہر قسم کا تھوڑا تھوڑا انتخاب چار جدا جدا فصلوں میں درج کیا ہے - ہر قسم پر اول کچھ مختصر ریمارکس کیے ہیں ، پھر اس قسم کا انتخاب لکھا گیا ہے اور جو اشعار یا فقرے شرح طلب سمجھے ہیں ان کی جا بہ جا شرح بھی کر دی گئی ہے اور کہیں کہیں محاسن کلام کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے - آخر میں خاص کر ان لوگوں کے لیے جو فارسی لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں ، نمونے کے طور پر مرزا کے کسی قدر فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلم الثبوت استادوں کے کلام کے ساتھ کر کے دکھایا ہے کہ مرزا نے فارسی لٹریچر میں کس درجے تک کمال

بہم پہنچایا تھا ۔''

انتخاب کلام کے متعلق خواجہ حالی لکھتے ہیں :

''اس انتخاب سے جس کو مرزا کے عام کلام کا نمونہ سمجھنا چاہیے، کئی فائدے تصور کیے گئے ہیں ۔ ایک یہ کہ جو لوگ شعر کی سمجھ اور اس کا عمدہ مذاق رکھتے ہیں ، ان کو بغیر اس کے کہ تمام کلیات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہو ، مرزا کا ہر قسم کا عمدہ کلام ایک جگہ جمع کیا ہوا مل جائے گا ۔ دوسرے جو لوگ مرزا کا کلام اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے ، وہ بہ سبب اس کے کہ ہر مشکل شعر یا فقرے کے معنی حل کر دیے گئے ہیں ، مرزا کے خیالات سے بہ خوبی واقفیت حاصل کر سکیں گے اور دونوں طبقوں کو معلوم ہو جائے گا کہ مرزا نے قوت متخیلہ اور ملکۂ شاعری کس درجے کا پایا تھا اور کس خوبی اور لطافت سے وہ نہایت نازک اور دقیق خیالات کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ادا کرنے کی قدرت رکھتے تھے ۔''

بہر حال 'یادگار غالب' کے دو حصے ہیں ۔ پہلے حصے میں مرزا کی زندگی کے واقعات ، ان کے اخلاق و عادات و خیالات بیان کیے گئے ہیں ۔ انھیں حالات کے ضمن میں ان کی خاص خاص نظمیں یا اشعار جو کسی واقعے سے علاقہ رکھتے ہیں اور ان لطائف و نوادر جن سے مرزا کی

طبیعت کا اصلی جوہر اور اُن کی قوت متخیلہ نہایت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے، اپنے اپنے موقع پر ذکر کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام نظم و نثر اردو و فارسی کا انتخاب اور ہر قسم پر جدا جدا ریویو اور آخر میں مرزا کے کلام کا موازنہ ایران کے بعض مسلم الثبوت استادوں سے کیا گیا ہے۔ خاتمۂ کتاب پر ایک مختصر ریویو مرزا کی تمام لائف اور ان کی طرز شاعری و انشا پردازی پر لکھا گیا ہے جس کو تمام کتاب کا لب لباب سمجھنا چاہیے[1]۔

'یادگار غالب' (ناشر شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ۱۹۳۰ء) کی ترتیب یہ ہے:

۱۔ پہلے چار صفحات پر فہرست مضامین ہے۔

۲۔ صفحات ۱ تا ۸ تک مصنف کا دیباچہ ہے۔

۳۔ صفحہ ۹ سے کتاب کا متن شروع ہوتا ہے۔ حصۂ اول جو مرزا کی لائف سے متعلق ہے، صفحہ ۹۵ پر ختم ہو جاتا ہے۔

۴۔ صفحہ ۹۶ سے صفحہ ۳۷۴ تک حصۂ دوم ہے، جس میں ''مرزا کے کلام پر ریویو اور اس کا انتخاب'' ہے۔

۵۔ صفحہ ۳۷۵ پر ''خاتمہ'' کا عنوان ہے جو صفحہ ۳۹۱ تک جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کتاب ختم ہو جاتی ہے اور ''خاتمہ'' میں سبب تصنیف اور کتاب کی ترتیب کے متعلق معلومات ہیں۔

۱۔ 'یادگار غالب' - صفحہ ۷ و ۸ (تمہید)

یادگار غالب کی طباعت و اشاعت

یادگار غالب کی اشاعت ۱۸۹۷ء میں ہوئی - طبع اول کے نسخے کی لوح پر یہ عبارت مندرج ہے :

یادگار غالب

یعنی

جناب مرزا اسداللہ خاں متخلص بہ غالب دہلوی کی زندگی کے حالات

اور

ان کی اقسام نظم و نثر اردو و فارسی کا انتخاب اور ہر ایک قسم پر جداگانہ ریمارکس

مرتبہ

خاکسار الطاف حسین حالی پانی پتی

۱۸۹۷ء

محمد رحمت اللہ رعد کے

نامی پریس کان پور میں چھپی

حسب ضابطہ رجسٹری کرائی گئی

بقلم احقر گُہر لکھنوی

ابتدا میں ۴ صفحات پر مشتمل فہرست مضامین ہے، اس کے بعد دوسری لوح ہے۔ بعد میں مرزا غالب کی وہ تصویر ہے جس پر ''غالب نام آورم نام و نشانم مپرس۔ هم اسداللہم و هم اسداللہیم'' لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد مولانا حالی کا لکھا ہوا ۸ صفحات کا 'دیباچہ' ہے۔ صفحہ ۹ سے متن شروع ہوتا ہے جو صفحہ ۴۳۸ پر ختم ہوتا ہے۔ صفحات ۴۳۹ و ۴۴۰ پر غلط نامہ ہے۔ ٹائٹل اور خاتمے کے صفحات شامل کر کے کل صفحات ۴۴۴ ہوتے ہیں۔

یہ پہلا ایڈیشن ہے جو جرمن پیپر پر چھپا تھا اور اس کی قیمت اس وقت دو روپے تھی۔

۱۸۹۷ء کے بعد 'یادگار غالب' دوسری مرتبہ علی گڑھ سے شائع ہوئی، اس کی لوح کی کیفیت یہ ہے:

یادگار غالب

مصنف کی اجازت سے محمڈن کالج بک ڈپو نے بار دوم مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع کرایا۔ قیمت فی جلد دو روپے۔ تعداد طبع ۲۰۰۰۔

اس کے بعد برصغیر پاک و ہند کے مختلف مطابع نے اسے لاتعداد بار شائع کیا۔ مختلف امتحانات کے نصابات میں شامل ہو جانے کی وجہ سے یہ تلخیص کی صورت میں بھی

شائع ہوتی رہی ۔ مکمل صورت میں اس کے دو ایڈیشن لائق ذکر ہیں :

۱- یادگار غالب : ناشر شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ۔ مطبوعہ مطبع کریمی لاہور ، باہتمام میر قدرت اللہ ۔ تعداد صفحات ۳۹۱ ۔

شیخ مبارک علی نے اسے پہلی بار ۱۹۲۴ء میں چھاپا ۔ اس کے بعد اس کو متعدد بار شائع کیا ۔

۲- یادگار غالب : ناشر رائے صاحب لالہ رام دیال اگر والا ، الہ آباد ۔ مطبوعہ شانتی پریس الہ آباد ۱۹۳۱ء ۔

تقطیع صغیر ۔ صفحات ۴۱۰

تصحیح متن

موجودہ نسخے کا متن 'یادگار غالب' طبع اول (نامی پریس کان پور ۱۸۹۷ء) کے مطابق درست کیا گیا ہے ۔ مصنف کی حیات کے مطبوعہ دو نسخوں (نامی پریس اور مطبع فیض عام علی گڑھ) کے متون کو دوسرے نسخوں پر ترجیح دی گئی ہے ۔ ترتیب کے وقت مرقومۃ الذیل نسخے پیش نظر رہے ہیں :

۱- یادگار غالب ۔ مطبوعہ نامی پریس کان پور ۱۸۹۷ء طبع اول ۔

۲- یادگار غالب ۔ مطبوعہ مطبع فیض عام علی گڑھ ،

طبع دوم بہ اجازت مصنف -

۳- یادگار غالب - ناشر رائے صاحب لالہ رام دیال اگر والا الہ آباد ۱۹۳۱ء -

۴- یادگار غالب - ناشر شیخ مبارک علی تاجر کتب لاھور ، طبع اول ۱۹۲۴ء ، طبع سوم ۱۹۳۰ء -

نوٹ : تاریخی اور واقعاتی اغلاط اور لغزشوں کی نشان دھی و تصحیح حواشی میں کر دی گئی ھے -

وفات حالی

آخری زمانے میں مولانا حالی بیمار رھنے لگے تھے - کھانسی کی عموماً شکایت تھی - اکثر اوقات گھر میں ھی لیٹے رھتے تھے - مرنے سے چند دن پہلے ایک قسم کا فالج گرا[1] جس سے بولنے کی طاقت نہ رھی - شعر و شاعری متروک تھی - اسی کیفیت میں ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ کو پانی پت میں انتقال فرمایا - آپ بو علی قلندر کی درگاہ میں مدفون ھیں - عیسوی سن کے لحاظ سے مولانا کی عمر ۷۷ سال اور ھجری سن کے اعتبار سے ۸۰ سال ھوتی ھے -

جشن صد سالہ ولادت حالی

مولانا حالی ۱۲۵۳ھ میں پیدا ھوئے تھے - ۱۳۵۳ھ

---

۱ - 'حالی' از نجم الحسن نقوی مشمولہ 'مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج میگزین' بابت فروری ، مارچ ، اپریل ۱۹۳۱ء

میں ان کی ولادت کو ۱۰۰ سال ہو گئے تو ان کے وطن میں 'جشن صد سالۂ ولادت حالی' منایا گیا۔ ۲۷ رجب ۱۳۵۴ھ مطابق ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو یہ جشن ہوا، جس کی صدارت نواب بھوپال نے کی اور حالی میموریل اسکول پانی پت کو بیس ہزار روپے عطا فرمائے۔ اس موقع پر حکومت پنجاب نے بھی ایک ہزار روپیہ دیا۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اس موقع پر یہ قطعہ کہہ کر خراج تحسین ادا کیا ہے:

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد
سید دیگر او را نمے از اشک سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز نیا سود
تا لالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد

اس موقع پر حامد حسن قادری صاحب نے بھی ایک قطعۂ فارسی میں چند تاریخیں مرتب کی تھیں اور یہ تاریخ عربی میں کہی تھی: ''واللہ ذالک فوز عظیم[۱]''

۱۹۳۵ء

حالی کے اس جشن صد سالہ کے موقع پر برصغیر پاک و ہند کے مجلات نے حالی نمبر شائع کیے تھے۔ 'زمانہ' کان پور اور 'جامعہ' دھلی لائق مطالعہ ھیں۔

۱۔ داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری۔ طبع دوم۔ عزیزی پریس آگرہ، ۱۹۵۷ء، صفحہ ۵۴۹۔

ہے افسوس ہے کہ مقدمے کے تمام ابواب کی تکمیل نہ ہوسکی اور یہ نا تمام صورت میں ہی پریس کے حوالے کرنا پڑا ۔ بعض اہم اور ضروری باتیں بھی رہ گئی ہیں جو آئندہ اشاعت میں شامل کر دی جائیں گی ۔ اپنے عزیز دوست ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی تحقیقات سے جو فائدہ مجھے پہنچا ہے اس کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف کا شکر گزار ہوں ۔ شفیق پریس کے مالک جناب شفیق صاحب کو مقدمہ کی عدم تکمیل کی وجہ سے اچھی خاصی مدت تک زحمت کش انتظار رہنا پڑا جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں اور سپاس گزار بھی ۔ ان کو زحمت بھی پہنچی اور کام کی تکمیل بھی نہ ہو سکی ۔ بہر حال اب آئندہ اشاعت میں ان شاء اللہ تعالیٰ ان کوتاہیوں کی تلافی کر دی جائے گی ۔

خلیل الرحمان داؤدی

نومبر ۱۹۶۳ء — ٹیگور پارک ، لاہور

صحت نامہ اغلاط

مقدمہ یادگار غالب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۲	زندگی ہے	حالات زندگی ہیں
۵	۱ تا ۳	خواجہ ملک علی نے	خواجہ ملک علی کی اولاد نے
۹	۱۷	نقلی	نقل
۱۳	۴	علم و ادب	علم ادب
۱۹	۲۰	پڑا	پڑھا
۲۰	۵	۲	۱
۲۱	۱۱	مولانا	مولانا نے
۲۶	۱۵، ۱۶	تاریخ محمدی پر رائے منصفانہ	تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے
۳۱	۱۲	انتخاب داغ	انتخاب کلام داغ
۳۱	۲۰	۱۸۸۹	۱۸۹۲
۳۲	۱۱	۱۸۸۹	۱۸۹۲
۳۶	۱۹	دلی	دبی
۳۸	۱۶	مئتب	ترتیب
۳۹	۹	و سید مظفر مرزا نواب حسام الدین حیدر خاں	و سید مظفر مرزا نبائر نواب حسام الدین حیدر خاں

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۳۰	۱	تصوف ۳	تصوف
۳۱	۱۳	به خو	به خوبی
۳۲	۱۲	۸ تک	۸
۳۶	۱۳	۲۱ دسمبر	۳ دسمبر

یادگار غالب

از

مولانا الطاف حسین حالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تیرھویں صدی ھجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور اُن کی دولت ، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہوچکے تھے ، حسن اتفاق سے دارالخلافۃ دہلی میں چند اھل کمال ایسے جمع ھو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ھیں :

ھند را خوش نفسانند سخن ور کہ بود
باد در خلوت شان مشک فشان از دم شان
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی ، اشرف و آزردہ بود اعظم شان

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ھی بار راقم کا دلی جانا ھوا ، اس باغ میں پت جھڑ شروع ھوگئی تھی - کچھ لوگ دلی سے باھر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ھوچکے تھے ، مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھ کو ھمیشہ فخر رہے گا ، وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے ،

بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا، کیوں کہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچا بدل گیا اور جس ہوا میں انھوں نے نشوونما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی :

زمانہ دگر گونہ آئین نہاد
شد آن مرغ کو بیضہ زرین نہاد

علی الخصوص مرزا اسداللہ خاں غالب جن کی عظمت و شان اس سے بالا تر تھی کہ ان کو بارھویں یا تیرھویں صدی ہجری کے شاعروں یا انشاپردازوں میں شمار کیا جائے۔

مرزا نے اپنی کتاب ''مہر نیم روز'' میں ایک موقع پر بہادر شاہ کی طرف خطاب کرکے یہ ظاہر کیا ہے کہ شاہ جہاں کے عہد میں کلیم شاعر سیم و زر میں تولا گیا تھا، مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے۔ اس مضمون کو جو لوگ مرزا کے رتبے سے واقف نہیں ہیں، شاید خود ستائی اور تعلی پر محمول کریں گے، مگر ہمارے نزدیک مرزا نے اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کیا، بلکہ بالکل وہی کہا ہے جو ان کے زمانے کے اہل نظر اور اہل تمیز ان کی نسبت رائے رکھتے تھے۔

اگرچہ زمانے نے اپنی بساط کے موافق مرزا کی کچھ کم قدر نہیں کی۔ ان کا تمام کلام اردو، فارسی، نظم، اور نثر ان کے جیتے ہی جی اطراف ہندوستان میں پھیل گیا تھا۔ ان کے ماننے والے اور مداح و ثنا خوان ملک کے ہر گوشے میں

پائے جاتے تھے اور اب تک پائے جاتے ہیں[1] ۔ مدحیہ قصائد پر اُن کو کم و بیش صلے اور خلعت و انعام بھی ملتے رہے ۔ مرحوم بہادر شاہ نے بھی اپنی حیثیت کے موافق ان کی خاصی قدر کی ۔ ریاست رام پور سے اُن کے لیے اخیر دم تک معقول وظیفہ جاری رہا ۔ یہ سب کچھ ہوا ، مگر جب مرزا کے اُس اعلیٰ مرتبے کا جو شاعری و انشاپردازی میں فی الواقع اُنھوں نے حاصل کیا تھا ، ٹھیک اندازہ کیا جاتا ہے تو ناچار یہ کہنا پڑتا ہے کہ زمانے کی یہ تمام قدردانی زیادہ سے زیادہ اُس پیرزال کی سی قدردانی تھی جو ایک سوت کی اٹی لے کر یوسف کی خریداری کو مصر کے بازار میں آئی تھی ۔ سچ یہ ہے کہ مرزا کی قدر جیسی کہ چاہیے یا جلال الدین اکبر کرتا ، یا جہاں گیر و شاہ جہان ، مگر جس قدر اس اخیر دور میں ان کو مانا گیا اُس کو بھی نہایت مغتنم سمجھنا چاہیے :

بکے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتوں
یہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام اُن کی شاعری اور انشاپردازی کے سوا نظر نہیں آتا ، مگر صرف اسی ایک کام نے اُن کی لائف کو دارالخلافے کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہوگیا اور اُردو نظم و نثر پر بھی اُن کا کچھ کم احسان نہیں ہے ،

[1] مولانا حالی اسی کتاب میں آگے چل کر یوں رقم طراز ہیں :
"اگرچہ مرزا اپنی شاعری کا سکہ اس وجہ سے کہ زمانہ اس کا اندازہ کرنے سے عاجز تھا، پبلک کے دلوں پر جیسا کہ چاہیے تھا ، نہیں بٹھا سکے ...."
کیا یہ تضاد بیانی نہیں ہے ؟ داؤدی

اس لیے کبھی کبھی مجھ کو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں اور اُن کی شاعری و انشا پردازی کے متعلق جو امور کہ احاطۂ بیان میں آسکیں اور ابنائے زماں کی فہم سے بالا تر نہ ہوں، اُن کو اپنے سلیقے کے موافق قلم بند کروں۔

پچھلے برسوں میں جب کہ میں دلی میں مقیم تھا، بعض احباب کی تحریک سے اس خیال کو اور زیادہ تقویت ہوئی۔ میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لے کر جمع کیا، اور جس قدر اُس میں اُن کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا اُن کو قلم بند کیا، اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں اُن کو بھی ضبط تحریر میں لایا، مگر ابھی ترتیب مضامین کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ اور کاموں میں مصروف ہوگیا، اور کئی برس تک وہ تمام یادداشتیں کاغذ کے مٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں۔

ان دنوں میں دوستوں کا پھر تقاضا اور بہت سخت تقاضا ہوا اور باوجودیکہ میں ایک نہایت اہم اور ضروری کام میں مصروف تھا، دوستوں کے تقاضے نے یہاں تک مجبور کیا کہ اُس ضروری کام کو چند روز کے لیے ملتوی کرنا پڑا اور یہ خیال کیا گیا کہ جو یادداشتیں مرزا کی لائف کے متعلق بڑی کوشش سے جمع کی گئی ہیں اور جو تھوڑی سی توجہ سے مرتب ہو سکتی ہیں اُن کو اب زیادہ حالت منتظرہ میں رکھنا مناسب نہیں۔

میں نے اُن مٹھوں کو کھولا اور اُن یادداشتوں کے مرتب کرنے کا ارادہ کیا، مگر اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی اور اس کے سوا کچھ اور کتابیں بھی درکار ہوں گی۔ میں نے دلی کے بعض[1] بزرگوں اور دوستوں کو لکھا اور اُنھوں نے مہربانی فرما کر میری تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات اُن کو معلوم ہوسکے، لکھ کر میرے پاس بھیج دئے اور اس طرح مرزا کی لائف جہاں تک کہ اُس کی تکمیل ہوسکتی تھی، مکمل کی گئی۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ مرزا کی لائف میں کوئی منوہ بالشان واقعہ اُن کی شاعری و انشاپردازی کے سوا نظر نہیں آتا، لہذا جس قدر واقعات اُن کی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں اُن کو ضمنی اور استطرادی سمجھنا چاہئے۔ اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب و غریب ملکے کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خداتعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرائے میں، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رند مشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف اور حب اہل بیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا اُس کو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔

---

۱ - یعنی نواب سعیدالدین احمد خاں، خلف الصدق نواب ضیاءالدین احمد خاں مرحوم اور سید اکبر مرزا و سید مظفر مرزا نبائر نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم اور میر مہدی حسین مجروح اور لالہ بہاری لال مشتاق ۱۲ -

لٹریری دنیا میں بہت سے صاحب کمال ایسے گزرے ہیں جن کے زمانے میں اُن کی قدر و منزلت کا پورا پورا اندازہ نہیں کیا گیا، مگر آخر کار اُن کا کمال ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ سعدی کے زمانے میں اُس کے اکثر ہم‌عصر امامی ہروی کو اُس پر ترجیح دیتے تھے، مگر کچھ بہت عرصہ نہ گزرا تھا کہ سعدی کا نام اور اُس کا کلام اطراف عالم میں منتشر ہو گیا اور امامی کا کلام صرف تذکروں میں باقی رہ گیا۔ شکسپیئر کے عہد میں اُس کو ایک ایکٹر سے زیادہ رتبہ نہیں دیا گیا، مگر آج اُسی شکسپیئر کے ورکس بائبل کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں۔ خود مرزا بھی اپنے کلام کی نسبت ایسا ہی خیال رکھتے تھے، چنانچہ ایک فارسی غزل میں فرماتے ہیں:

تا ز دیوانم که سر مست سخن خواهد شدن
این می از قحط خریداری کہن خواهد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بوده است
شہرت شعرم به گیتی بعد من خواهد شدن

اگرچہ اس لحاظ سے کہ ایشیائی شاعری کا مذاق یورپین سولزیشن میں روز بروز جذب ہوتا جاتا ہے اور فارسی لٹریچر ہندوستان سے ایسا رخصت ہوا ہے کہ بظاہر اُس کے مراجعت کرنے کی توقع نہیں رہی، یہ امید رکھنی تو فضول ہے کہ مرزا کی فارسی نظم و نثر اب یا آئندہ زمانے میں مقبول خاص و عام ہوگی، لیکن جو تو بر تو پردے مرزا کی شاعری اور نکتہ پردازی پر اُن کی زندگی میں پڑے رہے اور جو اب تک مرتفع نہیں ہوئے، کیا عجب ہے کہ ہماری یا ہمارے بعد کسی دوسرے شخص کی کوشش سے رفع ہو جائیں۔

مرزا کو بحیثیت شاعری پبلک سے روشناس کرنے اور اُن کی شاعری کا پایہ لوگوں کی نظر میں جلوہ‌گر کرنے کا عمدہ طریقہ یہ تھا کہ اُن کے اصناف کلام میں سے ایک معتدبہ حصہ نقل کیا جاتا ۔ ہر صنف میں جو باتیں مرزا کی خصوصیات سے ہیں وہ بیان کی جاتیں ۔ جو کلام نقل جاتا اُس کی لفظی و معنوی خوبیاں ، نزاکتیں اور باریکیاں ظاہر کی جاتیں ۔ شعراء کے جس طبقے میں مرزا کو جگہ دینی چاہیے اُس طبقے کے شاعروں کے کلام سے مرزا کے کلام کا موازنہ کیا جاتا ۔ اُن کی غزل سے مرزا کی غزل کو ، قصیدے سے قصیدے کو اور اسی طرح ہر صنف سے اسی صنف کو ٹکرایا جاتا اور اس طرح مرزا کے پایۂ شاعری اور اُن کے کلام کی حقیقت سے اہل وطن کو خبردار کیا جاتا ، مگر یہ طریقہ جس قدر مصنف کے حق میں دشوار گزار تھا اُسی قدر پبلک کے لیے ، خاص کر اس زمانے میں غیر مفید بھی تھا ۔ اگر ہم اس دشوار گزار منزل کے طے کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ہماری وہی مثل ہوتی کہ 'مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والوں کو مزا نہ آیا ۔'

ناچار ہم نے بجائے طریقۂ مذکور کے جو حالت موجودہ میں باوجود دشوار ہونے کے غیر مفید بھی ہے، اس موقع پر ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جو ہمارے لیے سہل‌تر اور پبلک کے لیے مفید تر معلوم ہوتا ہے ۔ ہم نے دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام کو چار قسموں پر تقسیم کیا ہے : نظم اردو، نثر اردو ، نظم فارسی اور نثر فارسی، اور اسی ترتیب سے ہر قسم کا تھوڑا تھوڑا انتخاب چار جدا جدا فصلوں میں درج کیا ہے ۔ ہر قسم پر اول کچھ مختصر ریمارکس کیے

ہیں ، پھر اس قسم کا انتخاب لکھا گیا ہے اور جو اشعار یا فقرے شرح طلب سمجھے ہیں اُن کی جابجا شرح بھی کر دی گئی ہے اور کہیں کہیں محاسن کلام کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور آخر میں خاص کر اُن لوگوں کے لیے جو فارسی لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں، نمونے کے طور پر مرزا کے کسی قدر فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلم‌الثبوت اُستادوں کے کلام کے ساتھ کر کے دکھایا ہے کہ مرزا نے فارسی لٹریچر میں کس درجے تک کمال بہم پہنچایا تھا۔

مذکورہ بالا انتخاب سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ مرزا کے کلام میں جس قدر بلند اور پاکیزہ خیالات تھے وہ سب لے لیے گئے ہیں اور جو اُن سے پست درجے کے خیالات تھے وہ چھوڑ دیے گئے ہیں ؛ نہیں ، بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس رسالے کی بساط اور وسعت کے موافق تا بمقدور ہر ایک صنف میں سے کم و بیش ایسا کلام لے لیا گیا ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے مذاق سے بیگانہ اور اُن کی فہم سے بعید تر نہ ہو اور باوجود اُس کے مؤلف کی نظر میں بھی بوجہ من الوجوہ انتخاب کے قابل ہو۔

اس انتخاب سے جس کو مرزا کے تمام کلام کا نمونہ سمجھنا چاہیے کئی فائدے تصور کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ شعر کی سمجھ اور اس کا عمدہ مذاق رکھتے ہیں اُن کو بغیر اس کے کہ تمام کلیات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہو ، مرزا کا ہر قسم کا عمدہ کلام ایک جگہ جمع کیا ہوا مل جائے گا۔ دوسرے جو لوگ مرزا کا کلام اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے وہ بسبب اس کے کہ ہر مشکل شعر یا فقرے کے معنی حل کر دیے گئے ہیں ، مرزا کے خیالات سے

بخوبی واقفیت حاصل کر سکیں گے اور دونوں طبقوں کو معلوم ہو جائے گا کہ مرزا نے قوت متخیلہ اور ملکۂ شاعری کس درجے کا پایا تھا اور کس خوبی اور لطافت سے وہ نہایت نازک اور دقیق خیالات کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ادا کرنے کی قدرت رکھتے تھے -

الغرض یہ رسالہ دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے - پہلے حصے میں مرزا کی زندگی کے واقعات ، جہاں تک کہ معلوم ہو سکے ، اور اُن کے اخلاق و عادات و خیالات کا بیان ہے - انھیں حالات کے ضمن میں اُن کی خاص خاص نظمیں یا اشعار جو کسی واقعے سے علاقہ رکھتے ہیں اور اُن کے لطائف و نوادر جن سے مرزا کی طبیعت کا اصلی جوہر اور اُن کی امیجنیشن کی قوت نہایت واضح طور پر ظاہر ہوتی ہے ، اپنے اپنے موقع پر ذکر کیے گئے ہیں - دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلام نظم و نثر اردو اور فارسی کا انتخاب اور ہر قسم پر جدا جدا ریویو اور آخر میں مرزا کے کسی قدر کلام کا موازنہ ایران کے بعض مسلم‌الثبوت استادوں کے کلام کے ساتھ کیا گیا ہے - خاتمۂ کتاب پر ایک مختصر ریویو مرزا کی تمام لائف اور اُن کی طرز شاعری و انشاپردازی پر لکھا گیا ہے ، جس کو ساری کتاب کا لب لباب سمجھنا چاہیے -

اگرچہ مرزا کی لائف ، جیسا کہ ہم آئندہ کسی موقع پر بیان کریں گے ، اُن فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک بائیوگرافی سے حاصل ہونے چاہئیں ، لیکن اگر ان فائدوں سے قطع نظر کی جائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو ،

ہماری پژمردہ اور دل مردہ سوسائٹی کے لیے کچھ کم ضروری نہیں ہے ۔ اس کے سوا ہر قوم میں عموماً اور گری ہوئی قوموں میں خصوصاً ایسے عالی فطرت انسان شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات سے اگرچہ قوم کو براہ راست کوئی معتدبہ فائدہ نہ پہنچا ہو ، لیکن کسی علم یا صناعت یا لٹریچر میں کوئی حقیقی اضافہ کم و بیش ظہور میں آیا ہو اور سلف کے ذخیرے میں کچھ نیا سرمایہ شامل ہوا ہو ۔ ایسے لوگوں کی لائف پر غور کرنا ، اُن کے ورکس میں چھان بین کرنی اور اُن کے نوادر افکار سے مستفید ہونا ، قوم کے اُن فرائض میں سے ہے جن سے غافل رہنا قوم کے لیے نہایت افسوس کی بات ہے ، جیسا کہ خود مرزا ایک جگہ لکھتے ہیں ''حیف کہ ابنائی روزگار حسن گفتار مرا نشناختند ۔ مرا خود دل برآنان می سوزد کہ کامیاب شناسائی فرہ ایزدی نگشتند و ازیں نمایشہائی نظر فروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام ، سرگران گزشتند ۔''

آغاز کتاب

تاریخ ولادت، خاندان

میرزا اسد اللہ خان غالب المعروف بہ میرزا نوشہ، المخاطب بہ نجم الدولہ، دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر، نظام جنگ، المتخاص بہ غالب در فارسی و اسد در ریختہ شب هشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ ھجری کو شہر آگرہ میں پیدا ھوئے۔ مرزا کے خاندان اور اصل و گوھر کا حال، جیسا کہ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں جابجا ظاھر کیا ھے، یہ ھے کہ اُن کے آبا و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے اور اُن کا سلسلۂ نسب تورا بن فریدوں تک پہنچتا ھے۔ جب کیانی تمام ایران و توران پر مسلط ھوگئے اور تورانیوں کا جاہ و جلال دنیا سے رخصت ھوگیا تو ایک مدت دراز تک تور کی نسل ملک و دولت سے بے نصیب رھی، مگر تلوار کبھی ھاتھ سے نہ چھوٹی، کیونکہ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ باپ کے متروکے میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہ ملتا تھا اور کل مال و اسباب اور گھر بار بیٹی کے حصے میں آتا تھا۔ بارے ایک مدت کے بعد اسلام کے عہد میں اسی تلوار کی بدولت ترکوں کے بخت خفتہ نے پھر کروٹ بدلی اور سلجوقی

خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم ہوگئی۔ کئی سو برس وہ تمام ایران و توران و شام و روم (یعنی ایشیائے کوچک) پر حکمران رہے۔ آخر ایک مدت کے بعد سلجوقیوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور سلجوق کی اولاد جابجا منتشر و پراگندہ ہو گئی۔ انھیں میں سے ترسم خاں نام ایک امیر زادے نے سمرقند میں بودوباش اختیار کر لی تھی۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم[1] کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان آئے وہ اسی ترسم خان کی اولاد میں تھے۔ مرزا مہر نیم روز کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''از واپسیان ایں قافلہ نیائی من کہ در قلمرو ماوراء النہر، سمرقند شہر مسقط الراس وے بود، چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہ ہند آمد'' اور درفش کاویانی میں اس طرح لکھا ہے ''بالجملہ سلجوقیان بعد زوال دولت و

---

۱ مولانا حالی کا یہ بیان بظاہر مرزا غالب کے بیان پر مبنی معلوم ہوتا ہے، لیکن اس سلسلے میں مرزا غالب اور مولانا حالی دونوں غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

مرزا غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ خان سمرقند سے ہندوستان آئے اور لاہور پہنچ کر نواب معین الملک عرف میر منو کی ملازمت اختیار کی۔ نواب معین الملک کا انتقال نومبر ۱۷۵۰ء میں ہو جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ مرزا قوقان بیگ خان ۱۷۵۰ء سے قبل لاہور پہنچے۔ اُدھر شاہ عالم ثانی ۱۷۵۹ء میں تخت پر بیٹھتا ہے، اس لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ مرزا قوقان بیگ خاں لاہور پہنچ کر نواب معین الملک (وفات ۱۷۵۰ء) کی ملازمت بھی کریں اور وہ عہد بھی شاہ عالم ثانی (سال تخت نشینی ۱۷۵۹ء) کا ہو۔ نواب معین الملک شاہ عالم ثانی کے عہد میں نہیں، بلکہ محمد شاہ کے عہد میں لاہور کے صوبہ دار تھے، اس لیے مرزا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے زمانے میں نہیں، بلکہ محمد شاہ کے زمانے میں وارد ہند ہوئے۔ داؤدی

برهم خوردن هنگامۂ سلطنت در اقلیم وسیع الفضای ماوراء النہر پرا گندہ شدند ۔ ازاں جملہ سلطان زادہ ترسم خان کہ ما از تخمۂ اوئیم سمرقند را بہر اقامت گزید تا در عہد سلطنت شاہ عالم نیائی من از سمرقند بہ ہندوستان آمد ۔،،

مرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی اور ہندوستان کی زبان بہت کم سمجھتے تھے ۔ اُس زمانے میں ذوالفقارالدولہ مرزا نجف خان شاہ عالم کے دربار میں دخل کلی رکھتے تھے؛ نجف خاں نے مرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوا دیا اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ میں مقرر کر دیا ۔ اُن کے کئی بیٹے تھے جن میں سے دو کے نام معلوم ہیں ؛ ایک مرزا کے باپ عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولھا اور دوسرے نصراللہ بیگ خان ۔ عبداللہ بیگ خان کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی ، جو کہ سرکار[۱] میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائد شہر آگرہ میں سے تھے ۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں نے بطور خانہ داماد کے اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی اور اُن کی اولاد نے بھی وھیں پرورش پائی ۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں کے دو بیٹے ہوئے ؛ ایک مرزا اسد اللہ خاں اور دوسرے مرزا یوسف خاں جو ایام شباب میں مجنون ہوگئے تھے اور اسی حالت میں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا ۔

مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں ، جیسا کہ مرزا نے خود ایک خط میں لکھا ہے ، اول لکھنؤ میں جا کر نواب

---

۱ سرکار ملک کے اُس حصے کو کہتے تھے جو صوبے کی نسبت چھوٹا اور پرگنہ و محال وغیرہ سے بہت بڑا ہوتا تھا ۔

آصف‌الدولہ کے ہاں نوکر ہوئے اور چند روز[1] بعد وہاں سے حیدرآباد پہنچے اور سرکار آصفی میں تین سو سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے، مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی اور وہ واپس آگرے میں چلے آئے۔ یہاں آکر انھوں نے الور کا قصد کیا۔ راجا بختاور سنگھ نے بھی اُن کو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی کہ اتفاق سے انھیں دنوں میں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے۔ جو فوج اس گڑھی پر سرکوبی کے لیے بھیجی گئی اس کے ساتھ مرزا عبداللہ بیگ خاں کو بھی بھیجا گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ان کے گولی لگی اور وہیں اُن کا انتقال ہوگیا اور راج گڑھ[2] میں دفن ہوئے۔ راجا بختاور سنگھ

---

۱ مولانا محمد حسین آزاد، آبحیات میں رقم‌طراز ہیں:

''چند روز بعد حیدرآباد میں جاکر نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس کے بعد ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں یہ صورت بھی بگڑی ....''

(آبحیات، ناشر شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور بار دوازدہم (صفحہ ۵۰۱)

کیا مولانا حالی مرقومہ بالا عبارت سے بلا اعتراف مستفید نہیں ہوئے؟

آبحیات ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی اور یادگار غالب ۱۸۹۷ء میں۔
داؤدی

۲ مرزا نے جو قصیدہ راجا شیو دھیان سنگھ کی مدح میں لکھا ہے، اس میں لکھتے ہیں:

در پنج سالگی شدہ ام چاکر حضور
رنگین سخن طرازم و دیریں وظیفہ خوار
باید شنید راز ز اعیان بارگاہ
باید شنفت قصہ ز پیران آن دیار
دارم بگوش حلقہ ز پنجاہ و ہشت سال
اکنوں کہ عمر شصت و سہ سالست در شمار
کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست
در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

رئیس الور نے دو گاؤں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ مرزا مرحوم کے دونوں لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کردیا جو ایک مدت دراز تک جاری رہا - مرزا کے والد کی وفات کے بعد اُن کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے اُن کو پرورش کیا -

جب سرکار انگریزی کی عمل‌داری ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہوگئی اور نواب فخرالدولہ احمد بخش خاں لارڈ لیک کے لشکر میں شامل ہوئے تو اُنھوں نے مرزا غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کو جن سے نواب موصوف کی ہمشیر منسوب تھیں، سرکاری فوج میں بہ عہدۂ رسالداری ملازم کرادیا - اُن کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے، یعنی سونک اور سونسا جو نواح آگرہ میں واقع ہیں، سرکار سے اُن کے نام پر مقرر ہوگئے - جب تک وہ زندہ رہے دونوں پرگنے اُن کے نامزد رہے اور اُن کی وفات کے بعد اُن کے وارثوں اور متعلقوں کی پنشنیں سرکار نے فیروزپور جھرکہ کی ریاست سے مقرر کرادیں جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا، مگر فتح دھلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے سبب یہ پنشن بند رہی - آخر جب مرزا کی ہر طرح سے بریت ہوگئی تو پنشن پھر جاری ہوگئی اور تین برس کی واصلات بھی سرکار نے عنایت کی - جب تک پنشن بند رہی مرزا کے دوستوں کو نہایت تعلق خاطر رہا -

لطیفہ

اکثر لوگ پنشن کا حال دریافت کرنے کو خط بھیجتے تھے؛ ایک دفعہ میر مہدی نے اسی مضمون کا خط

بھیجا تھا۔ اُس کے جواب میں مرزا صاحب لکھتے ہیں ''میاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے، اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹا آگے خدا رزاق ہے، کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے:''

مرزا نے اپنے علو خاندان پر جا بجا فارسی اشعار میں فخر کیا ہے؛ چونکہ اُن میں سے بعض اشعار لطف سے خالی نہیں، اس لیے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں:

قطعہ

غالب از خاک پاک تورانیم
لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی
بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکیم[۱] از جماعۂ اتراک
در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فن آبائی ما کشا ورزیست
مرزبان زادۂ سمر قندیم
ور ز معنی سخن گزاردہ
خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم
عقل کل را بہینہ فرزندیم

---

۱ ایبک ترکی لفظ ہے، مرکب آئے اور بک سے - آے چاند کو اور بک کامل اور بزرگ کو کہتے ہیں؛ پس ایبک کے معنی ماہ تمام و بزرگ کے ہیں، اسی لیے مرزا نے کہا ہے ''در تمامی ز ماہ دہ چندیم۔''

هم به تابش به برق هم نفسیم
هم به بخشش به ابر مانندیم
به تلاشی که هست فیروزیم
بمعاشی که نیست خرسندیم
همه بر خویشتن همی گرییم
همه بر روزگار می خندیم

قطعه

ساقی! چو من پشنگی و افراسیا بیم[1]
دانی که اصل گوهرم از دودهٔ جم ست
میراث جم که می بود اکنون بمن سپار
زیں پس رسد بهشت که میراث آدم ست

ربا عی

غالب به گہر ز دودهٔ زاد شمم[2]
زاں رو بصفای دم تیغست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بشعر
شد تیر شکستهٔ نیاگان قلمم

تعلیم

مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سن شعور تک آگرے ھی میں رہے۔ اگرچه سات برس کی عمر سے وہ دلی میں آنے جانے لگے تھے، لیکن شادی کے بعد تک اُن کی مستقل سکونت آگرے ھی میں رهی اور شیخ معظم جو اُس زمانے میں آگرے کے نامی معلموں میں سے تھے اُن سے تعلیم پاتے رہے۔ اُس کے بعد ایک شخص پارسی نژاد جس کا نام

۱- پشنگ افراسیاب کے باپ کا نام ھے- ۲- زادشم افراسیاب کے دادا اور پشنگ کے باپ کا نام ھے-

آتش پرستی کے زمانے میں ہرمزد تھا اور بعد مسلمان ہونے کے عبدالصمد رکھا گیا ، غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا جو کہ دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرے میں اور پھر دلی میں مقیم رہا - مرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی۔ اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ 'مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے - چونکہ مجھ کو لوگ بے استادا کہتے تھے اُن کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے' مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اُس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی ؛ چنانچہ مرزا نے جابجا اُس کے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اُس کو بلفظ تیمسار جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے ، یاد کیا ہے ؛ لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے ، مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد اُن کے مکان پر وارد ہوا ہے اور کل دو برس اُس نے وہاں قیام کیا - پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اُس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اُس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد[1]

١- انہیں عبدالصمد کے متعلق مولانا حالی اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ یوں رقم طراز ہیں :

"مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کے بول چال اور ان کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا -"

تعجب ہے کہ جس عبدالصمد کی تعلیم کا عدم و وجود برابر تھا اُس کی تعلیم نے پھر کس طرح فارسیت کا رنگ مرزا کے بول چال اور قوت متخیلہ پر چڑھا دیا تھا - مولانا حالی کی یہ تضاد بیانی لائق توجہ ہے - داؤدی

اور اُس کی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے، اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔

ایک جگہ مرزا نے مبداء فیاض سے مستفید ہونے کا مضمون نہایت عمدگی سے باندھا ہے اور وہ شعر یہ ہے:

آنچه در مبداء فیاض بود آن من ست
گل جدا ناشده ازشاخ بدامان من‌ست

ایک اور مقام پر اس سے بھی زیادہ عمدہ طریقے سے یہ مطلب ادا کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

باخذ فیض ز مبداء فروزم از اسلاف
که بوده ام قدرے دیر تر دران درگاه
ظهورمن بجهاں در هزار وبست و دویست[1]
ظهور خسرو و سعدی به شش صد و پنجاه

ملا عبدالصمد علاوہ فارسی زبان کے جو اُس کی مادری زبان اور اُس کی قوم کی مذہبی زبان تھی، عربی زبان کا بھی، جیسا کہ مرزا نے لکھا ہے، بہت بڑا فاضل تھا۔ اگرچہ مرزا کو اُس کی صحبت بہت کم میسر آئی، مگر مرزا جیسے جوہر قابل کو صغر سن میں ایسے شفیق، کامل اور جامع اللسانین استاد کا مل جانا اُن نوادر اتفاقات میں سے تھا جو بہت کم واقع ہوتے ہیں۔ اگرچہ مرزا کو اُس سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا، مگر اُس کے فیض صحبت نے کم سے کم وہ ملکہ ضرور مرزا میں پیدا کر دیا تھا

۱۔ دویست یعنی دو صد۔ اہل زبان اکثر دو کے لفظ کے ساتھ بجائے صد کے یست کا لفظ استعمال کرتے ہیں ۱۲۔

جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ''اگر حاصل شود خوانده و ناخوانده برابر است ، و اگر حاصل نشود هم خوانده و ناخوانده برابر'' معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی حسن قابلیت اور حسن استعداد نے ملا عبدالصمد کے دل پر گہرا نقش بٹھا دیا تھا کہ یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی وہ مدت تک مرزا کو نہیں بھولا ۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا ، یہ فقرہ لکھا تھا ''اے عزیز چہ کسی؟ کہ بایں همه آزادی ها گاه گاه بخاطر می گزری'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ دو برس کے قلیل عرصے میں وہ مرزا کو سکھا سکتا تھا ، اس میں ہرگز مضائقہ نہ کیا ہوگا اور جیسا کہ قاطع برہان اور درفش کاویانی کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے ، اس نے تمام فارسی زبان کے مقدم اصول اور گر اور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جن کو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور پارسی وسنسکرت کا متحدالاصل ہونا اور اسی قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے دل میں بوجہ اوفیٰ تہ نشین کر دی تھیں ۔

تاہل

چونکہ مرزا کے چچا کا رشتہ نواب فخرالدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا اور اس لیے ان کے خاندان سے ایک نوع کا تعلق پیدا ہوگیا تھا، مرزا کی شادی نواب فخرالدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی اور جیسا کہ مرزا نے ایک رقعے میں اشارہ کیا ہے ، تیرہ برس کی عمر میں سات رجب ۱۲۲۵ھ کو ان کا عقد ہو گیا ۔ اس تقریب سے ان کی آمد و رفت دلی میں زیادہ ہو گئی اور

آخر کار یہیں سکونت اختیار کر لی اور اخیر عمر تک دلی ھی میں رہے -

مرزا کے نانا کی جاگیر میں متعدد دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑی املاک تھی - وہ منشی شیو نرائن رئیس آگرہ کو ایک خط میں لکھتے ھیں "میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ھو ، جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ھو تو معلوم ھوا کہ میرے فرزند دل بند ھو - اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہ‌کار - تم کو ھمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم؟ مجھ سے سنو! تمھارے پردادا عہد نجف خاں میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے - جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمھارے پردادا نے بھی کمر کھول دی اور پھر کہیں نوکری نہ کی - یہ باتیں میرے ھوش سے پہلے کی ھیں ، مگر جب میں جوان ھوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر، خاں صاحب کے ساتھ ھیں اور اُنھوں نے جو کتیٹھم گانو اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ھے تو بنسی دھر اُس امر کے منصرم ھیں اور وکالت اور مختاری کرتے ھیں - میں اور وہ ھم عمر تھے - شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ھوں یا چھوٹے ھوں - اُنیس بیس برس کی میری عمر ، اور ایسی ھی عمر اُن کی ؛ باھم شطرنج اور اختلاط اور محبت - آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی - چونکہ گھر اُن کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاھتے تھے چلے جاتے - پس ھمارے اور اُن کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھراور ھمارے دو کٹرے درمیان تھے- ھماری بڑی حویلی وہ ھے کہ جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول

لے لی ہے - اُسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اُس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اُس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرا کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا، اور ایک کٹرا کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا - اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجا بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے - واصل خاں نامی ایک سپاھی تمھارے دادا کا پیش دست رھتا تھا اور وہ کٹروں کا کرایہ آگاہ کر جمع کرواتا تھا - بھائی تم سنو تو سہی ! تمھارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا - علاقے مول لیے تھے اور زمینداره اپنا کر لیا تھا - دس بارہ ہزار روپے کی سرکار کی مال گزاری کرتا تھا - آیا وہ سب کارخانے تمھارے ھاتھ آئے یا نہیں؟ اس کا حال از روئے تفصیل جلد مجھ کو لکھو-،، اس خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا کی آگرے میں ایک خاصی سرکار تھی جس کی بدولت اُن کے ملازم اور متوسلین دس دس بارہ بارہ ہزار کے مال گزار بن گئے تھے اور مرزا کا بچپن اور عنفوان شباب بڑے اللے اور تللوں میں بسر ہوا تھا -

اهل دهلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا، اُن سے سنا گیا ہے کہ عنفوان شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے اور بڑھاپے میں بھی جب کہ راقم نے پہلی ھی بار اُن کو دیکھا ہے، حسانت اور خوب صورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قدوقامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے ، مگر اخیر عمر میں قلت خوراک اور امراض دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف

وزار ونزار ہوگئے تھے، لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا ، قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے ، اس حالت میں بھی وہ ایک نووارد تورانی معلوم ہوتے تھے -

مسکن

دلی میں اُن کے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کے معلوم ہوتا ہے۔ اس تمام مدت میں اُنھوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لیے نہیں خریدا ، ہمشیہ کرائے کے مکانوں میں رہا کئے[۱] یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرائے کے رہے تھے - جب ایک مکان سے جی اُکتایا اُسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا ، مگر قاسم جان کی گلی یا حبش خان کے پھاٹک یا اُس کے قرب و جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے - سب سے اخیر مکان جس میں ان کا انتقال ہوا ، حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں :

۱- یہ غلط معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کا دھلی میں کوئی مکان ھی نہیں تھا - مرزا غالب کا اپنا مکان ضرور تھا جسے انھوں نے فروخت کر دیا تھا - انوارالدولہ سعدالدین شفق کو مرزا غالب خود لکھتے ھیں :-

"مرا از پیادگان ڈاک تا پوسٹ ماسٹر ھمہ می‌دانند۔ سی سال است کہ خانہ و کاشانہ فروختہ کو بکو می گردم و مقامی معین ندارم - ھرجا کہ ھمی روم دو سہ سال یا کم‌تر یا بیش‌تر می آسایم - پیادہ ڈاک ھمان جا می رسد و نامہ ھا می رساند ......"

(اقتباس از مکتوب مشمولہ کلیات نثر غالب طبع دوم مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۲۸۷ء صفحہ ۲۳۵)

اس خط سے ظاھر ھے کہ مرزا غالب کا اپنا مکان تھا جسے فروخت کرکے وہ کرایے کے مکانوں میں رہ رھے تھے - داؤدی

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

مطالعہ کتب

جس طرح مرزا نے تمام عمر رہنے کے لیے مکان نہیں خریدا اسی طرح مطالعے کے لیے بھی ، باوجودیکہ ساری عمر تصنیف کے شغل میں گزری ، کبھی کوئی کتاب نہیں خریدی، الاماشاءاللہ - ایک شخص کا یہی پیشہ تھا کہ کتاب فروشوں کی دکان سے لوگوں کو کرائے کی کتابیں لادیا کرتا تھا ؛ مرزا صاحب بھی ہمیشہ اسی سے کرائے پر کتابیں منگواتے تھے اور مطالعے کے بعد واپس کر دیتے تھے -

سفر کلکتہ

ظاہرا مرزا نے کوئی لمبا سفر کلکتے کے سوا نہیں کیا - اسی سفر کی آمدورفت میں وہ چند ماہ لکھنؤ اور بنارس میں بھی ٹھہرے تھے - کلکتے جانے کا سبب یہ تھا کہ جب مرزا کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے وفات پائی تھی ، اس وقت مرزا کی عمر نو برس کی تھی اور ان کے بھائی کی عمر سات برس کی تھی - نصراللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد ان کے متعلقوں اور وارثوں کے لیے جن میں مرزا اور ان کے بھائی بھی شریک تھے، جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروز پور جھرکہ پر محول کر دی تھی ، جب تک مرزا صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے ؛ جب سن تمیز کو پہنچے اور شادی بھی ہوگئی ، عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی چند روز میں سب خرچ ہوگیا ، لاچار فکر معاش

دامن‌گیر ہوئی - اول مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروز پور سے جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اُس قدر ہم کو نہیں ملتی - ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا - ادھر قرض خواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا تھا ، ادھر چھوٹے بھائی کو جنون ہوگیا - مرزا جیسے آزاد منش آدمی کے لیے یہ وقت نہایت سخت تھا - اس کشمکش میں اُن کو اس کے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ کلکتے پہنچ کر سو پریم گورنمنٹ میں پنشن کی بابت استغاثہ پیش کریں - چنانچہ مرزا اس حالت کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں ، ''ہنگامۂ دیوانگی برادر یک طرف و غوغائی وام خواہاں یک سو ؛ آشوبی پدید آمد کہ نفس راہ لب ، نگاہ روزنۂ چشم فراموش کرد ، وگیتی بدیں روشنی روشنان درنظر تیرہ و تار شد - بالبی از سخن دوختہ وچشمی ازخویش فروبستہ ، جہان جہان شکستگی و عالم عالم خستگی باخود گرفتم و از بیداد روزگار نالان و سینہ بر دم تیغ مالاں بہ کلکتہ رسیدم -''

غرض کہ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس[1] برس کی تھی

۱- مرزا غالب کی پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ ہجری مطابق ۲۷- دسمبر ۱۷۹۷ء کو ہوئی- اس حساب سے ان کی عمر کا چالیسواں سال ۱۸۳۸ء میں ہوا - 'کچھ کم چالیس' کا مطلب یہ ہے کہ ۳۸-۱۸۳۷ء میں مرزا غالب نے کلکتے کا سفر کیا - یہ بالکل غلط ہے- اگرچہ اس سلسلے میں خود مرزا غالب نے بھی منشی حبیب اللہ خان ذکا حیدرآبادی کو غلط لکھا تھا کہ وہ ۱۸۳۰ء میں کلکتے گئے (اردوئے معلیٰ ناشر شیخ مبارک علی لاہور صفحہ ۲۷) بات دراصل یہ ہے کہ مرزا غالب تاریخوں کے معاملے میں اچھی یاد داشت نہیں رکھتے تھے - اس کے برخلاف کلیات نثر غالب میں متعدد مقامات پر ایسے بیانات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۳۰ء سے بہت پہلے کلکتے پہنچ چکے

جب کہ وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتے پہنچے - کلکتے میں لوگوں نے اُن کی بہت خاطر و مدارات کی اور اُن کو کامیابی کی اُمید دلائی - اسٹرلنگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے جن کی مدح میں مرزا کا فارسی قصیدہ اُن کے کلیات میں موجود ہے، وعدہ کیا کہ تمھارا حق ضرور تم کو ملے گا - کول برک صاحب جو اُس وقت دلی میں رزیڈنٹ تھے اُنھوں نے دلی ہی میں مرزا سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کر لیا تھا۱ - ان

بقیہ صفحہ ۲۵

تھے ، بلکہ ۱۸۲۹ء میں وہ کلکتے کے سفر سے واپس دھلی آ گئے تھے - جناب مولانا غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق مرزا غالب "کچھ کم تین برس دھلی سے باھر رھے" اور ۲ جمادالثانی ۱۲۴۵ھ مطابق ۲۹- نومبر ۱۸۲۹ء کو دھلی واپس پہنچے - مولانا مہر کے نزدیک غالب کی دھلی سے روانگی اپریل ۱۸۲۷ء میں ہوئی - (غالب از مہر طبع چہارم صفحہ ۹۲) اس حساب سے مرزا غالب کی عمر تیس سال کی ہوتی ہے نہ کہ 'کچھ کم چالیس' کی - اگر مولانا حالی ۱۸۳۰ء والے بیان غالب ھی پر اعتماد کرتے ھیں تو اس صورت میں بھی مرزا کی عمر زیادہ سے زیادہ ۳۳ سال کی قرار پاتی ہے - 'کچھ کم چالیس' کی کس طرح بن گئی - داؤدی

۱- یہ غلط ہے - اگر کول بروک صاحب مرزا سے عمدہ رپورٹ کا وعدہ کر لیتے تو مرزا صاحب کو کیا ضرورت پیش آئی تھی کہ انھوں نے کلکتے سے کرنل ھنری املاک کا سفارشی خط بنام سر ایڈورڈ کول بروک حاصل کیا اور سرشتہ دار ریزیڈنسی منشی التفات حسین خاں کے نام نواب اکبر علی خاں متولی امام باڑہ ھوگلی سے خط لکھوایا ، بلکہ اس سلسلے میں جناب مولانا غلام رسول مہر کی رائے تو یہ ہے کہ جس وقت مرزا دھلی سے کلکتے کے لیے چلے تھے تو اس وقت دھلی میں مسٹر کول بروک ریزیڈنٹ بھی نہیں تھے - سر ایڈورڈ کول بروک ۱۸۲۷ء سے ۱۸۲۹ء تک دھلی میں ریزیڈنٹ رہے - داؤدی

امیدوں کے دھوکے میں وہ پورے[1] دو برس کلکتے میں رہے؛ مگر آخرکار نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ گورنمنٹ نے سرجان میلکم گورنر بمبئی سے جو لارڈ لیک کے سکٹری رہ چکے تھے اور انھیں کے روبرو جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں لوگوں کو ملی تھیں، مرزا کے معاملے کی بابت استفسار کیا۔ انھوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا اور جس طرح اور جس قدر پنشن فیروز پور سے ملنی قرار پائی تھی اس کی مفصل کیفیت جو مرزا کے دعوے کے بالکل برخلاف تھی، گورنمنٹ میں بھیج دی[2]۔ جب یہاں سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو انھوں نے ولایت مں اپیل کیا، مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔

مرزا صاحب نے گورنمنٹ ہند سے پانچ درخواستیں کی

۱- مرزا غالب ۲۱- فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے تھے (غالب از مہرطبع چہارم صفحہ ۱۰۵) اور اواخر ستمبر یا اوائل اکتوبر ۱۸۲۹ء میں دھلی واپس ہوئے اور ۲۹- نومبر ۱۸۲۹ء کو واپس دھلی پہنچ گیے ('غالب' از مہر، طبع چہارم صفحہ ۱۲۲) اس اعتبار سے غالب کا کلکتہ میں قیام انیس ۱۹ ماہ اور کچھ روز رہا۔ اس مدت کو "پورے دو برس میں" کہنا صحیح نہیں ہے۔ داؤدی

۲- جناب مولانا غلام رسول مہر کی تحقیق ہے کہ دھلی ریزیڈنسی کے پرانے ریکارڈ میں غالب کی پنشن کے متعلق جو کاغذات ہیں آن سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف ۷- جون ۱۸۰۶ء والا شقہ اس غرض سے سرجان میلکم کے پاس بھیجا گیا تھا کہ اس کی مہر اور دستخط دیکھ کر بتائیں کہ واقعی لارڈ لیک کا ہے - یا جعلی ہے - سرجان کا جواب یہ تھا کہ مہر اور دستخط واقعی لارڈ لیک کے ہیں۔ غالب کے دعاوی کے متعلق نہ ان سے کچھ پوچھا گیا اور نہ انھوں نے موافق یا مخالف کوئی بات لکھی۔

معلوم نہیں مولانا حالی نے کس بنا پر یہ لکھ دیا کہ سرجان میلکم نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا۔ داؤدی

تھیں ؛ ایک، تو یہی کہ اُن کے خیال کے موافق جو مقدار پنشن کی سرکار نے مقرر کی ہے وہ آئندہ پوری ملا کرے، دوسری یہ کہ اب تک جس قدر کم پنشن ملتی رہی ہے اُس کی واصلات ابتدا سے آج تک ریاست فیروز پور سے دلوائی جائے - چونکہ پہلی درخواست نامنظور ہوئی تھی اس لیے دوسری درخواست کیوں کر منظور ہوتی - تیسری درخواست یہ تھی کہ کل پنشن میں جو حصہ میرا قرار پائے وہ اور شرکاء سے علیحدہ کر دیا جائے - چوتھی یہ کہ پنشن فیروزپور سے خزانہ سرکار میں منتقل ہو جائے، تا کہ رئیس فیروزپور سے مانگنی نہ پڑے - (یہ دونوں درخواستیں منظور ہوگئیں اور ان کے موافق اخیر تک عمل در آمد رہا) پانچویں درخواست خطاب اور خلعت کی تھی - جہاں تک معلوم ہے کوئی خطاب گورنمنٹ سے مرزا کو نہیں ملا، لیکن گورنمنٹ ہند اور لوکل گورنمنٹ سے اُن کو ''خان صاحب بسیار مہر بان دوستان،، لکھا جاتا تھا اور جب کبھی دلی میں ویسرائے یا لفٹنٹ گورنر کا دربار ہوتا تھا تو اُن کو بھی مثل دیگر رؤسا و عمائد شہر کے بلایا جاتا تھا اور سات پارچے کا خلعت مع جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید کے اُن کو برابر ملتا رہا اور تمام لوکل حکام اور افسر اُن سے رئیس زادوں کی طرح ملتے ہے -

مجادلہ اہل کلکتہ

کلکتے کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کئے تھے اور اپنے اعتراضوں پر قتیل کا قول سنداً پیش کیا تھا، مگر مرزا ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں خسرو کے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے،

چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں: ''اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔'' اسی لیے وہ قتیل و واقف وغیرہ کو کچھ چیز نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے قتیل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں دلوائی سنگھ[1] فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا اور اہل زبان کے سوا کسی کے قول کو قابل استناد نہیں سمجھتا اور اپنے کلام کی سند میں اہل زبان کے اقوال پیش کئے۔ اس پر معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی۔ اگرچہ مرزا کے طرف دار بھی کلکتے میں بہت تھے، مگر چونکہ مرزا اعتراض اور مخالفت سے بہت جزبز ہوتے تھے، اُن کے گھبرا دینے کو ایک معترض بھی کافی تھا۔ انھوں نے تنگ آ کر ایک مثنوی موسوم بہ باد مخالف، جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہل کلکتہ کی نا مہربانی کی شکایت اور اُن کے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور درد انگیز طریقے سے بیان کئے ہیں، لکھی۔ یہاں اُس مثنوی کے کچھ کچھ اشعار مختلف مقامات سے نقل کیے جاتے ہیں:

ای تماشائیان بزم سخن
وے مسیحا دمان نادرہ فن
ای گران مائگان عالم حرف
خوش نشینان این بساط شگرف

۱۔ مرزا قتیل نو مسلم تھے؛ اسلام لانے سے پہلے ان کا نام دلوائی سنگھ تھا اور فرید آباد ضلع دہلی کے کھتری تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گیے تھے جہاں اُن کی نہایت قدر ہوئی۔۱۲
غالباً یہ ''دیوالی سنگھ'' ہے۔ داؤدی

ای سخن پروران کلکته
وی زبان آوران کلکته
هریکی صدر بزم بارگهی
شمع خلوت سرای کار گهی
هر یکی پیش تاز قافلهٔ
هر یکی کتخدائی مرحلهٔ
ای به شغل وکالت آماده
داد غم خواری جهان داده
ای شگرفان عالم انصاف
به سفارت رسیده از اطراف
ای سخن را طراز جان داده
صفحه را ساز گلستان داده
عطر بر مغز گیتی افشانان
پهلوانان پهلوی دانان
ای گرامی فنان ریخته گو
نغز دریا کشان عربده جو
ای رئیسان این سواد عظیم
وی فراهم شده ز هفت اقلیم
همچو من آرمیدهٔ این شهر
بهر کاری رسیدهٔ این شهر
اسدالله بخت برگشته
درخم و پیچ عجز سر گشته
گرچه ناخوانده میهمان شماست
بی سخن ریزه چین خوان شماست

به تظلم رسیده است این جا
بامید آرمیده است این جا
آرمیدن دهید روز چار
خستهٔ را به سایهٔ دیوار
کار احباب ساختن رسمست
میهمان را نواختن رسمست
آن ره و رسم کارسازی کو؟
شیوهٔ میهمان نوازی کو؟

کیستم؟ دل شکسته غمزدهٔ
بی دلی، خستهٔ، ستم زدهٔ

برق بے طاقتی بجان زدهٔ
آتش غم به جان و مان زدهٔ

از گداز نفس به تاب و تبی
در بیابان یاس تشنه لبی
خس طوفانی محیط بلا
سر بسر گرد کاروان فنا
درد مندی جگر گداختهٔ
از غم دهر زهره باختهٔ
در آ گاهئی فنا زدهٔ
همه بر خویش پشت پا زدهٔ
چه بلا ها کشیده ام آخر
که بدین جا رسیده ام آخر
به سیه روز غربتم بینید
تیره شب هائی وحشتم بینید

انده دوری وطن نگرید
غم هجران انجمن نگرید
نه همین ناله و فغان بلبم
من و جان آفرین که جان بلبم
سویه چون موی کرده است مرا
غصه بدخوی کرده است مرا
ذوق شعر و سخن کجاست مرا
کی زبان سخن سراست مرا
دارم آری ز هر زه لائی خویش
نوحه بر خویش و بی‌نوائی خویش
گردش روزگار خویشتنم
حیرت کاروبار خویشتنم
با من این خشم و کین؟ دریغ دریغ !
من چنان تان چنین؟ دریغ دریغ !
برغریبان کجا رواست ستم ؟
رحم اگر نیست خود چراست ستم ؟

بنده ام بنده مهربانان را
رمز فهمان و نکته دانان را
نه ز آویزش بیان ترسم
من و ایمان من کزان ترسم
که پس از من بسالهائی دراز
بزبان ماند این حکایت باز
که سفیهی رسیده بود این جا
چند روز آرمیده بود این جا

با بزرگان ستیزه پیش گرفت
زحمتی داد و راه خویش گرفت
شوخ چشمی و زشت خوی بود
بے حیای و هرزه گوی بود
هم سفیهانه گفتگوی داشت
هم خراباتیانه هوئی داشت
برگ دنیا نه ساز دینش بود
ننگ دهلی و سرزمینش بود
آه ازان دم که بعد رفتن من
خون دهلی بود بگردن من
تا بوم رنج دوستان باشم
بر دل انجمن گران باشم
شاد گردند کز میان بروم
آوخ از من که من چنان بروم
خستهٔ و مستمند بر گردم
دژم آیم نژند بر گردم
بود اعم کس از شما نه رسد
شوق را مژدهٔ وفا نه رسد

دوستان را اگر ز من گله است
که خرامت خلاف قافله است
می رویم از پئی قتیل همه
ساخته مرد را دلیل همه
تو ازین حلقه چون بدر زدهٔ
گام بر جادهٔ دگر زدهٔ

ای تماشائیان ژرف نگاه
هان بگوئید حبة لله
که چسان از حزین به پیچم سر
آن بجادو دمی بدهر سمر
دل دهد[1] کز اسیر برگردم ؟
زان نو آئین صفیر برگردم
دامن از کف کنم چگونه رها
طالب و عرفی و نظیری را
خاصه روح و روان معنی را
آن ظهوری جهان معنی را
آنکه از سرفرازی قلمش
آسمان ساست پرچم علمش
طرز اندیشه آفریدهٔ اوست
درتن لفظ جان دمیدهٔ اوست
پشت معنی قوی ز پهلویش
خامه را فربهی ز بازویش
طرز تحریر را نوی از وی
صفحه ارتنگ مانوی از وی
فتنهٔ گفتگوی اینانم
مست لای سبوی اینانم
آن که طے کرده این مواقف را
چه شناسد قتیل و واقف را

---

۱ - یعنی آیا دل اجازت می‌دهد که از اسیر برگردم - یه اهل زبان کا محاوره هے کہ دل "دهد" بجائے "دل دستوری دهد" کے بولتے هیں ۱۲ -

لیک با ین همه که این دارم
گنج معنی در آستین دارم
دل و جانم فدای احبابست
شوق وقف رضای احبابست
می شوم خویش را به صلح دلیل
می سرایم نوای مدح قتیل
تا نه ماند ز من دگر گلهٔ
رسد از پیروان وی صله
گفتن آئین هوشیاری نیست
لیک دانستن اختیاری نیست
گرچه ایرانیش نخواهم گفت
سعدئی ثانیش نه خواهم گفت
لیک از من هزار بار به است
از من و همچو من هزار به است
من کف خاک ، او سپهر بلند
خاک را کی رسد به چرخ کمند
وصف او حد چون منی نه بود
مهر درخورد روزنی نبود
مرحبا ساز خوش بیانئی او
حبذا شور نکته دانی او
نظمش آب حیات را ماند
در روانی فرات را ماند
نثر او نقش بال طاؤس ست
انتخاب صراح و قاموس ست
پادشاهی که در قلمرو حرف
کرده ایجاد نکته هائی شگرف

خامہ ہندوی پارسی‌دانش
ہندیان سر بخط فرمانش
این رقم ہا کہ ریخت کلک خیال
بود سطری ز نامۂ اعمال
از من نارسای ہیچ مداں
معذرت نامہ ایست زی یاران
بو کہ آید ز عذر خواہی ما
رحم برما و بی گناہئی ما
آشتی نامۂ و داد پیام
ختم شد والسلام والاکرام

قیام لکھنو

جب مرزا نے دلی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا اُس وقت راہ میں ٹھہرنے کا قصد نہ تھا، مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں، اس لیے کان پور پہنچ کر اُن کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلئے۔ اُس زمانے میں نصیرالدین حیدر[1]

۱۔ یہ غلط ہے کہ مرزا غالب، نصیرالدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ پہنچے۔ مرزا غالب نہ صرف لکھنؤ سے، بلکہ باندہ سے بھی نکل چکے تھے کہ انھیں نواب احمد بخش خان والئی فیروز پور جھرکہ کے انتقال کی خبر ملی۔ نواب احمد بخش خان کا انتقال ا کتوبر ۱۸۲۷ء میں ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ا کتوبر ۱۸۲۷ء سے بہت پہلے مرزا لکھنؤ سے گزر گیے تھے۔

غازی الدین حیدر کا انتقال ۱۹-ا کتوبر ۱۸۲۷ء کو ہوا۔ اس کے بعد نصیر الدین حیدر بادشاہ بنے، لیکن ۱۹- ا کتوبر ۱۸۲۷ء سے بہت پہلے مرزا غالب لکھنؤ سے گزر گیے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت مرزا غالب لکھنؤ پہنچے ہیں تو نصیر الدین حیدر کا نہیں، بلکہ غازی الدین حیدر کا دور تھا۔ داؤدی

فرماں روا اور روشن الدولہ نائب السلطنت[1] تھے ۔ اہل لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بعنوان شائستہ اُن کی تقریب کی گئی ۔ مرزا سے اُس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہیں ہوسکا، مگر ایک مدحیہ نثر صنعت تعطیل[2] میں، جو اُن کے مسودات میں

---

۱ - یہ بھی غلط ہے کہ اُس زمانے میں روشن الدولہ نائب السلطنت تھے ۔ روشن الدولہ نومبر ۱۸۳۲ء میں نائب السلطنت ہوئے ۔ اُس وقت مرزا غالب کو کلکتے سے واپس آئے ہوئے بھی دو سال سے زیادہ زمانہ گزر چکا تھا ۔ مرزا غالب جس زمانے میں لکھنؤ گیے ہیں وہ معتمدالدولہ آغا میر کا عہد تھا ۔ کلیات نثر غالب میں معتمدالدولہ آغا میر کا متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے ۔ مرزا نے معتمدالدولہ آغا میر ہی کے لیے وہ نثر صنعت تعطیل لکھی تھی جو ان کے کلیات نثر میں موجود ہے (صفحہ ۶۵) مرزا نے رائے چھجمل کو معتمدالدولہ آغا میر کے متعلق بہت تفصیلی خط لکھا تھا جو کلیات نثر میں موجود ہے ۔ معتمدالدولہ آغا میر کے بعد اعتمادالدولہ میر فضل علی نائب السلطنت ہوئے ۔ اعتماد الدولہ کے بعد منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خان نائب السلطنت بنائے گیے اور اُن کے بعد ۱۸۳۲ء کے آخر میں روشن الدولہ کا نمبر آتا ہے، اس لیے یہ بالکل غلط ہے کہ مرزا غالب کے ورود لکھنؤ کے وقت روشن الدولہ نائب السطنت تھے ۔ غالب کے لکھنؤ جانے کے تقریباً ۵ سال بعد روشن الدولہ کو نیابت میسر آئی تھی ۔ داؤدی

۲ - اس مدحیہ نثر (صنعت تعطیل) کے متعلق مولانا حالی کا خیال ہے کہ روشن الدولہ کے لیے لکھی گئی ۔ کاش مولانا حالی کلیات نثر غالب ہی کو اٹھا کر دیکھ لیتے تو انھیں اس نثر کی تفصیلات کا علم ہو جاتا ۔ مرزا غالب کلیات نثر غالب (طبع دوم مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۲۸۷ھ صفحہ ۱۵) میں خود بیان کرتے ہیں کہ لکھنؤ کے دوستوں نے رفتہ رفتہ میرا ذکر سید آغا میر کی بزم میں پہنچایا جو معتمد الدولہ کے خطاب سے مشرف تھے ۔ ذیل میں مرزا غالب کے اصل الفاظ پیش کرتا ہوں جو انھوں نے اس نثر کی تمہید کے طور پر لکھے ہیں :

"........رفتہ رفتہ ذکر خاکساری ہائی مرا بہ بزم آغا میر نامی

بقیہ صفحہ ۳۸ پر -

موجود ہے ، نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لیے لکھی تھی ، لیکن مرزا صاحب نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں اور دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے۔ اسی وجہ سے مرزا بغیر اس کے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور وہ نثر پیش کریں ، وہاں سے کلکتے کو روانہ ہو گئے ؛ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلکتے سے واپس آنے کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ دلی سے نصیرالدین حیدر کی شان میں لکھ کر ایک دوست کے توسط سے گزرانا تھا اور اس پر پانچ ہزار روپے بطور صلے کے ملنے کا حکم ہوا تھا ۔ شیخ امام بخش ناسخ نے مرزا کو لکھا کہ پانچ ہزار ملے تھے ؛ تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے اور دو ہزار متوسط کو دے کر کہا کہ اس میں سے جو مناسب سمجھو مرزا کو بھیج دو ۔ مرزا صاحب نے یہ سن کر پھر کچھ تحریک کی، مگر تین دن بعد یہ خبر پہنچی کہ نصیرالدین مر گئے۔ پھر واجد علی شاہ کے زمانے میں مرزا نے سلسلہ جنبانی کی اور پانچ سو روپے سالانہ ہمیشہ کے لیے وہاں سے مقرر ہو گئے ، لیکن صرف دو برس گزرے تھے کہ ریاست ضبط ہو گئی اور وہ دفتر

بقیہ صفحہ ۳۷ -

از سادات عامہ آن دیار کہ دران روزہا بہ آہنگ معتمدالدولگی بلند آوازہ بود و بہ ترخانی فرمان روائی آن کشور و مدار لمہامی آن سلطنت اشتہار داشت ، رسانیدند تا ازان جانب ایمانی کششی رفت .... جنون شوقم بہ پیدائی کنار نا پیدائی نثر انداخت و سواد عبارتی ہم در صنعت تعطیل روشن ساخت........"

کیا اتنی واضح شہادت کی موجودگی میں بھی مولانا حالی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مدحیہ نثر صنعت تعطیل میں نواب روشن الدولہ نائب السلطنت کے لیے لکھی گئی تھی ؟

داؤدی

گاؤ خورد ہو گیا ۔

لطیفہ

لکھنؤ کی ایک صحبت میں، جب کہ مرزا وہاں موجود تھے، ایک روز لکھنؤ اور دلی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقعے پر اہل دہلی 'اپنے تئیں' بولتے ہیں وہاں اہل لکھنؤ 'آپ کو' بولتے ہیں؛ آپ کی رائے میں فصیح 'آپ کو' ہے یا 'اپنے تئیں'؟ مرزا نے کہا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں، مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں تو سخت مشکل ہوگی ۔ مین تو اپنی نسبت کہوں گا اور آپ ممکن ہے کہ اپنی نسبت سمجھ جائیں ۔ سب حاضرین یہ لطیفہ سن کر پھڑک گئے۔ مرزا کا مطلب صرف اس قدر بیان کرنا تھا کہ 'آپ کو' مخاطب کے لیے تو بولا ہی جاتا ہے اگر متکلم کے لیے بھی اس کا استعمال ہوگا تو بعض موقع پر التباس واقع ہوگا ۔ اس مطلب کو انھوں نے اس لطیف پیرائے میں بیان کیا؛ مگر یہ فقط ایک لطیفہ اہل صحبت کے خوش کرنے کے لیے تھا، ورنہ اہل دہلی بھی اکثر بجائے 'اپنے تئیں' کے 'آپ کو' بولتے ہیں، اس میں کچھ اہل لکھنؤ کی خصوصیت نہیں ہے ۔

لطیفہ

زبان کے متعلق مرزا کا اسی قسم کا ایک اور لطیفہ مشہور ہے ۔ دلی میں رتھ کو بعض مؤنث اور بعض مذکر بولتے ہیں۔ کسی نے مرزا سے پوچھا کہ حضرت! رتھ مؤنث

ہے یا مذکر؟ آپ نے کہا ''بھیا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔''

ملازمت سرکاری سے انکار

''تذکرۂ آب حیات'' میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں، جب کہ دھلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا، مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ھند، جو آخر کو اضلاع شمال و مغرب میں لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے، مدرسین کے امتحان کے لیے دلی میں آئے اور چاھا کہ جس طرح سو روپے ماہ وار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے، اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے مرزا اور مومن خاں اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا۔ سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلایا گیا۔ مرزا پالکی میں سوار ہو کر صاحب سکرٹری کے ڈیرے پر پہنچے۔ صاحب کو اطلاع ھوئی، اُنھوں نے فوراً بلا لیا، مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکرٹری اُن کے لینے کو آئیں گے۔ جب بہت دیر ہو گئی اور صاحب کو معلوم ھوا کہ اس سبب سے نہیں آئے، وہ خود باھر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اُسی طرح استقبال کیا جائے گا، لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ھیں، اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔ مرزا صاحب نے کہا کہ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ھو، نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا ''ھم قاعدے سے مجبور ھیں'' مرزا صاحب نے کہا

مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے اور یہ کہہ کر چلے آئے۔

قید ہونے کا واقعہ

مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ اسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ[1] میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا۔ مرزا نے خود اس واقعے کو ایک فارسی خط میں مختصر طور پر بیان کیا ہے جس کا ترجمہ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں ''کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف؛ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں؛ باوجودے کہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے؛ میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودے کہ میرا

۱۔ یہ حادثہ ۱۸۴۷ء مطابق ۱۲۶۳ھ میں پیش آیا تھا۔ لالہ گھنشیام لال عاصی دہلوی، شاگرد شاہ نصیر دہلوی نے اس حادثے کے متعلق ایک قطعہ تاریخ نظم کیا تھا جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔ اس کے مادۂ تاریخ سے ۱۲۶۳ ہجری مطابق ۱۸۴۷ء برآمد ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ جناب مولانا غلام رسول مہر نے بھی اس حادثے کا سن ۱۲۶۴ ہجری ہی لکھا ہے (’غالب‘ از مہر، طبع چہارم، لاہور صفحہ ۱۷۸) اس سلسلے میں ایک معاصرانہ شہادت ’احسن الاخبار‘ بمبئی کی ہے۔ ۲۵ جون ۱۸۴۷ کے شمارے میں اس کی تفصیلات ان الفاظ میں قلم بند کی گئی ہیں:

''دہلی ۱۵۔ جمادی الثانی۔ مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار کر لیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے...........''
اس اخبار کی ۲۔ جولائی کی اشاعت میں مقدمے کا فیصلہ شائع ہوا۔ داؤدی.

دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اوراکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا - صدر میں اپیل کیا گیا، مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا - پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی - سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفریں کی اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا، یہاں تک کہ اس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی - اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا، جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں، مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے - میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں، اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں؛ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے؛ یہ بھی جانے دو، خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانۂ رحمۃ اللعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے - دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جان فرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں، سر بصحرا نکل جاؤں - یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جس کا میں آرزو مند ہوں -''

یہ واقعہ مرزا صاحب پر نہایت شاق گزرا تھا؛ اگرچہ

منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو اُن کے قید خانے میں گزرے اُن کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی ؛ وہ بالکل قید خانے میں اسی آرام سے رہے جیسے گھر پر رہتے تھے - کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسب دل خواہ گھر سے اُن کو پہنچتی تھیں - اُن کے دوست اُن سے ملنے جاتے تھے اور وہ صرف بہ طور نظربندوں کے جیل خانے کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے ، مگر چونکہ اُس وقت تک شہر کے شرفاء و اعیان کے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا، اس لیے وہ اس کو ایک بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے - چنانچہ جو ترکیب بند اُنھوں نے قید خانے میں لکھا تھا اُس میں کہتے ہیں :

راز دانا غم رسوائی جاوید بلاست
بہر آزار غم از قید فرنگم نہ بود
جور اعدا رود از دل بہ رهائی ، لیکن
طعن احباب کم از زخم خدنگم نبود

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے اُس زمانے میں مرزا کے ساتھ دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا - اپیل میں جو کچھ صرف ہوا وہ اپنے پاس سے صرف کیا اور تین مہینے تک برابر اُن کی غم خواری اور ہر طرح کی خبرگیری میں مصروف رہے ، چنانچہ اسی ترکیب بند میں نواب مرحوم کی نسبت کہتے ہیں :

خود چراخون‌خورم ازغم کہ بہ‌غم‌خواریٔ من
رحمت حق بہ لباس بشر آمد گوئی
خواجۂ هست درین شہر کہ از پرسش وی
پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی

مصطفیٰ خان کہ درین واقعہ غم خوار منست
گر بمیرم چہ غم از مرگ ، عزادار منست

لطیفہ

جب مرزا قید سے چھوٹ کر آئے تو میاں کالے[1] صاحب کے مکان میں آکر رہے تھے ۔ ایک روز میاں کے پاس بیٹھے تھے ، کسی نے آکر قید سے چھوٹنے کی مبارک باد دی ؛ مرزا نے کہا ''کون بھڑوا قید سے چھوٹتا ہے ؟ پہلے گورے کی قید میں تھا ، اب کالے کی قید میں ہوں ۔''

مرزا نے قید میں ایک فارسی ترکیب بند اپنے حسب حال لکھ کر دوستوں کو بھیجا تھا ۔ اس نظم میں کل سات بند اور ہر بند میں بارہ بارہ شعر ہیں ۔ مرزا کے عزیزوں اور دوستوں نے کلیات فارسی میں اس نظم کو چھپنے نہیں دیا تھا ، مگر مرزا صاحب نے مرنے سے کسی قدر پہلے اپنی جدید نظم کا ایک مجموعہ موسوم بہ سبد چین شائع کیا تھا ؛ اس میں اس ترکیب بند کو بھی شامل کر دیا تھا ، لیکن سبد چین کی زیادہ اشاعت نہیں ہوئی ، اس لیے یہ ترکیب بند بہت کم لوگوں کی نظر سے گزرا ہے ۔ چونکہ یہ ترکیب بند مرزا کی عمدہ ترین حالیہ نظموں میں سے ہے اس واسطے اس کے مختلف بندوں میں سے کچھ کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

---

۱ - حضرت محمد نصیرالدین عرف میاں کالے صاحب، بہادر شاہ مرحوم کے شیخ اور مولانا فخر الدین قدس سرہ کے پوتے تھے ۔ مرزا مدت تک ان کے مکان میں رہے تھے ۔ وہ مرزا سے نہایت محبت رکھتے تھے اور انھیں کی تقریب سے قلعے میں تعلق پیدا ہوا تھا ۔ ۱۲

از بند اول

خواهم از بند به زندان سخن آغاز کنم
غم دل پرده دری کرد ، فغان ساز کنم
به نوائی که ز مضراب چکاند خون ناب
خویشتن را به سخن زمزمه پرداز کنم
چون سرایم سخن انصاف ز مجرم خواهم
چون نویسم غزل اندیشه ز غماز کنم
یار دیرینه! قدم رنجه مفرما کا ین جا
آن نه گنجد که تو در کوی و من باز کنم
اهل زندان به سرو چشم خودم جا دادند
تابدین صدر نشینی چه قدر ناز کنم
هله دزدان گرفتار ! وفا نیست به شهر
خویشتن را به شما هم دم و هم راز کنم

از بند سوم

پاسبانان بهم آئید که من می آیم
در زندان بکشائید که من می آیم
هر که دیدی به در خویش سپاسم گفتی
خیر مقدم بسرائید که من می آیم
جاده نه شناسم و ز انبوه شما می ترسم
راهم از دور نمائید که من می آیم
رهرو جادهٔ تسلیم درشتی نه کند
سخت گیرنده چرائید که من می آیم
هان عزیزان که درین کلبه اقامت دارید
بخت خود را بستائید که من می آیم

تا به دروازهٔ زندان پئی آوردن من
قدمی رنجه نمائید که من می آیم
چون سخن سنجی وفرزانگی آئین من ست
بهره از من بربائید که من می آیم

از بند چهارم

آنچه فرداست هم امروز درآمد گوئی
آفتاب از جهت قبله برآمد گوئی
دل و دستی که مرا بود فروماند ز کار
شب و روزی که مرا بود سر آمد گوئی
بهرهٔ اهل جهان چون زجهان درد و غمست
بهرهٔ من ز جهان بیشتر آمد گوئی
خستن و بستن من حد عسس نیست ، برو
برمن این‌ها ز قضا و قدر آمد گوئی
هنرم را نتوان کرد به خستن ضائع
خستگی غازهٔ روئی هنر آمد گوئی
چرخ یک مرد گرانمایه به زندان خواهد
یوسف از قید زلیخا بدر آمد گوئی

از بند هفتم

هم دمان ! در دلم از دیده نهانید همه
غالب غم زده را روح و روانید همه
للّه‌الحمد که در عیش و نشاطید همه
للّه‌الشکر که با شوکت و شانید همه
من به خون خفته و بینم همه بینید همه
من جگر خسته و دانم همه دانید همه

درمیان ضابطۂ مہر و وفای بودست
من برینم که هر آئینه برانید همه
روزی از مہر نگفتید فلانی چون ست
باری از لطف بگوئید چسانید همه
چاره گر نتوان کرد دعائی کافیست
دل اگر نیست خداوند زبانید همه
هفت بندست که در بند رقم ساخته ام
بنو یسید و به بینید و بخوانید همه
آن نه باشم که به هر بزم زمن یاد آرید
دارم امید که در بزم سخن یاد آرید

قلعے کا تعلق

۱۲۶۶ھ میں مرحوم ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ ، دبیرالملک ، نظام جنگ اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر، یعنی جیغہ و سر پیچ و حمائل مروارید کے دربار عام میں مرحمت فرمایا اور خاندان تیمور کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بہ مشاہرہ پچاس روپے ماہوار کے مامور کیا اور قرار پایا کہ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں مرحوم مختلف تاریخوں سے مضامین التقاط کرکے مرزا کے حوالے کیا کریں اور مرزا ان تمام مطالب کو اپنی طرز خاص کی فارسی نثر میں بیان کریں اور کتاب دو حصوں پر تقسیم کی جائے ؛ پہلے حصے میں کچھ مختصر حال ابتدائے آفرینش سے صاحب قران تیمور گورگان تک اور کسی قدر مفصل حالات تیمور سے نصیرالدین ہمایوں کے اخیر زمانے تک بیان کیے جائیں اور دوسرے حصے میں جلال الدین اکبر باشاہ سے لے کر سراج الدین بہادر شاہ کے

زمانے تک کے تمام واقعات شرح و بسط کے ساتھ درج کیے جائیں - مرزا نے تمام کتاب کا نام پرتوستان اور اُس کے پہلے حصے کا نام مہر نیم روز اور دوسرے حصے کا نام ماہ نیم ماہ تجویز کیا تھا - اُن کو اپنی دو ترکیبوں پر ناز تھا ؛ ایک ماہ نیم ماہ اور دوسرے رستخیز[1] بے جا - مرزا کہتے تھے کہ چودھویں رات کے چاند کو ماہ چہاردہ اور ماہ دوھفتہ تو پہلے لوگوں نے اکثر باندھا ھے ؛ مگر جہاں تک مجھے معلوم ھے ماہ نیم ماہ کسی نے نہیں باندھا - یہ ترکیب خاص میری تراشی ہوئی ھے ، مگر افسوس ھے کہ دوسرا حصہ ، یعنی ماہ نیم ماہ بالکل نہیں لکھا گیا - مہر نیم روز ختم ہونے کے بعد مرزا نے ذرا آرام لینے کے لیے چند روز توقف کیا تھا اور ارادہ تھا کہ جلد دوسرا حصہ شروع کریں کہ اتنے میں غدر ہوگیا[2] اور اُس حصے کا صرف نام ھی نام رہ گیا -

---

۱ - رستخیز بے جا - غدر کی تاریخ کا مادہ ھے - اس میں رستخیز کے اعداد ، یعنی ۱۲۷۷ میں سے جا کے عدد ، یعنی ۴ کا تخرجہ کیا ھے ۱۲ -

۲ - مولانا حالی کی اس تحریر سے یہ اندازہ ھوتا ھے کہ ۱۰ - مئی ۱۸۵۷ء (غدر) سے چند روز قبل مہر نیم روز مکمل ھوئی تھی، حالانکہ یہ غلط ھے - مہر نیم روز اگست ۱۸۵۴ء میں مکمل ھوچکی تھی - ستمبر ۱۸۵۴ء میں عید قربان کے موقع پر مرزا غالب نے بہادر شاہ کے دربار میں بجائے قصیدے کے مہر نیم روز کی ایک جلد پیش کی تھی - نادرات غالب مرتبہ آفاق دھلوی (صفحہ ۶۳) میں منشی نبی بخش حقیر کے نام ایک خط ھے جو اس معاملے پر اچھی خاصی روشنی ڈالتا ھے - اس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے : ”میں نے اب کے عید کو قصیدہ نہیں لکھا ، ایک جلد اس تاریخ کا تمام کردہ نذر کیا - اس کا حال سنئے کہ وہ صورت جو پہلے تھی وہ نہیں رھی - آگے آغاز تیمور کے حال سے تھا ، اب شروع

بقیہ صفحہ ۴۹ پر

حیدر آباد سے ایک صاحب نے مرزا سے ماہ نیم ماہ کو طلب کیا تھا، اُس کے جواب میں لکھتے ھیں : ''ماہ نیم ماہ''

بقیہ از صفحہ ۳۸

تحریر آفرینش عالم و ظہور آدم سے ہے۔ میں نے کتاب کا نام پرتوستاں رکھا اور دو مجلد پر منقسم کیا ۔ پہلا مجلد ابتدائے عالم سے حضرت نصیر الدین ہمایوں تک ، اس کا نام 'مہر نیم روز' رکھا ۔ دوسرا مجلد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والئی عصر تک، اس کا نام ماہ نیم ماہ - سو وہ مہر نیم روز تمام ہوا اور نذر حضور کیا ۔ اب اگر زیست وفا کرے گی تو ماہ نیم ماہ لکھا جائے گا ۔ توقیع خوشنودی مجھ کو مل گیا ، یعنی شقہ مشتمل تحسین و اظہار عنایت پر ۔ اس کو خلعت فاخرہ اور جاگیر تصور کرتا ہوں ۔''

'مہر نیم روز' حسب الحکم مرزا فخرو ولی عہد بہادر شاہ ثانی مطبع فخرالمطابع دہلی سے ۱۲۷۱ ھجری مطابق ۱۸۵۴ء میں شائع بھی ہو گئی تھی ۔ تمام کتاب کل ۱۱۶ صفحات کی ھے اور اُس زمانے میں اس کی قیمت ایک روپیہ تھی ۔

مہر نیم روز کے متعلق یہ تفصیلات ذھن میں محفوظ رکھتے ہوئے مولانا حالی کے بیان کا جائزہ لیجئے اور اس کا فیصلہ کیجئے کہ مہر نیم روز کی تکمیل اور غدر کے درمیان 'چند روز' کا فاصلہ کس طرح قرار پاتا ھے ۔ تقریباً تین سال کے زمانے کو 'چند روز' سے تعبیر کرنا سیر و سوانح کی کتابوں میں کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا ۔

بات دراصل یہ ھے کہ مولانا حالی نے یہ بات 'آبحیات' سے بلا سمجھے بوجھے لے لی ھے۔ اگر وہ اپنے ماخذ کا ذکر کر دیتے تو اس کی ذمہ داری آبحیات کی طرف منتقل ھو جاتی ، لیکن مولانا حالی نے ایسا نہیں کیا ۔ آبحیات کی عبارت یہ ھے: ''ارادہ تھا کہ اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کا حال دوسری جلد میں لکھیں اور ماہ نیم ماہ نام رکھیں کہ غدر ہو گیا ۔''

(آبحیات ، ناشر شیخ مبارک علی ، لاھور بار دوازدھم صفحہ ۵۲۱)
مولانا حالی نے 'چند روز' والی مضحکہ خیز بات اپنی طرف سے شامل کر دی ۔ داؤدی

اسمیست که مسمیٰ نه دارد۔ چون از سر نوشت گردن نتوان پیچید ، سر گزشت باز گویم ۔ هرگاه یک نیمه از پرتوستان انجام یافت و سهر نیم روز نام یافت ، لختی درنگ ورزیده شد تانفس راست کرده آید۔ ناگه کار فرما را روز فرو رفت ، و روزگار سر آمد ، ودولت دیزینۂ ترکمانان قراچاریه سپری گشت ؛ ماه نیم ماه همچون ماه بست و هشت شبۂ ناپدیدار ، ونامش بعنوان بے نشانی در سهر نیم روز آشکار ماند۔''

خدمت اصلاح اشعار بادشاه

۱۲۷۱ھ میں جب که شیخ ابراهیم ذوق کا انتقال هوگیا ، بادشاه کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق هو گئی تھی ، مگر معلوم هوتا هے که مرزا اس کام کو بادل ناخواسته سرانجام کرتے تھے۔ ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے که ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوان عام میں بیٹھے تھے که چوب‌دار آیا اور کہا که حضور نے غزلیں مانگی هیں ۔ مرزا نے کہا ذرا ٹھهر جاؤ ، اور اپنے آدمی سے کہا که پالکی میں کچھ کاغذ رومال میں بندھے هوئے رکھے هیں ، وه لے آؤ ۔ وه فوراً لے آیا ۔ مرزا نے جو اسے کھولا تو اس میں سے آٹھ نو پرچے ، جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے هوئے تھے ، نکالے اور اسی وقت دوات قلم منگوا کر ان مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں اور وهیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھ کر چوب دار کے حوالے کیں ۔ ناظر مرحوم کہتے تھے که ان تمام غزلوں کے لکھنے میں ان کو اس سے زیاده دیر نہیں لگی که ایک مشاق استاد چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح

دے کر درست کر دے۔ جب چوب دار غزلیں لے کر چلا گیا تو مجھ سے کہا کہ حضور کی کبھی کبھی کی فرمائشوں سے آج مدت کے بعد سبک دوشی ہوئی ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب جو کچھ اپنی طرز خاص میں لکھتے تھے، نظم ہو یا نثر، اس کو بڑی کاوش اور جاں کاہی سے سر انجام کرتے تھے؛ چنانچہ خود اُنھوں نے جابجا اس کی تصریح کی ہے؛ مگر جب کبھی اپنی خاص روش پر چلنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی اُس وقت اُن کو فکر پر زیادہ زور ڈالنا نہیں پڑتا تھا۔

بدیہہ گوئی

۱۸۷۱ء میں جب کہ نواب ضیاءالدین احمد خاں مرحوم کلکتے گئے ہوئے تھے، مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتے کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے، نواب صاحب سے بیان کیا کہ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے، ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا، شعرا کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا ''فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے۔،، اس پر بات بڑھی۔ اُس نے کہا کہ فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا، اُس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اُسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا۔ مرزا بولے ''اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو ہر موقع پر بداھۃً کہہ سکتے ہیں۔،، مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اُسی وقت موزوں کرکے پڑھ دیا جو اُن

کے دیوان ریختہ میں موجود ہے اور جس کا پہلا شعر یہ ہے:

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے

اولاد

مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے درپے ہوئے، مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔ اس لیے ایک مدت سے وہ اور ان کی بی‌بی تنہا زندگی بسر کرتے تھے، مگر غدر سے چند سال پہلے جب کہ اُن کی بی‌بی کے بھانجے زین‌العابدین خاں عارف کا انتقال ہو گیا اور اُن کے دونوں بچے ایک باقر علی خاں اور دوسرے حسین علی خاں صغیر سن رہ گئے تو مرزا اور اُن کی بی‌بی نے چھوٹے لڑکے حسین علی خاں کو جو اس وقت بہت کم عمر تھا، اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ مرزا، حسین علی خاں کو حقیقی اولاد سے بھی کچھ بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے اور حد سے زیادہ نازبرداری کرتے تھے۔

جب زین‌العابدین خاں کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو حسین علی‌خان کے بڑے بھائی باقر علی‌خاں کو بھی مرزا نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یہ دونوں خوش فکر اور اہل اور نیک خو اور نہایت شریف مزاج تھے، مگر افسوس ہے کہ مرزا کی وفات کے بعد دونوں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے جوان عمر میں فوت ہو گئے۔

عارف کا مرثیہ

زین‌العابدین خاں عارف سے مرزا کو غایت درجے کا تعلق تھا۔ کچھ تو قرابت کے سبب اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہ نہایت خوش فکر اور معنی یاب طبیعت رکھتے تھے

اور باوجود پُرگوئی کے نہایت خوش گو تھے، اُن کو حد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، اسی لیے جب وہ جوان عمر میں فوت ہو گئے تو مرزا اور اُن کی بی‌بی پر سخت حادثہ گزرا۔ مرزا نے اُن کے مرنے پر ایک غزل بطور نوحے کے لکھی ہے جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے۔ چنانچہ اُس کے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں :

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو ''قیامت کو ملیں گے''
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلک پیر، جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شب چاردھم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک‌الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

حالات غدر و کتاب دستنبو

غدر کے زمانے میں مرزا دلی سے، بلکہ گھر سے بھی باہر نہیں نکلے۔ جوہیں بغاوت کا فتنہ اٹھا انھوں نے گھر کا دروازہ بند کرلیا اور گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کئے۔ اگرچہ فتح دھلی کے بعد مہاراجا پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمود خاں مرحوم اور اُن کے ہمسایوں کے مکان پر، جس میں ایک مرزا بھی تھے، حفاظت کے لیے پہرہ بیٹھ گیا تھا، اس لیے وہ فتح مند سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہے، مگر پھر بھی اُن کو طرح طرح کی کلفتیں اُٹھانی پڑیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو تیس برس کی عمر میں دیوانے ہوگئے تھے اور اخیر دم تک اسی حالت میں رہے، جب مرزا نے دلی میں سکونت اختیار کی تو اُن کو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آئے تھے۔ مرزا کے مکان سے اُن کا مکان تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر تھا۔ ایک دربان اور ایک کنیز کہ دونوں عمر رسیدہ تھے، اُن کے پاس رہتے تھے۔ جب دلی فتح ہوگئی اور شہر اھل دھلی سے خالی ہوگیا اور رستے بند ہوئے، اُس وقت مرزا بھائی کی طرف سے سخت پریشان رہنے لگے۔ بھائی کے کھانے پینے پہنے، سونے مرنے اور جینے کی مطلق خبر نہ تھی۔ ایک روز یہ خبر آئی کہ مرزا یوسف کے مکان میں بھی کچھ سپاھی گھس آئے تھے اورجو کچھ اسباب ملا، لے گئے۔ پھر ایک دن وھی بڈھا دربان جو مرزا یوسف کی ڈیوڑھی پر رھتا تھا، یہ خبر لایا کہ پانچ روز سخت تپ میں مبتلا رہ کر آج آدھی رات گزرے مرزا یوسف کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت نہ کفن کے لیے کپڑا بازار میں مل سکتا تھا، نہ غسال اور گورکن

کا کہیں پتا تھا، نہ شہر سے قبرستان تک جانا ممکن تھا، مگر مرزا کے ہمسائے نے اُن کی بڑی مدد کی۔ پٹیالے کی فوج کے ایک سپاہی کو جو حفاظت کے لیے تعینات تھا ، اور مرزا کے دو آدمیوں کو ساتھ لیا اور مرزا صاحب کے ہاں سے دو سفید چادریں لے کر مرزا یوسف کے مکان پر پہنچے اور بعد غسل اور تجہیز و تکفین کے مسجد کے صحن میں جو مکان کے قریب تھی، دفن کر دیا۔ مرزا نے دستنبو میں اس مقام پر یہ اشعار لکھے ہیں :

دریغ آن کہ اندر درنگ سہ بیست[1]
سہ دہ شاد و سی سال ناشاد زیست
تہ خاک بالین زخشتش نہ بود
بجز خاک در سر نوشتش نہ بود
خدایا برین مردہ بخشائشی
کہ نادیدہ در زیست آسائشی
سروشی بدل جوئی او فرست
روانش بجاوید مینو فرست

اور بھائی کے مرنے کی تاریخ اس طرح لکھی ہے :

ز سال مرگ ستم‌دیدہ میرزا یوسف
کہ زیستی بجہاں در ز خویش بیگانہ
یکی در انجمن از من ہمی پژوہش کرد
کشیدم آہی و گفتم دریغ دیوانہ!

اس میں لفظ ’آہی‘ کا تخرجہ دریغ دیوانہ ، میں سے کیا ہے۔

---

۱ - سہ بیست، یعنی ساٹھ (۶۰) - دوسرے مصرعے میں سہ دہ سے مراد تیس ہے۔

ایک روز کچھ گورے مرزا کے مکان میں بھی گھس آئے تھے۔ راجا کے سپاہیوں نے ہر چند روکا، مگر اُنھوں نے کچھ التفات نہیں کیا ۔ مرزا ''دستنبو،، میں لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنی نیک خوئی سے گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھیڑا، مگر مجھے اور دونوں بچوں کو اور تین نوکروں کو مع چند ہمسایوں کے کرنل بروِن کے روبرو، جو میرے مکان کے قریب حاجی قطب‌الدین سوداگر کے گھر میں مقیم تھے، لے گئے۔ کرنل برون نے بہت نرمی اور انسانیت سے ہمارا حال پوچھا اور ہم کو رخصت کر دیا۔

سنا ہے کہ جب مرزا کرنل برون کے رو برو گئے تو اُس وقت کلاہ پپاخ اُن کے سر پر تھی ۔ اُنھوں نے مرزا کی نئی وضع دیکھ کر پوچھا کہ ''ول تم مسلمان؟،، مرزا نے کہا ''آدھا،، کرنیل نے کہا ''اس کا کیا مطلب؟،، مرزا نے کہا ''شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا،، کرنیل یہ سن کر ہنسنے لگا ۔ پھر مرزا نے وزیر ہند کی چٹھی جو ملکۂ معظمہ کے مدحیہ قصیدے کی رسید اور جواب میں آئی تھی، دکھائی ۔ کرنیل نے کہا ''تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر کیوں نہ حاضر ہوئے؟،، مرزا نے کہا ''میں چار کہاروں کا افسر تھا، وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے؛ میں کیوں کر حاضر ہوتا؟،، کرنیل نے نہایت مہربانی سے مرزا اور اُن کے تمام ساتھیوں کو رخصت کر دیا[۱]۔

۱۔ مولانا حالی نے 'دستنبو' کی عبارت کو اساس بنا کر یہ واقعات تحریر فرمائے ہیں؛ اس سلسلے میں 'دستنبو' کی اصل عبارت پیش کرتا ہوں :-

''پنجم اکتوبر روز اندوہ اندوز دوشنبہ چاشتگاهان ناگاهان

(بقیہ صفحہ ۵۷ پر)

اس مقام پر مرزا اپنی کتاب دستنبو میں لکھتے ہیں

بقیہ از صفحہ ۵۶
گوۂ چند از راہ دیواری که بدروازۂ سنگ بست پیوسته است فراز بامی برآمده از آن جا بجستن در کوچه فرود آمدند وچوں دور باش سپاهیان راجا نرندر سنگ بهادر سود مند نیفتاد از دیگر خانه هائی کوچک چشم پوشیده جائی که نامه نگار بود، آمدند - از روئی خوبی خوئے خویش از همه کالا دست برداشتند و مرا با آن دو کودک فرخ دیدار و دو سه نمک خوار و تنی چند از همسائگان نکو کردار - ع

گرفتند و بردند و بگزاشتند

از کوچه دور تر از دو پرتاب و آنهم برنج و آهنج و تب و تاب نرفته‌ام پیش اندازه دان و دانشور کرنیل برون بهادر که ایں سوئی چار سوی بکاشانه قطب‌الدین سوداگر فرود آمده است بردند - با من بزمی و مردی سخن گفت و از من نام و از دیگراں پیشه پر سید و بخوشنودیٔ همدراں روزی سوئی آرامش جا پدرود کرد - یزداں را سپاس گزاردم و براں خجسته جو آفریں خواندم و باز آمدم -" (اقتباس از 'دستنبو' مشموله کلیات نثر غالب مطبع نولکشور ۱۲۸۷ھ صفحہ ۳۹۶) ۵- اکتوبر کی تمام روداد یہ ہے جسے میں نے اوپر نقل کر دیا ہے - اس کے بعد ۷- اکتوبر کی کیفیت مرقوم ہے-

اسی واقعے کے متعلق مرزا غالب کی ایک تحریر اور ملتی ہے جو 'انتخاب غالب' میں موجود ہے - مرزا غالب نے دو ابواب پر مشتمل یہ کتاب میکلوڈ صاحب فنانشل کمشنر پنجاب کی فرمائش پر ترتیب دی تھی - محمد عبدالرزاق صاحب نے ۱۳۴۵ھ میں اسے شائع کر دیا تھا (اس کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کے پاس بھی محفوظ ہے) لیکن مولانا غلام رسول مہر اسے 'خطوط غالب' کے خاتمے پر غیر مطبوعہ ہی لکھتے ہیں - بہر حال 'انتخاب غالب' میں صفحہ ۱۴ سے ۴۳ تک مرقومۃالذیل عبارت موجود ہے :-

"غدر کے دنوں میں میں نہ شہر سے نکلا ، نہ پکڑا گیا ، نہ میری روبکاری ہوئی - جس مکان میں رہتا تھا وہیں بد ستور بیٹھا رہا - بلی ماروں کے محلے میں میرا گھر تھا - ناگاہ ایک دن آٹھ سات گورے دیوار پر چڑھ کے اس خاص کوچے میں آتر آئے جہاں میں رہتا تھا - اس کوچے میں بہ ہمہ جہت ۵۰ یا ۶۰ آدمی کی بستی ہو گی - سب کو گھیر لیا اور ساتھ لے چلے - راہ میں سارجن بھی آملا - اس نے مجھ سے صاحب سلامت کے بعد پوچھا کہ تم مسلمان ہو؟ میں نے کہا "آدھا مسلمان

''کہ سچ بات کا چھپانا آزادوں کا کام نہیں ہے - میں

بقیہ از صفحہ ۵۷

ہوں'' اُس نے کہا ''ول صاحب ! آدھا مسلمان کیسا ؟'' میں نے کہا ''شراب پیتا ہوں ، ہیم ہوک نہیں کھاتا -'' غرض کہ وہ مجھے کرنل برون کے پاس لے گیا - وہ چاندنی چوک میں حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں اُترے ہوئے تھے ؛ باہر نکل آئے اور میرا صرف نام پوچھا - اوروں سے نام بھی پوچھا اور پیشہ بھی پوچھا - نام میرا سن کر فرمایا کہ اسد اللہ خان بڑے تعجب کی بات ہے کہ باوُٹے پر نہ آئے - میں نے کہا آپ سنیں تو کہوں؟ کہا ''ہاں کہو'' میں نے کہا تلنگے دروازے سے باہر آدمی کو نکلنے نہیں دیتے تھے ، میں کیوں کر آتا ؟ اگر کچھ فریب کر کے ، کوئی بات بنا کے نکل جاتا، جب باوُٹے کے قریب گولی کی زد میں پہنچتا پہرے والا مجھے گولی مار دیتا - یہ بھی مانا کہ تلنگے باہر جانے دیتے ، گورے گولی نہ مارتے ؛ میری صورت کو دیکھیے اور میرا حال معلوم کیجیے - بوڑھا ہوں ، ہاتھ پاؤں سے اپاھج ، کانوں سے بہرہ ؛ نہ لڑائی کے لائق ، نہ مشورت کے قابل — دعا کرتا ، سو یہاں بھی دعا کرتا رہا - کرنل صاحب ھنسے اور فرمایا اچھا تم اپنے گھر جاؤ ، باقی اھل محلہ سے غرض نہ رکھو - میں خدا کا شکر بجا لایا اور کرنل برون صاحب کو دعا دیتا ہوا اپنے گھر آیا -''

اس واقعے کے متعلق غالب کی یہی دو تحریریں ھیں - نہ معلوم مولانا حالی نے کس شہادت کی بنا پر اپنی عبارت قلم بند فرمائی ہے- قاضی عبدالودود صاحب نے (معاصر ، حصہ ۴ ، صفحہ ۳) لکھا ہے: ''یہ بالکل واضح ہے کہ حالی نے جس راوی پر بھروسا کیا تھا وہ ھرگز قابل اعتماد نہ تھا -''

اس سلسلے میں ایک بات اور واضح کر دی جائے؛ مرزا غالب نے ھرجگہ 'کرنل برون' لکھا ہے- یہ در اصل 'کرنل برن' (Col. Burn) ھے کرنل برن ۲۱- ستمبر ۱۸۵۷ء کو دھلی کے فوجی گونر مقرر کیے گیے تھے اور یہ ۵- اکتوبر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے- تعجب ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب نے (معاصر پٹنہ ، حصہ ۴ ، صفحہ ۱) 'دستنبو' کی عبارت اپنے الفاظ میں پیش کرتے وقت بجائے ۵- اکتوبر کے ۲۵- اکتوبر لکھ دیا ہے- داؤدی

آدھا مسلمان کہ جس طرح قید کیش و ملت سے آزاد ہوں، اسی طرح بدنامی اور رسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں۔ میری مدت سے یہ عادت تھی کہ رات کو فرنج[۱] کے سوا کچھ کھاتا پیتا نہ تھا اور اگر وہ نہ ملتی تھی تو مجھ کو نیند نہ آتی تھی۔ اگر جواں مرد، خدا دوست، خدا شناس اور دریا دل مہیش داس ہندوستانی شراب جو رنگ میں فرنج سے مشابہ اور بو میں اس سے بہتر تھی، مجھے نہ بھیجتا تو میں ہرگز جان بر نہ ہوتا''۔ اس کے بعد یہ رباعی لکھی ہے:

رباعی

از دیر دلم دایہ ز ہر در می جست
از بادۂ ناب یک دو ساغر می جست
فرزانہ مہیش داس بخشید بہ من
آبی کہ برائی خود سکندر می جست

چونکہ اس وقت مسلمانوں سے شہر خالی ہو گیا تھا، مرزا کے ہندو دوستوں کے سوا جو ان کے پاس برابر آتے رہتے تھے اور ہر طرح سے ان کی غم خواری کرتے تھے، کوئی ان کا غم خوار نہیں رہا تھا۔ مرزا کی معاش کے صرف دو ذریعے تھے؛ سرکاری پنشن اور قلعے کی تنخواہ، سو یہ دونوں ذریعے مسدود ہو گئے تھے۔ شہر کے تمام مسلمان عمائد جو مرزا کے دوست اور عزیز تھے، اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے۔ اس کے سوا گھر میں جس قدر بی بی کے پاس

۱- فرنج، وہ چیز جو فرانس سے منسوب ہو اور یہاں اس سے فرانس کی شراب مراد ہے ۱۲-

زیور یا کوئی اور قیمتی چیز تھی ، جب شہر لٹنے لگا تو وہ دوسری جگہ گاڑنے دابنے کے لیے بھیج دیا ، جہاں سے فتح مند سپاہ نے کھود کر سب نکال لیا ۔ مگر مرزا نے اس تنگی اور عسرت کی حالت میں بھی اپنے متعدد نوکروں میں سے کسی کو جواب نہیں دیا اور جو حالت اُن پر اور اُن کے متعلقین پر خوش و ناخوش گزری اُس میں نوکر بھی برابر شریک رہے ۔ نوکروں کے علاوہ جن لوگوں کے ساتھ مرزا امن کے زمانے میں ہمیشہ سلوک کرتے تھے، وہ اس حالت میں بھی مرزا کو ستاتے تھے اور چار نا چار اُن کی بھی مرزا کو خبر لینی پڑتی تھی ۔ مرزا لکھتے ہیں کہ ''اس ناداری کے زمانے میں جس قدر کپڑا ، اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا ، سب بیچ بیچ کر کھا گیا ۔ گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا ۔'' اس کے بعد کتاب کو اس طرح ختم کرتے ہیں کہ ''اس بازیچۂ اطفال، یعنی کتاب دستنبو کے لکھنے میں کب تک خامہ فرسائی کی جائے! جو حالت کہ اس وقت در پیش ہے ، ظاہر ہے کہ اس کا انجام یا موت ہے یا بھیک مانگنا ۔ پہلی صورت میں یقیناً یہ داستان ناتمام رہنے والی ہے اور دوسری صورت میں نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ کسی دکان سے دھتکارے گئے اور کسی دروازے سے کوڑی پیسہ کچھ مل گیا ۔ پس اپنی ذلت و رسوائی کے سوا اب اُس میں لکھنے کو کچھ باقی نہیں رہا ۔ قدیم پنشن اگر مل بھی گئی تو بھی کام چلتا نظر نہیں آتا اور نہ ملی تو کام ہی تمام ہے ۔ مشکل یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چونکہ اس شہر کی آب و ہوا اب خستہ دلوں کو راس

آتی معلوم نہیں ہوتی ، ضرور شہر چھوڑنا اور کسی اور بستی میں جا کر بسرام کرنا پڑے گا ۔''

وظیفہ رام پور

غدر کے بعد دو برس تک مرزا کا یہی حال رہا ، مگر دو برس بعد نواب یوسف علی خاں مرحوم رئیس رام پور نے سو روپے ماہ وار ہمیشہ کے لیے مرزا کے واسطے مقرر کر دیا جو نواب کلب علی خاں نے بھی بہ دستور مرزا کے اخیر دم تک جاری رکھا اور غدر سے تین برس بعد جب مرزا ہر ایک الزام سے بری ثابت ہوئے ، سرکاری پنشن بھی جاری ہو گئی ۔

لطیفہ

جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور مرزا تعزیت کے لیے رام پور گئے ، چند روز بعد نواب کلب علی خاں مرحوم کا نواب لفٹننٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا ۔ اُن کی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے ؛ چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا ''خدا کے سپرد'' مرزا نے کہا ''حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے ، آپ پھر اُلٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں ۔''

قاطع برہان

جب مرزا دستنبو کو ختم کر چکے اور اب بھی تنہائی اور سناٹے کا وہی عالم رہا ، اُس وقت سوا اس کے اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس اور رفیق

سمجھیں اور کچھ لکھ پڑھ کر اپنا غم غلط کریں اور دل بہلائیں - مرزا کے پاس اُس وقت سوائے ''برھان قاطع'' اور ''دساتیر'' کے کوئی کتاب موجود نہ تھی - برھان کو اٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا - پہلی ھی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ھوئیں - پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی - ایک ایک لفظ متعدد فصلوں میں مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا - شعراء نے جو الفاظ بطور مجاز و کنایہ کے استعمال کیے ھیں، اُن کا ذکر بطور مستقل لغات کے دیکھا - طریقۂ بیان اکثر بھونڈا اور اصول لغت نگاری کے خلاف پایا- بہت سے لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی جس کے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئے - مرزا نے یادداشت کے طور پر جو مقام قابل اعتراض نظر آئے اُن کو ضبط کرنا شروع کیا - شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی جس کا نام قاطع برھان رکھا گیا اور ۱۲۷۶ھ[1] میں چھپ کر شائع ھو گئی - پھر مرزا نے ۱۲۷۷ھ[2] میں باضافۂ دیگر مضامین و فوائد اُس کو دوسری بار چھپوایا

---

۱ - قاطع برھان کے خاتمۃ الطبع میں تاریخ اختتام ۲۰- رمضان ۱۲۷۸ھ موجود ھے جو ۲۲- مارچ ۱۸۶۲ء کے مطابق ھے- قاطع برھان کے قطعات تاریخ سے بھی سن ۱۲۷۸ھ اور ۱۸۶۲ء برآمد ھوتے ھیں- مرزا غالب نے تتمہ غلط نامہ' قاطع برھان میں تاریخ 'پنجم اگست ۱۸۶۲ء' درج کی ھے - تعجب ھے کہ مولانا حالی نے ۱۲۷۸ھ کے بجائے ۱۲۷۶ھ کہاں سے لکھ دیا - بے شک قاطع برھان کا سال اتمام تصنیف ۱۲۷۶ھ ھے، لیکن سن اشاعت ۱۲۷۸ھ ھے -

۲ - درفش کاویانی صرف ایک دفعہ مطبع اکمل المطابع دھلی سے شائع ھوئی ھے - قطعات تاریخ انطباع کتاب سے ۱۲۸۲ھ اور ۱۸۶۵ء برآمد ھوتے ھیں- اتنی واضح شہادت کے باوجود مولانا حالی نے ۱۲۸۲ھ کے بجائے ۱۲۷۷ھ لکھ دیا ھے - داؤدی

اور اس کا نام ''درفش کاویانی'' رکھا -

یہاں دو چار مثالیں ان الفاظ کی دینی مناسب معلوم ہوتی ہیں جن پر مرزا نے صاحب برہان کا تخطیہ کیا ہے - مثلاً صاحب برہان نے ''عنبر ارزاں'' کے معنی گیسوئے رسول مقبول کے لکھے ہیں اور پھر کہتا ہے کہ اس کو عنبرلرزاں بھی کہتے ہیں - مرزا صاحب برہان کی غلطی کا منشا یہ بتاتے ہیں کہ اس نے نظامی کا یہ شعر دیکھا ہے جو لغت میں ہے :

بوئ کزان عنبر لرزان دھی
گر بد و عالم دھی ارزان دھی

پس عنبرلرزان میں استعارے کو اصلی لغت قرار دیا اور دوسرے مصرعے میں ارزان کے موقعے اور محل کو بالکل نہیں سمجھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی زلف عنبر بو جو دونوں جہان کے بدلے میں بھی ارزاں ہو اس کا نام عنبر ارزاں رکھ دیا - یا مثلاً برہان میں لکھا ہے : 'قافلہ شد' بمعنی قافلہ رفت ، یعنی قافلہ سالار رفت کہ کنایہ از فوت شدن پیغمبرباشد'' اول تو 'قافلہ شد' کو ایک لغت قرار دینا ہی بے معنی ہے، پھر اس کے معنی 'قافلہ سالار رفت' کہنا اور قافلہ سالار کے جانے سے وفات سرور کائنات مراد لینا غلط در غلط اور خبط در خبط ہے - مرزا غلطی کا منشا مولانا نظامی کے اس شعر کو بتاتے ہیں :

قافلہ شد واپسئی ما ببین   ای کس ما بیکسی ما ببین

یہ شعر مخزن اسرار کی مناجات میں واقع ہوا ہے ، مگر مرزا نے سہو سے اس کو جامی کی طرف منسوب

کیا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دوست اور رفیق اور ساتھی سب چل دیے، اب تیرے سوا کوئی ہمارا یار و مددگار نہیں ہے۔ یا مثلاً صاحب برہان لکھتا ہے کہ "شش ضرب نتیجۂ خوب، کنایہ از گوہر درز باشد و کنایہ از مشک و کنایہ از شکر و عسل و اقسام میوہا ہم ہست و بحذف ضرب ہم بنظر آمدہ کہ شش نتیجۂ خوب باشد۔" مرزا نے جو اس کا خاکہ اڑایا ہے وہ طول طویل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس مرکب اور بے معنی جملے کو لغت قرار دینا صاحب برہان ہی کا کام ہے اور اس طرح کے صدہا الفاظ ہیں جن پر مرزا نے گرفت کی ہے اور طرح طرح کی لغزشیں اور بے ربطیاں جو بغیر اس کے کہ درفش کاویانی کو اول سے آخر تک دیکھا جائے ذہن نشین نہیں ہوسکتیں۔

جس وقت مرزا نے قاطع برہان لکھی ہے نہ اُس وقت ان کے پاس ایک قلمی برہان[1] کے سوا کوئی فرہنگ لغات

۱- یہ بالکل غلط ہے۔ مرزا غالب کی کسی تحریر سے یہ ثابت نہیں کہ ان کے پیش نظر برہان قاطع کا قلمی نسخہ تھا۔ یہ حالی کا اختراع ذہن ہے۔ مرزا غالب کے پاس برہان قاطع کا جو مطبوعہ نسخہ تھا وہ مرزا صاحب کے تنقیدی حواشی کے ساتھ آج بھی لوہارو سیکشن، رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ جناب امتیاز علی خاں عرشی نے اُس نسخے کو سامنے رکھ کر کچھ مضامین بھی تحریر فرمائے ہیں (ماہنامۂ 'آج کل' دہلی بابت مارچ ۱۹۵۸ء، ماہنامۂ 'تحریک' دہلی بابت اپریل ۱۹۶۱ء) - عرشی صاحب کی تصریحات کے مطابق یہ نسخے افضل المطابع کلکتہ میں سن ۱۲۵۱ھ مطابق سن ۱۸۳۶ء میں بڑے سائز کے ۹۲۴ صفحات پر چھپا تھا۔ مرزا صاحب نے اسی نسخے پر اغلاط برہان قاطع درج فرمائیں اور پھر انھیں ترتیب دے کر 'قاطع برہان' کے نام سے شائع کیا۔ مرزا صاحب نے برہانِ قاطع کا یہ نسخہ یکم اگست ۱۸۵۸ء کو علاؤالدین خاں، علائی کو تحفۃً دے دیا تھا جس کا ذکر

(بقیہ صفحہ ۶۵ پر)

تھی اور نہ کوئی اور ایسا سامان موجود تھا جس پر تحقیق لغت کی بنیاد رکھی جاتی - پس جو کچھ انھوں نے لکھا، محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر اور یا ذوق و جدان کی شہادت سے لکھا - با ایں ہمہ چند مقامات کے سوا، جہاں فی الواقع مرزا سے لغزش ہوئی ہے، اور بعض غلطیوں کا انھوں نے خود بھی اقرار کیا ہے، ان کے تمام ایراد واجبی معلوم ہوتے ہیں - البتہ درفش کاویانی لکھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ فضلائے کلکتے کی مصححہ[1] و مطبوعہ برہان مرزا کے پیش نظر تھی -

قاطع برہان کی مخالفت کی وجہ و مخالفت

اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ہر کس و ناکس مرزا کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گیا - ایک قاطع برہان کے جواب میں 'محرق قاطع' 'قاطع قاطع' 'مؤید برہان'

بقیہ از صفحہ ٦٤
آن کے خطوط میں موجود ہے - اس نسخے کے پہلے سادہ صفحے پر انگریزی الفاظ میں مرزا غالب کی جانب سے یہ تحریر موجود ہے :—

"Presented to Alaood-din Khan by Mirza Asadoollah Khan Behadur.

Ist August 1858. Loharoo."

یہ نسخہ نوابان لوہارو کے ذاتی کتاب خانے میں محفوظ رہا - بالآخر ١٩٥٧ء میں نواب صاحب لوہارو نے اپنا ذاتی کتاب خانہ رضا لائبریری رام پور کو دے دیا جس میں یہ نسخہ بھی وہاں پہنچ گیا ہے -
خلیل الرحمان داؤدی

١ - چونکہ نسخہ محولہ بالا اگست ١٨٥٨ء ہی میں علائی کو دے دیا گیا تھا اس لیے درفش کاویانی کی ترتیب کے وقت مرزا صاحب کے پیش نظر برہان قاطع کا کوئی اور ایڈیشن تھا - یوں بھی درفش کاویانی میں برہان قاطع کے جن صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ اس برہان قاطع کے صفحات کے مطابق نہیں ہیں - داؤدی

'ساطع برہان' وغیرہ چند رسالے لکھے گئے - مخالفت کی وجہ ظاہر ہے - تقلید نہ صرف امور مذہبی میں ، بلکہ ہر چیز ، ہر کام ، ہر علم اور ہر فن میں ایسی ضروری شئے ہو گئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خطور کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر لائے - جو کتاب سو دو سو برس پہلے لکھی جا چکی ہے وہ وحی منزل کی طرح واجب‌التسلیم سمجھی جاتی ہے - پس مرزا کے اعتراضات برہان قاطع پر کیسے ہی صحیح اور واجبی ہوتے ، ممکن نہ تھا کہ اُن کی سختی کے ساتھ مخالفت نہ کی جاتی -

بعض لوگوں کو یہ خیال ہے کہ مرزا نے جو از راہ شوخئی طبع کے صاحب برہان کا جا بہ جا خاکہ اڑایا ہے اور کہیں کہیں الفاظ نا ملائم بھی غیظ و غضب میں اُن کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں ، زیادہ تر اس وجہ سے مخالفت ہوئی - مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے - اگر مرزا صاحب برہان کی نسبت ایسے الفاظ نہ لکھتے تو بھی مخالفت ضرور ہوتی - کیونکہ ہندوستان کے پرانے تعلیم یافتہ جو آج کل ایک نہایت کس مپرس حالت میں ہیں اُن کے لیے کنج خمول و گمنامی سے نکلنے کا کوئی موقع اس کے سوا باقی نہیں رہا کہ کسی سر برآوردہ اور ممتاز آدمی کی کتاب کا رد لکھیں اور لوگوں پر یہ ظاہر کریں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں[1] -

---

۱ - 'قاطع برہان' کی مخالفت کے سلسلے میں مولانا حالی کا یہ خیال بالکل غلط ہے - برہان قاطع پر مرزا غالب نے جتنے اعتراضات کئے تھے ان میں سے کافی غلط تھے اور اب تو قاضی عبدالودود صاحب اور امتیاز علی خاں عرشی وغیرہ کے مقالات نے یہ واضح طور پر ثابت کر دیا ہے کہ برہان قاطع پر مرزا کے بیش تر اعتراضات مرزا کی عدم واقفیت ، کم علمی اور نادانی پر مبنی تھے -
داؤدی

جو رسالے قاطع برہان کے جواب میں لکھے گئے ہیں جب اُن کو سرسری نظر سے دیکھا جاتا ہے تو مرزا کے اعتراضوں کے اکثر جواب بہت صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ایک مجیب برہان کی تائید اس طرح کرتا ہے کہ جس طرح صاحب برہان نے لغت کی تحقیق کی ہے اسی طرح فرہنگ جہان گیری یا فرہنگ رشیدی یا سراج اللغات یا موئدالفضلا یا ہفت قلزم یا کسی اور فرہنگ میں لکھا ہے اور اس سے بادی النظر میں صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا اعتراض غلط ہے، مگر جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فارسی لغات کی اکثر فرہنگیں ہندوستان میں لکھی گئی ہیں اور جو فرہنگ سب سے پہلے لکھی گئی تھی پچھلوں نے زیادہ تر اُسی کا تتبع کیا ہے تو کسی مجیب کے جواب کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی۔

قاطع برہان کی تائید

ایران کے ایک مشہور مصنف رضا قلی خاں ہدایت نے ۱۲۸۸ھ میں، یعنی مرزا کی وفات سے چار برس بعد فارسی لغت کی ایک مبسوط کتاب لکھی ہے جو 'فرہنگ ناصری' کے نام سے موسوم ہے اور مرزا کی وفات سے دس بارہ برس بعد ہندوستان میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ فارسی لغت کے متعلق جو کچھ اُس نے لکھا ہے وہ بہر حال اُن فرہنگ نگاروں کی تحقیقات سے جنھوں نے ہندوستان میں بیٹھ کر فارسی لغت کی کتابیں لکھی ہیں، زیادہ معتبر اور زیادہ اطمینان کے لائق ہوگا۔ اس نے اپنی فرہنگ کے شروع میں ایک باب فرہنگ جہان گیری، فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع تینوں کی غلطیوں اور لغزشوں کے بیان میں منعقد کیا ہے

اور اس کے بعد ایک باب میں صرف برھان قاطع کی غلطیاں ظاھر کی ھیں ۔ مثلاً یہ کہ اندلس ایک جزیرہ ھے ایک پہاڑ کے اوپر ، یا غرناطہ ایک صوبہ ھے ھندوستان کا یا چکاک کے تین معنی لکھے ھیں: پیشانی ، قبالہ نویس اور مہر کن (اور یہ تینوں معنی غلط لکھے ھیں) یا کروخ جو ایک قریہ ھے مضافات ھرات میں اس کو برھان میں لکھا ھے: ''قریہ ایست از قرائی عالم'' یہاں از راہ طنز صاحب فرھنگ ناصری لکھتا ھے ''فی الحقیقت تحقیقی دقیق فرمودہ است'' اسی طرح بہت سی غلطیاں صاحب برھان کی اس باب میں ظاھر کی ھیں اور اس کے سوا اپنی تمام فرھنگ میں جا بجا اس کا تخطیہ کیا ھے ۔

جو اعتراض مرزا نے برھان پر وارد کیے ھیں ان کی بھی جا بجا فرھنگ ناصری سے تائید ھوتی ھے ۔ ازاں جملہ لفظ آبچین ، استخر ، اصطخر ، جمدر ، باختر، راوش و زاوش، کار کیا ، دیژہ و ادیژہ ، اسی طرح کے اور بہت سے الفاظ کی تحقیق فرھنگ ناصری میں مرزا کے بیان کے مطابق پائی جاتی ھے ۔ اس کے سوا برھان کے بیان کو جہاں مرزا نے بے معنی اور مہمل بتایا ھے ، رضا قلی خاں بھی اس کو مہمل بتاتا ھے؛ مثلاً لفظ انجلک کی تفسیر میں صاحب برھان لکھتا ھے ''ھر چند فراش خیال جاروب سنبل برجل خر سک ریش زند از پوست آن پاک نہ تواند'' مرزا اس کی نسبت لکھتے ھیں ''فقرۂ اخیر مگر کلام دیو است؟ ھرگاہ خوبی تحقیق چنان و حسن عبارت چنیں باشد مقصود اصلی کہ معلوم کردن مجھولات است از برھان قاطع چگونہ حاصل توان کرد'' رضا قلی خاں از راہ طنز اسی فقرے پر یہ

لکھتا ہے ''درین مقام این انشائی بدیع و بیان بلیغ زادہ طبع ایشان بودہ۔ برہانِ ذوق سلیم و سلیقۂ مستقیم صاحب برہان خود همین عبارات بس است ، تا ازیں سپس ازو چه آید ۔'' اسی طرح برہان کی اکثر مہمل عبارتیں نقل کر کے اس پر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ ''در ولایت ہند کہ نہ ترکی دانند و نہ پارسی ضبط و تصحیح لغات فارسی کے توانند ۔'' ایک جگہ صاحب برہان جامع (جو کہ ایرانی ہے) کا قول برہان قاطع کے باب میں نقل کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے ''کہ برہان قاطع میں لغات بغیر سند اور شواہد کے ذکر کئے گئے ہیں؛ آن پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ اس میں کنایات کو بھی علیحدہ لغت قرار دیتا ہے اور سریانی و عبرانی و ترکی و ژند و پاژند کے غیر مستعمل لغات کے بیان میں اور ایک ایک لغت کو بار بار مختلف صورتوں سے ذکر کرنے میں تطویل لا طائل کرتا ہے ۔'' اس کے بعد رضا قلی خاں صاحب برہان جامع کی تصدیق اور اس کے ساتھ اتفاق رائے کرتا ہے ۔ چونکہ مرزا کی لائف میں یہ بیان بے مزہ معلوم ہوگا، اس لیے ہم اس سے قطع نظر کرتے ہیں ۔ جس کو تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو وہ فرہنگ ناصری کو خود ملاحظہ کرے ۔

اگرچہ مرزا نے قاطع برہان میں بعض اعتراض غلط کئے ہیں؛ خصوصاً لفظ افسوس کے متعلق ایک بڑی فاحش غلطی کی ہے کہ اس کو لفظ عربی الاصل ماخوذ از 'اسف' قرار دیا ہے اور اس غلطی کا انھوں نے آخر کار خود بھی اعتراف کیا ہے اور عربی الفاظ کی تحقیق سے اپنی لا علمی ظاہر کی ہے اور ممکن ہے کہ اس کے سوا اور بھی کہیں

کہیں اُن سے غلطی ہوئی ہو، لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو قاطع برہان کے دیکھنے سے مرزا کی سلامتئ طبع اور ذوق صحیح کا کافی ثبوت ملتا ہے اور جیسا کہ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ''فارسی زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزین ہیں جیسے فولاد میں جوہر،، فی الواقع فارسی زبان سے اُن کو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ جو رائے کہ انھوں نے محض اپنے وجدان سلیم کی ہدایت سے برہان کی نسبت قائم کی تھی وہی رائے ایران کے محققوں نے اُس کی نسبت ظاہر کی ہے اور جو غلطیاں اور بے ربطیاں مرزا نے برہان میں بتائی ہیں وہ اور اُن کے سوا اور بے شمار غلطیاں صاحب فرہنگ ناصری نے اُس میں نشان دی ہیں۔ اس سے زیادہ ایک ہندوستانی محقق کی سلامتئ طبع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

مرزا نے قاطع برہان کے اخیر میں چند فوائد لکھے ہیں؛ اُن میں سے فائدہ اول کا ماحصل یہ ہے کہ ''ان فوائد کے پیش کرنے میں چونکہ خود نمائی کی بو آتی ہے، اس لیے شاید لوگ یہ کہیں کہ خود ہندوستانی ہو کر اور ہندوستانیوں کو مسلم نہ جاننا اور خود زبان دانی کا دعویٰ کرنا بے معنی ہے۔ سو میں اقرار کرتا ہوں کہ میرا دادا توران سے آیا تھا اور میرا باپ دلی میں پیدا ہوا اور میں آگرے میں۔ حاشا کہ میں اپنے تئیں اہل زبان سمجھتا ہوں۔ میں بلا شبہ زبان داں ہوں اور میری زبان دانی اولاً خداداد سلامتئ طبع کی بدولت ہے جو غلطی کو قبول نہیں کرتی اور بغیر سچائی کے تسلی نہیں پاتی۔ دوسرے اس وجہ سے ہے کہ میری طبیعت فارسی زبان سے فطرۃً مناسب واقع ہوئی

ہے۔ تیسرے مولانا عبدالصمد کے فیض صحبت سے، جو مجھ کو دو برس تک برابر حاصل رہا۔ چودہ برس کی عمر میں میں نے اُس سے تربیت پائی اور باون برس مشق سخن کی۔ اب کہ مجھ کو چھیاسٹھواں سال ہے میں خدا کا شکر کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ ان باون برسوں میں اُس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجے کی بلندی بخشی ہے۔ افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہ سمجھا! اور زیادہ تر افسوس یہ کہ وہ شان ایزدی کی شناخت سے محروم رہے اور میری نظم و نثر کے کرشموں کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ گویا نظیری جنت آرام گاہ کا مقطع میرے حسب حال ہے:

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ!،،

جتنے آدمیوں نے قاطع برہان کے جواب لکھے ہیں اُن میں سے بعض کے جواب مرزا نے بھی لکھے ہیں اور ان جوابوں میں زیادہ تر ظرافت اور شوخئی طبع سے کام لیا ہے۔ کہیں اُن کے طرز بیان کا خاکا اُڑایا ہے، کہیں اُن کی تحقیقات کا مضحکہ کیا ہے۔

لطیفہ

مولوی امین‌الدین کی کتاب ''قاطع قاطع،، کا جواب مرزا نے کچھ نہیں دیا، کیونکہ اُس میں فحش اور ناشائستہ الفاظ کثرت سے تھے۔ کسی نے کہا ''حضرت آپ نے اُس کا کچھ جواب نہیں لکھا؟،، مرزا نے کہا ''اگر کوئی گدھا

تمھارے لات مارے تو کیا تم بھی اُس کے لات مارو گے؟،،[1]

ایک شخص مرزا احمد علی بیگ[2]، متوطن کلکتہ[3]، جنھوں نے مرزا کے خلاف ایک مبسوط کتاب مویدالبرھان[4] لکھی ھے، جس کے لکھتے وقت تمام ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ قاطع برھان کے چند اوراق کی تردید کے لیے چھان مارا اور مثل اور مجیبوں کے مرزا کے کسی اعتراض کو تسلیم نہیں کیا اور جو سبک الفاظ مرزا نے صاحب برھان کی نسبت استعمال کیے تھے، ویسے ھی الفاظ مرزا کی نسبت استعمال کیے ھیں، اپنے تئیں اصفہانی الاصل قرار دیا ھے اور ٹیک چند بہار اور قتیل کی بہت تعریف کی ھے اور اپنی کتاب کی تعریف میں تقریظیں اور تاریخیں لکھوا کر کتاب کے آخر میں چھپوائی ھیں۔ اُس کے جواب میں مرزا نے ایک رسالہ موسوم بہ ''تیغ تیز'' لکھا ھے اور ایک فارسی قطعہ بھی اُن کو لکھ کر بھیجا ھے جس کے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ھیں، جو لطف سے خالی نہیں:

خواجہ را از اصفہانی بودن آ با چہ سود
خالقش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است

۱۔ یہ لطیفہ بھی مثل اور بہت سے لطیفوں کے مولانا حالی نے 'آبحیات' ھی سے لیا ھے۔ آبحیات کی عبارت یہ ھے: ''مرزا کی قاطع برھان کے بہت شخصوں نے جواب لکھے ھیں اور بہت زبان درازیاں کی ھیں۔ کسی نے کہا کہ حضرت آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ لکھا؟ فرمایا ''بھائی! اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دو گے؟'' (آبحیات ناشر شیخ مبارک علی، لاھور، صفحہ ۵۲۸)

۲۔ صحیح نام 'آغا احمد علی' ھے۔ داؤدی

۳۔ آغا احمد علی ۱۸۳۹ء میں بمقام ڈھاکہ پیدا ھوئے تھے۔ 'مؤید برھان' کی تالیف کے وقت مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں ملازم ضرور تھے۔ انھیں ''متوطن کلکتہ'' لکھنا غلطی ھے۔ داؤدی

۴۔ یہ غلط ھے۔ کتاب کا نام 'مؤید برھان' ھے۔ داؤدی

باقتیل و جامع برهان و لاله ٹیک چند
لابهٔ و سوگیری ولطف و مدارا کرده است

داوری آگاهی بنا فرمود و در وی هر سه را
منصف و صدر امین و صدر اعلیٰ کرده است

گرچنیں با هندیاں دارد تولا در سخن
من هم از هندم چرا از من تبرا کرده است؟

مطلب از بدگفتن من چیست؟ گویا نیک مرد
مزد این کا راز حق آمرزش تمنا کرده است

صاحب علم و ادب! وانگه ز افراط غضب
چون سفیهان دفتر نفرین وذم وا کرده است

درجدل دشنام کار سوقیاں باشد، بلے!
ننگ دارد علم از کاری که آغا کرده است

انتقام جامع برهان قاطع می کشد
آنچه ما کردیم باوی، خواجه باما کرده است

من سپاهی زاده ام گفتار من باید درشت
وائی بروی گربه تقلید من ایں ها کرده است

زشت گفتم لیک داد بذله سنجی داده ام
شوخئی طبعی که دارم این تقاضا کرده است

می کند تائید برهان لیک برهان نا پدید
نیست جز تسلیم قولش هرچه انشا کرده است

سستی طرز خرام خامهٔ برهان نگار
یا نه می دانست یا دانسته اخفا کرده است

بهر من توهین و بهر خویش تحسین جابجا
هم مرا، هم خویش را، در دهر رسوا کرده است

---

۱ - لابه: خوشامد - ۲- سوگیری: طرفداری - ۳- داوری گاه: محکمه -

یا فتم از دیدن تاریخ هائی آن کتاب
خود بدم گفت و به احباب خود ایما کرده است
غازیان همراه خویش آورد از بہر جہاد
تا نہ پنداری کہ این پیکار تنہا کردہ است

قاطع برہان اور اُس کے متعلق مرزا کی جس قدر تحریریں ہیں اُن پر اعتراضوں اور جوابوں کے علاوہ بہت سے بیش بہا فائدے اور لطیف و دلچسپ حکایتیں اور لطائف و ترہات بھی درج ہیں۔

لطیفہ

لفظ فراز کو صاحب برہان اضداد میں سے گنتا ہے اور فراز کردن کے معنی بند کرنا اور کھولنا دونوں بتاتا ہے۔ مگر مرزا اس کو اضداد میں نہیں گنتے ؛ بلکہ اس کے معنی صرف بند کرنے کے بتاتے ہیں اور جو اشعار مخالفوں نے سند میں پیش کیے ہیں، مرزا نے اُنھیں اشعار سے اپنے دعوے کی تائید کی ہے ؛ مگر چونکہ ہندوستان کے تمام فرہنگ نگاروں نے فراز کو اضداد میں شمار کیا ہے، اس کی بابت مرزا لکھتے ہیں کہ ”اس کو امر اجماعی قرار دینا ویسا ہی اجماع ہے جیسا کہ اهل شام نے خلافت یزید پر اجماع کیا تھا۔“

لطیفہ

صاحب برہان کی چند عامیانہ غلطیاں اور اُس کے بیان کی بے ربطیاں ظاہر کرنے کے بعد ایکہ جگہ لکھتے ہیں:
”خدا پرستان ! از بہر خدا این عربی مفہم فارسی مداں (یعنی جامع برہان) نمی پرسم کہ کیست ، می پرسم کہ چیست“
ایک اور جگہ نہایت طیش میں آ کر لکھتے ہیں ”چون

شناسائی حقیقت جوہر لفظ نه دارد فرہنگ چرا می نگارد ؟ بوریا می بافت ، رسن می تافت ، ہیزم می فروخت، گلخن می افروخت ۔''

مرزا نے ایک فارسی رسالے کے مولف پر جو قاطع برہان کے جواب میں لکھا گیا تھا اور جو فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا ، ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش بھی کی تھی؛ مگر جب کامیابی کی امید نه رہی تو آخرکار آنھوں نے راضی نامه داخل کر دیا ۔ اثنائے تحقیقات میں دلی کے بعض اہل علم عدالت میں اس بات کے استفسار کے لیے بلائے گئے تھے که جو فقرے مدعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں آیا فی الواقع آن سے فحش و دشنام مفہوم ہوتا ہے یا نہیں ؟ آنھوں نے غریب ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے آن فقروں کے ایسے معنی بیان کیے جن سے ملزم پر کوئی الزام عائد نه ہو ۔ ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا ؛ کسی نے پوچھا حضرت ! آنھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی ؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یه شعر پڑھا :

به ہرچه در نگری جز به جنس مائل نیست
عیاری کسئی من شرافت نسبی ست[1]

گمنام خطوں میں گالیاں

جب یه مقدمه داخل دفتر ہو گیا، ایک مدت کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خط متضمن سب و شتم بھیجنے

۱ یعنی میری بے کسی کی وجه شرافت نسبی ہے - کیوں که ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے ۔ چونکه شرافت نسبی میں کوئی میرا ہم جنس نہیں ہے، اس لیے میرا کوئی ساتھ نہیں دیتا ۱۲ -

شروع کیے جن میں شراب نوشی اور بد مذہبی وغیرہ پر سخت نفرین اور طعن و ملامت لکھی ہوتی تھی - اُن دنوں میں مرزا کی عجیب حالت تھی؛ نہایت مکدر اور بے لطف رہتے تھے اور جب چٹھی رساں ڈاک لے کر آتا تھا تو اس خیال سے کہ مبادا کوئی اسی قسم کا خط نہ آیا ہو، اُن کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا - اتفاق سے اُنھیں دنوں میں نواب مصطفٰے خاں مرحوم کے ہمراہ میرا دلی میں آنا ہوا - چونکہ مجھ کو ان نا لائق گمنام خطوں کے آنے کا حال معلوم نہ تھا، ایک روز مجھ سے ایک ایسی غلطی ہو گئی جس کے تصور سے مجھ کو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے - یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو، اور مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے اہل سنت کو، اور اہل سنت میں سے صرف حنفیہ کو، اور اُن میں سے بھی صرف اُن لوگوں کو جو صوم و صلواۃ اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں، نجات اور مغفرت کے لائق جانتے تھے - گویا دائرۂ رحمت الٰہی کو کوئین وکٹوریا کی وسعت سلطنت سے بھی جس میں ہر مذہب و ملت کے آدمی بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں، زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے تھے - جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا تھا اُسی قدر اس بات کی تمنا ہوتی تھی کہ اُس کا خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات اور مغفرت کے لیے ناگزیر ہے[1] - چونکہ مرزا کی ذات کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجہ غایت تھا، اس لیے ہمیشہ اُن کی حالت

---

۱ - حالی نے یہ کیفیت اپنی قلم بند کی ہے - داؤدی

پر افسوس ہوتا تھا۔ گویا یہ سمجھتے تھے کہ روضۂ رضوان میں ہمارا اُن کا ساتھ چھوٹ جائے گا اور مرنے کے بعد پھر اُن سے ملاقات نہ ہو سکے گی ۔ ایک روز مرزا کی بزرگی، اُستادی، اور کبر سنی کے ادب اور تعظیم کو بالائے طاق رکھ کر خشک مغز واعظوں کی طرح اُن کو نصیحت کرنی شروع کی۔ چونکہ اُن کا ثقل سماعت انتہا کے درجے کو پہنچ گیا تھا اور اُن سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعے سے کی جاتی تھی، نماز پنج گانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھ کر اُن کے سامنے پیش کیا جس میں اُن سے اس بات کی درخواست تھی کہ آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے نماز پنج گانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی، مگر مگر نماز ترک نہ ہو۔

مرزا کو یہ تحریک سخت ناگوار گزری اور ناگوار گزرنے کی بات ہی تھی؛ خصوصاً اس وجہ سے کہ اُنھیں دنوں میں لوگ گمنام خطوں میں اُن کے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کر رہے تھے اور بازاریوں کی طرح کھلم کھلا گالیاں لکھتے تھے ۔ مرزا صاحب نے میری لغو تحریر کو دیکھ کر جو کچھ فرمایا وہ سننے کے لائق ہے ۔ اُنھوں نے کہا ”ساری عمر فسق و فجور میں گزری؛ نہ کبھی نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا، نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں، اب اگر چند روز بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیوں کر ہو سکے گی؟ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں میرے عزیز اور دوست میرا منہ

کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں اور چیلوں اور کوؤں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھاناگوارا کریں) چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بد تر سلوک کیا جائے، لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں: لاالہ‌الااللہ لا موجودالااللہ لا مؤثر فی‌الوجودالااللہ۔"

لطیفہ

شاید اسی روز جب کہ یہ گفتگو ہو چکی تھی اور مرزا صاحب کھانا کھا رہے تھے، چٹھی رساں نے ایک لفافہ آ کر دیا۔ لفافے کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے ان کو یقین ہو گیا کہ یہ کسی مخالف کا ویسا ہی گم نام خط ہے جیسے پہلے آ چکے ہیں۔ لفافہ مجھ کو دیا کہ اس کو کھول کر پڑھو۔ میں جو دیکھتا ہوں تو فی‌الحقیقت سارا خط فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا کس کا خط ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اس کے اظہار میں تامل ہوا۔ فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگرد معنوی کا لکھا ہوا ہے۔ پھر اول سے آخر تک خود پڑھا۔ اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی۔ مسکرا کر کہنے لگے کہ "الو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں، تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں، کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی

گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا - یہ قرم ساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا؟''

اس کے بعد میں اُن سے رخصت ہو کر چلا آیا - دوسرے روز حضرت نے ایک غزل لکھ کر میرے پاس بھیجی جس میں اگرچہ میرے نام اور تخلص کی تصریح نہ تھی، لیکن اُس کے بعض مضامین اور اشارات سے معلوم ہوا کہ اُس میں جو طعن و تعریض ہے وہ میری ہی نسبت ہے - غزل یہ ہے:

به مقصدی که مران را ره خدا گویند
بروبرو که ازان سوبیابیا گویند
کسیکه پائی نه دارد چگو نه راه رود
خود اهل شرع درین داوری چها گویند؟
ز رمز نخل انا الله گوئی، نا آگه
حدیث جلوه گه و موسیٰ و عصا گویند
مگر زحق نه بود شرم حق پرستان را
که نام حق نه برند و همیں انا گویند
ز قول شان نه بود دل نشین اهل نظر
جز آن صفات که از ذات کبریا گویند
نه خوانده در کتب ونا شنیده از فقهاء
بغیر بی مزه واگویه ها که وا گویند
دم از وجودک ذنب[1] زدند بے خبران
چه سان عطیهٔ حق را گناه ما گویند

---

[1] یہ ایک مشہور قول صوفیہ کرام کا ہے - میں نے جو کچھ مرزا صاحب کو لکھ کر دیا تھا اُس میں ایک موقعے پر یہ جملہ بھی لکھا گیا تھا - مرزا اس پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کو تسلیم نہیں

بلے! گناہ بود دعوی وجود از ما
باھل راز چنیں گوی تا بجا گویند
و گر ملا متیان را چہ زھرۂ پاسخ
اگر بہ خشم گرایند و ناسزا گویند
نہ کردہ زر مس خود را و بحر عرض فریب
بہ پیش خلق حکایت زکیمیا گویند
کسان کہ دعوی نیکی ھمی کنند، مرا
اگر نہ نیک شمارند ، بد چرا گویند؟
طمع مدار کہ یابی خطاب مولانا
بس ست ھمچو توئی را کہ پارسا گویند
بگوی مردہ کہ در دھر کار غالب زار
ازان گزشت کہ درویش و بینوا گویند

اس غزل کو دیکھ کر مجھ کو اس بات کا موقع ملا کہ مرزا کے کمال شاعری کی نسبت جو خیالات مکنون خاطر ھیں اور کبھی اُن کے اظہار کی نوبت نہیں آئی اُن کو کسی قدر شکایت کے ساتھ ایک مختصر قطعے میں بیان کیا جائے - چنانچہ قطعہ ذیل ترتیب دے کر مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا :

بقیہ صفحہ ۷۹

کرتے - وہ کہتے ھیں کہ ''وجود ایک عطیہ الٰہی ھے ؛ پس اس کو ھمارا گناہ کیوں کر کہا جا سکتا ھے؟ البتہ دعویٰ وجود گناہ ھے - اگر اھل راز سے اس طرح کہا جائے تو وہ تسلیم کر سکتے ھیں -'' مگر معلوم رھے کہ جن لوگوں کا یہ قول ھے کہ ''وجودک ذنب'' وہ ایک وجود واجب کے سوا اور کسی وجود کے قائل نہیں ھیں - وحدت وجود اُن کا اصل اُصول ھے - پس اُن کے نزدیک وجود ماسوا عطیہ حق نہیں ھے - بلکہ وھم و خیال انسانی کے مخترعات میں سے ھے اسی لیے کہتے ھیں کہ 'وجودک ذنب' ۱۲ -

قطعه

تو ای کـه رونق پیشینیان بهم بشکست
ز نظم و نثر تو کاندر زمان ما گفتی
چه نغمه ها که به قانون ذوق سنجیدی
چه بذله ها که بانداز دل ربا گفتی
رسید نشئهٔ عرفان چو ذکر می راندی
شگفت خاطر یاران گر از صبا گفتی
دوید ریشه به‌دل‌ها جوحرف مهر زدی
دمید نخل تمنا چو از وفا گفتی
گهر به بزم فشاندی اگر ثنا خواندی
اثر ز لفظ دماندی اگر دعا گفتی
هزار عقدهٔ سر بسته باز بکشودی
هزار نکتهٔ پوشیده بر ملا گفتی
ز سر تفرقه جمع قصه ها راندی
ز سیر انفس و آفاق راز ها گفتی
برآمد از دل بیگانگان ترانهٔ ذوق
به محفلی که سخن های آشنا گفتی
لطیفه ها که به لفظ و بیان نه‌می‌گنجید
تو چون فرشته زغیب آمدی و وا گفتی
بحق لطف کلامت که هست بر دل ما
که پایهٔ سخن افراشتند تا گفتی
تو ای که هرسخن نغزتو به‌دل جا کرد
جز آن که در حق حالی به رمز واگفتی
هر آن چه گفتهٔ اندر جواب عرض نیاز
خطا بود که به گیرم اگر خطا گفتی

ولی به عربده از حرف چند با خویشم
که گر نه‌گفته ام آخر تو از کجا گفتی

عجب کـه قـاعده دان نیاز مندی را
سفیه‌ومعجب و خود بین و خود نما گفتی

عجب که چاشنی اندوز خاکساری را
رهین ذوق نوا سنجی انا گفتی

عجب که منفعلی را ز نقد نا سره اش
به زرق در گرد عرض کیمیا گفتی

نه‌راه حرف به‌سویت نه‌جائی من به‌دلت
جواب چیست اگر پرسم از کجا گفتی

اگر نه روئی سخن باتو بود ، می‌گفتم
چگونه گفتی؟و چون‌گفتی؟و چرا گفتی؟

ولیک شرط ادب نیست بر توخرده‌گرفت
هر آن چه در حق من گفتهٔ بجا گفتی

جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اُس زمانے میں مجھ کو نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم متخلص به شیفته و حسرتی، رئیس جہاں گیر آباد کے ھاں تعلق تھا اور ان دنوں میں وہ دلی آئے ہوئے تھے اور میں اُنھیں کے مکان پر مقیم تھا۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کی نظر سے گزرا تو انھوں نے لچار بیت کا ایک نہایت لطیف قطعہ نواب مرحوم کے پاس لکھ کر بھیجا، جو ذیل میں درج ہے :

قطعہ

تو ای که شیفتهٔ و حسرتی لقب داری
همی به لطف تو خود را امیدوار کنم

چو حالی از من آشفته بی سبب انجید
توگر شفیع نه‌گردی بگو چه کار کنم؟
دوباره عمر دهندم اگر بفرض محال
بران سرم که دران عمراین دو کار کنم
یکے ادای عبادات عمر پیشینه
دگر به پیش گه حالی اعتذار کنم

اگرچه مجھ کو شرم آتی ہے کہ مرزا کے عالی رتبہ کلام کے ساتھ اپنا کم وزن و بے وقعت کلام ناظرین کے سامنے بار بار پیش کروں، مگر مقام اور موقع اس بات کا مقتضی ہے کہ جس واقعے کا ذکر چھڑ گیا ہے اس کو انجام تک پہنچایا جائے۔ مرزا صاحب کے اس قطعے پر میں نے ایک اور قطعہ لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجا جو ذیل میں لکھا جاتا ہے:

قطعہ

تو ای که عذر فرستادهٔ بسوی رهی
سزد که جان گرامی بران نثار کنم
شکایتی که توان گفت عین اخلاصش
گرم تو دوست شماری هزار بار کنم
نه مانند قاعدهٔ شکر بے ریا بجهان
اساس دوستی از شکوه استوار کنم
چو شکوه جز به تقاضای دوستی نه بود
ز غیر شکر و شکایت ز دوست‌دار کنم
سرشت پاک و دل صاف داده اند مرا
بحرف تلخ ولی خالی از غبار کنم

خوش آن که ساز کنم از تو شکوۂ بےجا
تو اعتذار کنی و من افتخار کنم
خوشان که عذر تو چوں در کند مرا بزمین
و گر به پیش تو تمہید اعتذار کنم
بران سرم که اگر مرگ امان دهد زین پس
زکارهای جہاں خاصه ایں سه کار کنم
زکرده توبه نمایم، ز گفته استغفار
دگر سپاس تو پنہاں و آشکار کنم

جب یہ قطعہ مرزا صاحب کے پاس پہنچا، اس پر یہ لکھ کر کہ "بس اب بیت بحثی موقوف" میرے پاس بھیج دیا، اس کے بعد پھر اور کچھ نہیں لکھا گیا۔

استعداد عربی، فارسی دانی، عروض، نجوم، تصوف اور تاریخ

مرزا نے عربی میں صرف ونحو کے سوا اور کچھ استاد سے نہیں پڑھا تھا، مگر چونکہ علم لسان سے اُن کو فطری مناسبت تھی، اُن کی نظم و نثر اردو فارسی کے دیکھنے سے کہیں اس بات کا خطرہ تک دل میں نہیں گزرتا کہ یہ شخص عربیت اور فن ادب سے ناواقف ہوگا۔ عربی الفاظ کو اُنھوں نے ہر جگہ اُسی سلیقے سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اچھے فاضل اور ادیب کو استعمال کرنا چاہئے۔ شاعری، جس کا ملکہ ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا، اس سے قطع نظر کر کے فارسی زبان اور فارسی الفاظ و محاورات کی تحقیق اور اہل زبان کے اسالیب بیان پر مرزا کو اس قدر عبور تھا کہ خود اہل زبان میں بھی مستثنٰی آدمیوں کو ایران کے مستند شعراء کی زبان پر اس قدر عبور ہوگا۔

اس کے سوا فن عروض میں بھی اُن کو کافی دست گاہ معلوم ہوتی ہے - اکثر بڑے بڑے نامور شعراء کو دیکھا اور سنا گیا ہے کہ باوجود کمال شاعری کے اس فن سے محض ناآشنا ہوتے ہیں اور سیدھی سیدھی بحروں کے سوا جن کے وزن اور تول کا اندازہ صرف استقامت طبع سے ہو سکتا ہے اور بحروں میں کلام موزوں نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں:

من نہ‌دانم فاعلاتن فاعلات شعرمی‌گویم بہ از قندونبات

مرزا کا ایسا حال نہ تھا، چنانچہ فارسی اردو میں متعدد غزلیں اور نیز ایک آدھ فارسی قصیدہ ایسی ٹیڑھی بحروں میں انھوں نے لکھا ہے کہ اکثر موزوں طبع بغیر واقفیت عروض کے ان بحروں میں نہیں چل سکتے[۱] - علم نجوم سے کسی قدر اور اس کی اصطلاحات سے پوری واقفیت ان کو

۱- مولانا حالی نے غالب کو ماہر عروض ثابت کرنے میں مبالغے سے کام لیا ہے - انھوں نے بحر مجتث مثمن مخبون اور بحر منسرح مثمن مطوی منحور یا مجدوع میں طبع ازمائی ضرور کی ہے، لیکن فارسی غزلیات میں یہ بحریں عام طور پر استعمال میں لائی جاتی ہیں اور ان میں شعر کہنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ حالی سمجھتے ہیں - عروض کے سلسلے میں غالب سے کچھ لغزشیں بھی سرزد ہوئی ہیں؛ مثلاً:

(۱) نواب صاحب رام پور کو ۲۹- مارچ ۱۸۶۶ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''ایک غزل نئی طرز کی نئی بحر میں عرض کرتا ہوں - یہ جشن حال کی نذر ہے - خدا کرے مقبول ہو - زیادہ حد ادب -

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب ، غالب

۲۹- مارچ ۱۸۶۶ء

بحر ہزج مثمن سالم (فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن)

بقیہ صفحہ ۸۲ پر

تھی ، چنانچہ ان کی نظم فارسی میں جابجا اس کا کافی ثبوت

بقیہ از صفحہ ۸۵

اے خداوند خرد مند و جہاں داور دانا
وے، بہ نیروئے خرد ، بر ھمہ کردار توانا
....

.... (مکاتیب غالب ، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی طبع چہارم ۱۹۴۶ء صفحہ ۵۱)'' یہ غزل بحر رمل مثمن مخبون میں ھے لیکن مرزا صاحب نے اسے بحر ہزج مثمن سالم میں لکھ دیا ھے۔ ایک مشہور بحر کو غلط بتانا اور اسے 'نئی بحر' کہنا یقیناً مرزا صاحب کی عروض سے کم واقفیت کی دلیل ھے۔ یہ کوئی نئی بحر نہیں ھے ، بلکہ متقدمین نے اس میں غزلیں کہی ھیں۔ صرف دیوان مولانا روم میں اسی بحر کی ۷۰ غزلیں ملیں گی ۔

(ب) اسے سب تسلیم کرتے ھیں کہ غالب کے مصرعے ''دل رک رک کر بند ھو گیا ھے غالب'' میں ایک 'رک' زاید ھے۔

(ج) تیغ تیز کے صفحہ ۱۴ و ۳۱ پر مرزا صاحب نے مصرع ''چشم مخالفاں بیازن بہ تیر'' کو ناموزوں کہا ھے ، حالانکہ وہ موزوں ھے وغیرہ ۔

یہ تو فن عروض کی کیفیت ھے۔ فن قافیہ میں بھی غالب کا حال ایسا ھی ھے ۔ غالب اس سے بھی بے خبر تھے کہ قافیے کی بنا حرف روی پر ھوتی ھے اور 'روی' آخری حرف اصلی یا اس کے قائم مقام کو کہتے ھیں۔ غالب 'گرفت' کی 'ف' کو بجائے حرف قید کے 'روی' سمجھتے تھے ۔ مرزا صاحب نے فتحۂ ''را'' کو ثابت کرنے کے لیے خاقانی کا ایک شعر دیا جس میں 'گرفتہ' اور 'رفتہ' کا قافیہ ھے، حالانکہ 'گرفتہ' میں روی حرف اصل سے مل کر متحرک ھو گئی ھے اور 'ر' کی حرکت داخل قافیہ نہیں رھی۔ انھوں نے فتحۂ تائے 'آتش' کے لیے یہ اشعار دئے ھیں :

مے کوست حلوائی ھر غم کشی — ندیدہ بجز آفتاب آتشی
میاں دو تن جنگ چوں آتش است — سخن چین بدبخت ھیزم کش است
در پیشۂ ما شیر و شی می باید — ما کوراں را عصا کشی می باید
از فقر رسیدہ بور یائی مارا — اندکے نفتے و آتشی می باید

ان اشعار سے فتحۂ تائے 'آتش' کو ثابت کرنا ایسا ھی ھے جس طرح 'گرفتہ' سے فتحۂ را کا ثابت کرنا ۔ (ماخوذ از مضمون 'یادگار غالب' نوشتہ ڈاکٹر عبدالوحید قریشی صاحب)

ملتا ہے - علم تصوف سے، جس کی نسبت کہا گیا ہے :

برائی شعر گفتن خوبست

ان کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعے سے گزرے تھے اور سچ پوچھئے تو انھیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں ، بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا - فن تاریخ اور سیاق و مساحت وغیرہ سے ان کو مطلق لگاؤ نہ تھا - ۱

بقیہ از صفحہ ۸۶

ایطا کی نسبت غالب کا خیال ہے : ''الف فاعل......الف نون جمع کا ......الف نون حالیہ......مطلع میں آ پڑے تو ایطائے جلی ہے - اگر غزل یا قصیدے میں بہ تکرار قافیہ آ پڑے تو ایطائے خفی ہے (عود ہندی صفحہ ۱۲) ایطائے جلی و ایطائے خفی میں یہ فرق غالب کے سوا شاید ہی کسی نے بتایا ہو اور خود غالب بھی تفتہ کو ایک خط میں اس کے خلاف لکھ چکے ہیں (اردوئے معلیٰ صفحہ ۷۶) ایطا تکرار قافیہ کا نام ہے - مستند کتابوں میں جو قاعدہ درج ہے وہ یہ ہے کہ بیت مصرعے کے مصرع اول کے قافیے کا اعادہ - اگر نظم ایک بیت سے زائد کی ہو تو بیت اول کے مصرع ثانی کو چھوڑ کر کہیں اور ایک بار ہونے میں مضائقہ نہیں - ایطائے جلی اس صورت میں ہے کہ قافیوں کا ایک ہونا نمایاں ہو - مثلاً شہیداں و عندلیباں - ایطائے خفی اس صورت میں ہے کہ قافیوں کا ایک ہونا زیادہ نمایاں نہ ہو ، جیسے مزدور ، گنجور - مختصر نظموں میں (بیت مصرع کے مصرع اول کے قافیے سے قطع نظر) ایطائے جلی سخت عیب ہے - اگر نظم طویل ہو تو دور دور پر اعادہ ہو سکتا ہے - اس معاملے میں بعض اصناف سخن میں نسبتاً زیادہ آزادی حاصل ہے - تفاصیل المعجم ، معیارالاشعار، رسالہ جامی و رسالۂ عطاءاللہ میں ملیں گے -'' ('نقد غالب ، مقالہ قاضی عبدالودود صاحب صفحہ ۵۳۳ تا ۵۳۵ بحوالہ مضمون،حولد بالا نوشتۂ ڈاکٹر عبدالوحید قریشی) یہ کیفیت ہے مرزا غالب کی عروض و قافیے سے واقفیت کی - اس پر ان فنون میں اُن کی مہارت ثابت کرنا مولانا حالی کی زیادتی ہے - داؤدی

۱ لطیفہ : شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب سے کسی نے پوچھا کہ مرزا صاحب کو ریاضی میں بھی کچھ دخل تھا یا نہیں ؟ آنھوں نے کہا کہ ایسا ھی دخل تھا جیسا کہ مجھے شاعری میں ہے ۱۲ -

جس زمانے میں کہ وہ خاندان تیموریہ کی تاریخ ، 'مہر نیم روز' لکھ رہے ہیں ، کسی نے ان کو مورخ سمجھ کر کچھ سوالات کیے ہیں - اس کے جواب میں لکھتے ہیں : ''میں فن تاریخ و مساحت و سیاق سے اتنا بےگانہ ہوں کہ ان فنون کو سمجھ بھی نہیں سکتا - کار پردازان دفتر شاہی خلاصۂ حالات از روئے کتب اردو میں لکھ کر میرے پاس بھیج دیتے ہیں ، میں اس کو فارسی کر کے حوالے کرتا ہوں - میرے ہاں ایک کتاب بھی نہیں ہے ، میں اسی قدر ہوں کہ نظم و نثر بقدر اپنی استعداد کے لکھ سکتا ہوں ، مورخ نہیں ہوں :

ما قصۂ سکندر و دارا نخوانده ایم
ازما بجز حکایت مہر و وفا مپرس''

خط ، شعر خوانی

مرزا کا خط نستعلیق ، شفیعا آمیز ، نہایت شیریں اور دل آویز تھا ، جیسا کہ اکثر اہل ایران کا ہوتا ہے اور باوجود خوش خطی کے نہایت زود نویس اور تیز دست تھے- شعر پڑھنے کا انداز بھی ، خاص کر مشاعروں میں ، حد سے زیادہ دل کش اور موثر تھا - میں نے غدر سے چند سال پہلے جب کہ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا ، صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو پڑھتے سنا ہے ، چونکہ ان کے پڑھنے کی باری سب کے بعد آئی تھی ، اس لیے صبح ہو گئی - مرزا نے کہا ''صاحبو ! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں -'' یہ کہہ کر اول اردو طرح کی غزل اور اس کے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پر درد آواز سے پڑھی - یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدردان نہیں پاتے ،

اور اس لیے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت ہے۔پیدا ہوگئی،

جس زمانے میں میر نظام‌الدین ممنون شاہ صاحب کے پرانے مدرسے میں مشاعرہ کرتے تھے ، ایک مشاعرے میں مرزا نے اپنا فارسی قصیدہ ''دریاگریستن'' اور ''تنہاگریستن'' جو جناب سید الشہداء کی منقبت میں انھوں نے لکھا تھا ، پڑھا ۔ سنا ہے کہ مجلس مشاعرہ بزم عزا بن گئی تھی ۔ جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے ۔ مفتی صدرالدین خاں مرحوم بھی موجود تھے ، اتفاق سے اسی حالت میں مینھہ برسنے لگا ، مفتی صاحب نے کہا ''آسمان ہم گریست ۔''

اسی قصیدے کی نسبت سید اکبر مرزا خلف الصدق ناظر سید حسین مرزا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ بندرگاہ بصرہ میں ایک جگہ مجلس عزا تھی اور بارش ہورہی تھی ؛ بانیء مجلس نے مجھ سے کہا کہ تم بھی کچھ پڑھو ۔ میرے پاس اس وقت پڑھنے کی کوئی چیز مرثیہ یا کتاب نہ تھی ۔ اسی قصیدے کے چند اشعار زبانی یاد تھے ، میں نے وہی پڑھ دیے ۔ پانچ ہی سات شعروں پر مجلس میں خوب رقت ہوئی ۔ عرب ، عجم اور ہندی سب اس مجلس میں شریک تھے ؛ مجلس کے بعد ہر ایک عجمی مجھ سے پوچھتا تھا کہ یہ اشعار کس شخص کے تھے ، خصوصاً اس شعر کی بہت تعریف کرتے تھے ۔

مزد شفاعت و صلۂ صبر و خون بہا
ہیچ از کسی نخواستہ الا گریستن

مرزا کے اخلاق و عادات و خیالات

وسعت اخلاق

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے - وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے - جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا اُس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا - دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہوجاتے تھے اور اُن کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے، اس لیے اُن کے دوست ہر ملت اور مذہب کے نہ صرف دہلی میں، بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے - جو خطوط اُنھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں اُن کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غم خواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے - ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے - اُن کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا - بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے - وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے - غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں اُن کے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ اُن کی تعمیل کرتے تھے - لوگ اُن کو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے، مگر اُن کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا - اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے - اُنھوں نے میسور کے ایک شاہزادے کو اپنی کتاب بھیجی ہے، اُس نے کتاب کی رسید لکھی ہے اور قیمت دریافت کی ہے؛

اُس کے جواب میں لکھتے ھیں : ''حرف پرسش مقدار قیمت چرا بر زبان قلم رفت؟ ۔ ھنجار نوازش نیازمندان بے نوا نہ اینست ۔ بے سرمایہ ام نہ فرمایہ ۔ سخن‌ورم نہ سوداگر ؛ موئینہ پوشم نہ کتاب فروش ۔ پزیرندۂ عطایم نہ گیرندۂ بہا ۔ ھرچہ آزادگان بہ شہزادگان فرستند نزرست ، و ھرچہ شاھزادگان بہ آزادگان بخشند تبرک ؛ بیع و شرا نیست ، چون وچرا نیست ۔ ھرچہ فرستادہ ام ارمغانست ، و ھرچہ خواھم فرستاد ارمغان خواھد بود''

مروت

مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا ۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے ، با ایں ھمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے ۔ ایک صاحب کو لکھتے ھیں: ''جہاں تک ھوسکا احباب کی خدمت بجالایا ۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا ۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے ، نہ ھاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے ۔ کہتے ھیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو بسبب کبر سن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کردی تھی، میں متوقع ھوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاح اشعار سے مجھے معاف کریں ۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ھوسکے گا ، لکھ دیا کروں گا ۔'' باوجود اس کے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رھتے تھے ۔ ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ نے بسبب ذوق سخن کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی ۔ اُس کے جواب میں لکھتے ھیں ''لاحول‌ولاقوۃ ! کس ملعون نے بسبب ذوق شعر کے

اشعار کی اصلاح منظور رکھی ؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار : میں نے تو بہ طریق 'قہر درویش بجان درویش' لکھا تھا - جیسے اچھی جورو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے -"

فراخ حوصلگی

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی، مگر حوصلہ فراخ تھا - سائل اُن کے دروازے سے خالی ھاتھ بہت کم جاتا تھا - اُن کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے اور اپاھج مرد وعورت ہر وقت پڑے رہتے تھے - غدر کے بعد اُن کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپے ماھوار کی ھوگئی تھی اور کھانے پہننے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا ، مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے ، اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے - غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں اُن کو حسب معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا - لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے - مرزا صاحب کو پہلے ھی معلوم تھا کہ انعام دینا ھرگا ، اس لیے اُنھوں نے دربار سے آتے ھی خلعت اور رقوم جواھر بازار میں فروخت کرنے کے لیے بھیج دی تھیں ؛ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب اُن کو انعام دے کر رخصت کیا -

وہ اپنے اُن دوستوں کے ساتھ جو گردش روزگار سے بگڑ گئے تھے، نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے - دلی کے عمائد میں سے ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست

تھے اور غدر کے بعد اُن کی حالت سقیم ہوگئی تھی ، ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی اُن کو مالیدہ یا جامہ وار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا غیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل اُن کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ اُن سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی ؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیں۔ انھوں نے کہا ''یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے ؛ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔'' مرزا نے کہا کہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں ، مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے، آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے ؟ پھر ادھر اُدھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدے کا نیا چغہ اُتار کر اُنھیں پہنا دیا اور اس خوب صورتی کے ساتھ وہ چغہ ان کی نذر کیا۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں ''قلندری و آزادگی وایثارو کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اُس میں شطر نجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں؛ کبھی شیراز جانکلا ، کبھی مصر میں جا ٹھہرا ، کبھی نجف جا پہنچا ؛ نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی ، جس شہر میں رہوں اُس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور ، خلق کا مردود ، بوڑھا ، ناتوان ، بیمار ، فقیر ، نکبت میں

گرفتار۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو؛ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بہ در بھیک مانگے، وہ میں ہوں۔"

جیسی مرزا کی طبیعت میں درا کی اور ذہن میں جودت اور سرعت انتقال تھی، اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا۔ ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوالیتے تھے اور اُن کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے، مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی اُن کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جس کی سند اہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے اُن کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی باد مخالف لکھی تھی اُن کو مثنوی کے علاوہ ایک ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھ کر علیحدہ بھیجی تھیں؛ چنانچہ اُنھوں نے اپنے خطوط میں اُن کو مفصل بیان کیا ہے۔ برہان قاطع پر جو کچھ اُنھوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکر شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگالیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلم بند کرلیتے تھے۔

شعر فہمی

شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے - کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ اکثر ایک سرسری نظر میں اُس کی تہہ کو پہنچ جا۔ؔ تھے - نواب مصطفیٰ خان مرحوم ''گلشن بے خار'' میں مرزا کی نسبت لکھتے ہیں ''مضامین شعری راکما ہو حقہ می فہمد ، و بجمیع نکات و لطائف پی می برد واین فضیلتی است کہ مخصوص خواص اہل سخن است - اگر طبع سخن شناس داری با یں نکتہ می رسی - چہ خوش فکر اگرچہ کم یاب ست ، اما خوش فہم کم یاب تر - خوشا حال کسیکہ از ہر دو شربے یافتہ درخطے ربودہ - بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغر گفتار کم تر مرئی شدہ -'' نواب ممدوح نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بہت بڑا ثبوت ملتا ہے - مولانا آزردہ نے ''دور نہیں'' ''حور نہیں'' اس زمین میں غزل لکھی تھی - اُس میں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا - مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سنا کر اُن سے کہا کہ ''اگرچہ بحر دوسری ہے مگر اسی ردیف وقافیے میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے - جس کا مطلع یہ ہے :

عشق عصیانست اگر مستور نیست
کشتۂ جرم زبان مغفور نیست

ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین میں جس میں ہماری غزل ہے اُردو غزل لکھتا تو اس کا مطلع اس طرح ہوتا :

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں
کشتۂ جرم زبان ناجی و مغفور نہیں

آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اس کے کہ قائل کا نام لیا جائے اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اُردو ترجمہ (جو اُوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں اور پوچھیں کہ کون سا مطلع اچھا ہے ۔'' چونکہ نظیری کا مطلع اُردو ترجمے سے بہت پست ہوگیا تھا، سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کریں گے اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دیں گے ۔ چنانچہ مولانا اور نواب صاحب اور بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہنچے ۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اُردو کے دو مطلع ہیں، ان میں آپ محاکمہ کیجئے کہ کون سا مطلع اچھا ہے؛ اور بطور بیٹھن کے اول نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا ۔ ابھی مولانا اپنامطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اُس مطلع کو سن کر سر دھنے لگے اور متحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا ؟ اور اس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ اُمید نہ رہی کہ اس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملے گی ۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اُٹھے ۔

کتاب فہمی

مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور اُن کو خوب سمجھتے تھے ۔ نواب ممدوح فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا، مطالعہ کررہا تھا اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا ۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آنکلے ۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا، انھوں نے کسی قدر غور کے بعد اُس کا

مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے ۔

حسن بیان اور ظرافت

مرزا کی تقریر میں اُن کی تحریر اور ان کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ اُن سے ملنے اور اُن کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے ۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے ، مگر جو کچھ اُن کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا ۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر اُن کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے ۔ حسن بیان ، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا اُن کی خصوصیات میں سے تھا ۔

لطیفہ

ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے ؛ بادشاہ نے پوچھا ''مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟'' عرض کیا ''پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا ۔'' ایک دن نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے ؛ اُن کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا ۔ جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں نواب صاحب اُن کے لینے کو کھڑے تھے ۔ مرزا نے اُن کو دیکھ کر یہ مصرع پڑھا کہ ''آب چشمۂ حیوان درون تاریکیست'' جب دیوان خانے میں پہنچے تو اُس کے دالان میں بسبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی ۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا ''این خانہ تمام آفتاب ست'' ، ایک صحبت میں مرزا میر تقی کی تعریف کر رہے تھے ؛ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے ؛

اُنھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا ''میں تو تم کو میری سمجھتا تھا، مگر اب معلوم ھوا کہ آپ سودائی ھیں۔''

لطیفہ

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اُٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اُس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا۔ اُس میں ھمیشہ فرش بچھا رھتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وھاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا، مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اُس وقت مرزا صاحب اُسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رھے تھے۔ مولانا بھی وھیں پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ھوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ھم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رھتا ھے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ھو گیا۔ مرزا نے کہا ''قبلہ! حدیث بالکل صحیح ھے، مگر آپ کو معلوم رھے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رھتا ھے، وہ یہی کوٹھری تو ھے۔''

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہ ھوتی تھی۔ اگر کوئی اُن کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف و ظرائف کی تیار ھو جاتی۔

خود داری

باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا، مگر

خودداری اور حفظ وضع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ شہر کے امراء و عمائد سے برابر کی ملاقات تھی۔ کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوادار کے نہیں نکلتے تھے۔ عمائد شہر میں سے جو لوگ اُن کے مکان پر نہیں آتے تھے وہ بھی کبھی اُن کے مکان پر نہیں جاتے تھے، اور جو شخص اُن کے مکان پر آتا تھا وہ بھی اُس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے مل کر نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے مکان پر آئے؛ میں بھی اُس وقت وہاں موجود تھا؛ نواب صاحب نے کہا "آپ مکان سے سیدھے یہیں آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟" مرزا نے کہا "مجھ کو اُن کا ایک آنا دینا تھا، اس لیے اول وہاں گیا تھا، وہاں سے یہاں آیا ہوں۔"

لطیفہ

ایک دن دیوان فضل‌اللہ خاں مرحوم چرٹ میں سوار مرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ مرزا کو معلوم ہوا تو اُنھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا مضمون یہ کہ "آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں۔" جب یہ رقعۂ دیوان جی کے پاس پہنچا، وہ نہایت شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے ملنے کو آئے۔

خوراک

مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی

چیز نہ تھی - وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے؛ یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی اُنھوں نے کھچڑی یا شولہ کبھی نہیں کھایا - اخیر میں اُن کی خوراک بہت کم ہو گئی تھی- صبح کو وہ اکثر شیرۂ بادام پیتے تھے- دن کو جو کھانا اُن کے لیے گھر میں سے آتا تھا اُس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا - ایک پیالی میں بوٹیاں، دوسری میں لعاب یا شوربا - ایک پیالی میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا- ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی، ایک اور پیالی میں دو تین پیسہ بھر دھی اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب؛ بس اس سے زیادہ اُن کی خوراک اور کچھ نہ تھی -

لطیفہ

ایک روز دوپہر کا کھانا آیا اور دستر خوان بچھا- برتن تو بہت سے تھے، مگر کھانا نہایت قلیل تھا- مرزا نے مسکرا کر کہا ''اگر برتنوں کی کثرت پر خیال کیجئے تو میرا دسترخوان یزید. کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور جو کھانے کی مقدار کو دیکھئے تو با یزید کا -،،

آموں کی رغبت

فواکہ میں آم اُن کو نہایت مرغوب تھا - آموں کی فصل میں اُن کے دوست دور دور سے اُن کے لیے عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے اور وہ خود اپنے بعضے دوستوں سے تقاضا کر کر کے آم منگواتے تھے - اُن کے فارسی مکتوبات میں ایک خط ہے جو غالباً کلکتے کے قیام کے زمانے میں اُنھوں نے امام باڑہ ھگلی بندر کے متولی صاحب کو آموں کی طلب میں لکھا ہے- اس میں لکھتے ھیں '' لختی شکم بندہ ام، و قدری ناتوان؛

هم آرائش خوان جویم، وهم آسائش جان ۔ خرد وراں دانند کہ این هر دو صفت بہ انبہ اندرست و اهل کلکتہ بر آنند کہ قلمرو انبہ هگلی بندرست ۔ آری انبہ از هگلی، و گل از گلشن؛ ایثار از جناب و سپاس از من ۔ شوق می سگالد کہ تا پایان موسم دو سہ بار بہ خاطر ولی نعمت خواهم گزشت و آنہ می نالد کہ حاشا بدیں مایہ برخورداری خورسند نخواهم گشت ۔''

لطیفہ

ایک روز مرحوم بہادرشاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں مرزا بھی تھے، باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لد رہے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آ سکتا تھا ۔ مرزا باربار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے، بادشاہ نے پوچھا ''مرزا، اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟'' مرزا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا ''پیرو مرشد، یہ جو کسی بزرگ نے کہا ھے :

''بر سر هر دانہ بنوشتہ عیان کاین فلان ابن فلان ابن فلان''

اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ھے یا نہیں ؟'' بادشاہ مسکرائے اور اسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی ۔

لطیفہ

حکیم رضی‌الدین خاں جو مرزا کے نہایت دوست تھے، ان کو آم نہیں بھاتے تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے مکان پر

برآمدے میں بیٹھے تھے اور مرزا بھی وہیں موجود تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لیے ہوئے گلی سے گزرا؛ آم کے چھلکے پڑے تھے، گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دئے۔ حکیم صاحب نے کہا ''دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔'' مرزا نے کہا ''بے شک گدھا نہیں کھاتا۔''

لطیفہ

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ اہل شہر تحفۃً بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے، باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا، مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اُس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا نے کہا ''بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں؛ میٹھا ہو اور بہت ہو۔'' سب حاضرین ہنس پڑے۔

ناؤ نوش

مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انھوں نے مقرر کرلی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اُس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اُس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ

کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا - اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت برا بھلا کہتے تھے، مگر داروغہ نہایت خیرخواہ تھا، ہرگز کنجی نہ دیتا تھا - اول تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے، دوسرے اُس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے جس سے اُس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی - چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں :

آسودہ باد خاطر غالب! کہ خوئ اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اس قدر احتیاط اور اعتدال کے اس کافر نشے کی عادت نے آخر کار مرزا کی صحت کو سخت صدمہ پہنچایا جس کی شکایت سے اُن کے تمام اردو رقعات بھرے ہوئے ہیں -

لطیفہ

مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست جن سے نہایت بے تکلفی تھی اکثر شام کو اُن کے پاس جا کر بیٹھتے تھے اور مرزا سرور کے عالم میں اُس وقت بہت پر لطف باتیں کیا کرتے تھے - ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے - میر مہدی پاؤں دابنے لگے - مرزا نے کہا ”بھئی تو سید زادہ ہے، مجھے کیوں گنہ گار کرتا ہے؟“ اُنھوں نے نہ مانا اور کہا ”آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دے دیجئے گا -“ مرزا نے کہا ”ہاں اس کا مضائقہ نہیں -“ جب وہ پیر داب چکے ، انھوں نے اجرت طلب کی - مرزا نے کہا ” بھیا

کیسی اجرت؟ تم نے میرے پاؤں دا۔ میں نے تمھارے پیسے دابے؛ برابر ہوا۔''

لطیفہ

ایک دن قبل غروب آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا اور اُن کے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا۔ مرزا نے کہا ''آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا۔'' پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ ''نواب عبدالاحد خاں کے دسترخوان پر ان کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لیے ہر قسم کے کھانے چنے جاتے تھے، مگر خاص اُن کے لیے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی؛ وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک روز اُن کے لیے مزعفر پکا تھا، وہی اُن کے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منہ لگا ہوا تھا جو اُس وقت دسترخوان پر موجود تھا۔ نواب نے اُس کو کھانا دینے کے لیے خالی رکابی طلب کی۔ اس کے آنے میں دیر ہوئی۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے۔ وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا اور کہا ''حضور اور رکابی کیا کیجئے گا، اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے'' نواب یہ فقرہ سن کر پھڑک گئے اور وہی رکابی اس کی طرف سرکا دی۔

لطیفہ

ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار

دیکھ کر بولے ''جو کام خودرائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے ۔ ستاروں کو تو دیکھو کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں؛ نہ تناسب ہے، نہ انتظام ہے، نہ بیل ہے، نہ بوٹا ہے، مگر بادشاہ خودمختار ہے؛ کوئی دم نہیں مار سکتا۱ ۔''

لطیفہ

ایک دن سید سردار مرزا مرحوم شام کو چلے آئے ۔ جب تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ جانے لگے تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمع دان لے کر کھسکتے ہوئے لب فرش تک آئے، تاکہ وہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن لیں ۔ انھوں نے کہا ''قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی، میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا ۔'' مرزا نے کہا ''میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمع دان نہیں لایا، اس لیے لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں ۔''

اگرچہ شاعری کی حیثیت سے انھوں نے شراب کی جابجا تعریف کی ہے، مگر اعتقاداً وہ اس کو بہت برا جانتے تھے اور اپنے اس فعل پر سخت نادم تھے ۔ باوجود اس کے انھوں نے کبھی اپنے اس فعل کو چھپایا نہیں ۔ شراب کے متعلق ان کی ظرافت آمیز باتیں بہت مشہور ہیں ۔ ایک

۱- مولانا حالی کا ماخذ 'آبحیات' ہے ۔ دیکھیے آبحیات کی عبارت : ''ایک دفعہ رات کو انگنائی میں بیٹھے تھے ۔ چاندنی رات تھی ۔ تارے چھٹکے ہوئے تھے ۔ آپ آسمان کو دیکھ کر فرمانے لگے کہ جو کام بے صلاح و مشورہ ہوتا ہے بے ڈھنگا ہوتا ہے ۔ خدا نے ستارے آسمان پر کسی سے مشورہ کر کے نہیں بنائے، جبھی بکھرے ہوئے ہیں؛ نہ کوئی سلسلہ، نہ زنجیر، نہ بیل، نہ بوٹا ۔'' (آبحیات، ناشر شیخ مبارک علی، لاہور، بار دوازدھم صفحہ ۵۳۰) داؤدی

شخص نے ان کے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شراب خوار کی دعا قبول نہیں ہوتی ۔ مرزا نے کہا ''بھائی جس کو شراب میسر ہے اس کو اور کیا چاہئے جس کے لیے دعا مانگے[۱] ۔''

لطیفہ

ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں :

''بے مے نکند در کف من خامہ روائی
سر دست ہوا آتش بے دود کجائی

میر مہدی! صبح کا وقت ہے ۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے ۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے ۔ دو حرف لکھتا ہوں ، ہاتھ تاپتا جاتا ہوں ۔ آگ میں گرمی سہی ، مگر وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی ، دل توانا ہو گیا ، دماغ روشن ہو گیا ۔ نفس ناطقہ کو تو اجد بہم پہنچا ، ساقئی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب!!! ہائے غضب، ہائے غضب! '' یہ خط غدر کے بعد اس زمانے میں لکھا ہے جب پنشن وغیرہ سب بند ہے اور بسبب عسرت و تنگ دستی کے کچھ پیتے پلاتے

۱- یہی لطیفہ آب حیات میں ان الفاظ میں مرقوم ہے :
''ایک صاحب نے ان کو سنانے کو کہا کہ شراب پینی سخت گناہ ہے۔ آپ نے ہنس کر کہا کہ بھلا جو پئے تو کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ادنٰی بات یہ ہے کہ دعا نہیں قبول ہوتی - مرزا نے کہا کہ آپ جانتے ہیں شراب کون پیتا ہے؟ اول تو وہ کہ ایک بوتل اولڈ ٹام کی با سامان سامنے حاضر ہو، دوسرے بے فکری ، تیسرے صحت - آپ فرمائیے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو آسے اور چاہیے کیا جس کے لیے دعا کرے؟''
(آب حیات ، ناشر شیخ مبارک علی ، لاہور ، بار دوازدھم صفحہ ۵۳۱) دیکھ لیجئے کہ یاد گار غالب اور آب حیات کی عبارتیں کس درجہ مماثل ہیں۔ داؤدی

نہیں ہیں ۔

لطیفہ

میر مہدی مجروح نے جے‌پور سے خط بھیجا ہے اور وہاں جو کسی تقریب میں کئی سو من مصری کا شربت مہانوں کے لیے کیا گیا تھا ، اس کا ذکر لکھا ہے ۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں :

''میر احمد حسین و مرزا قربان بیگ نامہ شما را خواندند و بہ ذوق شربت ہفت صد من نبات ہر دو را آب در دہن گشت ؛ سخن از بادۂ ناب نہ بود ورنہ مرا نیز دل از جا رفتی ۔''

مرزا نے غزلیات و قصائد و قطعات و رباعیات میں شراب کے متعلق جس‌قدر مضمون باندھے ہیں وہ خواجہ حافظ اور عمر خیام سے کم نہ ہوں گے ۔ یہاں ایک شعر اردو غزل کا اور ایک فارسی غزل کا اور ایک فارسی رباعی لکھی جاتی ہے :

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوء ظن ہے ساقئی کوثر کے باب میں

خجلت نگر کہ در حسناتم نیافتند
جز روزۂ درست بہ صہبا کشودۂ

رباعی

غالب بہ سخن گرچہ کسست ہم‌سر نیست
از نشۂ ہوش ہیچت اندر سر نیست
مے خواہی و مفت، نغز آن گہ بسیار!
ایں بادہ فروش ساقئی کوثر نیست

اسلام کا یقین

مرزا اسلام کی حقیت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے، مگر جیسا کہ کہا گیا ہے ''من احب شیئاً اکثر ذکرہ'' توحید وجودی ان کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو انھوں نے جس قدر اصناف سخن میں بیان کیا ہے، غالباً نظیری اور بیدل کے بعد کسی نے نہیں بیان کیا۔ مرزا کے حق میں اگر اور کچھ نہیں تو عرفی کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے:

امید هست که بے گانگئی عرفی را
بہ دوستی سخن هائی آشنا بخشند

انھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں؛ ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی (صلعم) اور اہل بیت نبی (صلعم) کی محبت، اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔ اگرچہ شاعر کے کلام سے اس کے عقائد پر استدلال نہیں ہو سکتا، مگر جو بات دل سے نکلتی ہے وہ چھپی نہیں رہتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر حکمائے اسلام نے نعیم جسمانی سے انکار کیا ہے، مرزا بھی اس کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس خیال کو اپنے شاعرانہ انداز میں متعدد جگہ ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یہی خیال ایک فارسی رباعی میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

گر دیدن زاھدان بہ جنت گستاخ
دست درازی بہ ثمر شاخ بہ شاخ
چوں نیک نظر کنی ز روئ تشبیہ
ماند بہ بہائم و علف زار فراخ

مرزا باوجودیکہ احکام ظاہری کے بہت کم پابند تھے ، لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا ۔ ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعے پر نہایت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے ، پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج اور تأسف ہوتا ہے ، مگر چونکہ طبیعت نہایت شوخ واقع ہوئی تھی ، جب کوئی گرم فقرہ سوجھ جاتا تھا پھر ان سے بغیر کہے نہیں رہا جاتا تھا ؛ خواہ اس میں ان کو کوئی کافر سمجھے یا رند مشرب کہے یا بد مذہب جانے ۔

لطیفہ

غدر کے بعد جب کہ پنشن بند تھی اور دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہ ہوئی تھی، پنڈت موتی لعل میر منشی لفٹنٹی پنجاب مرزا صاحب سے ملنے کو آئے ۔ کچھ پنشن کا ذکر چلا ؛ مرزا صاحب نے کہا ”تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہ گار ؛ پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے کس طرح مجھے باغی مسلمانوں میں شمار کیا[1] ۔“

۱۔ یہ لطیفہ آب حیات سے لیا گیا ہے اگرچہ اس کا اعتراف نہیں کیا گیا ۔ آب حیات کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے :

”غدر کے چند روز بعد پنڈت موتی لال کہ ان دنوں میں مترجم

(بقیہ صفحہ ۱۱۰ پر)

اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا، مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو وہ رسول خدا صلعم کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔ ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں یہ کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی المذہب ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہو گئی؛ چند رباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ ان میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے مجھ کو یاد رہ گئی ہے جو یہاں لکھی جاتی ہے:

رباعی

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہوئے صوفی
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

دہریت اور تصوف میں جو بون بعید (کذا) ہے، وہ ظاہر ہے۔ دہری خدا کے وجود ہی کا قائل نہیں اور صوفی صرف خدا ہی کو موجود جانتا ہے اور ما سوا کو ہیچ سمجھتا

بقیہ از صفحہ ۱۰۹

لورنمنٹ پنجاب کے تھے، صاحب چیف کمشنر پنجاب کے ساتھ دلی گیے اور حب الوطن اور محبت فن کے سبب سے مرزا صاحب کی ملاقات کی۔ ان دنوں میں پنشن بند تھی، دربار کی اجازت نہ تھی۔ مرزا بہ سبب دل شکستگی کے شکوہ شکایت سے لبریز ہو رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے کہ عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں؛ پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باغی مسلمانوں میں کس طرح شامل سمجھا۔''

(آب حیات، ناشر شیخ مبارک علی، لاہور - بار دوازدہم، صفحہ ۵۲۹) دیکھ لیجیے آب حیات اور یاد گار غالب کی عبارتوں میں کتنا فرق ہے! داؤدی

ہے - پس صوفی دھری کیوں کر ہوسکتا ہے ؟ چوتھے مصرعے کا یہ مطلب ہے کہ ماوراء النہری ، یعنی ترکستان کے لوگ متعصب سنی ہونے میں ضرب المثل ہیں ؛ یہاں تک کہ شیعہ اُن کو ناصبی اور خارجی سمجھتے ہیں - چونکہ مرزا کی اصل ماوراءالنہر سے تھی، اس لیے کہتے ہیں کہ ایک ماوراء النہری رافضی یا شیعی کیوں کر ہوسکتا ہے - جو لوگ مرزا کی طرز مزاج اور طرز کلام سے نا آشنا ہیں وہ شاید یہ سمجھیں کہ مرزا نے بادشاہ کی حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لیے اپنا مذہب غلط بیان کیا ، لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رباعیاں صرف بادشاہ کے خوش کرنے اور اہل دربار کے ہنسانے کے لیے لکھی گئی تھیں، کیوں کہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو - مرزا اکثر مواقع پر بادشاہ کے خوش کرنے کو اس قسم کے اشعار دربار میں پڑھا کرتے تھے - ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہ اور امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہورہا تھا؛ مرزا نے اُسی وقت یہ شعر انشا کرکے پڑھا :

ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب

لطیفہ

رمضان کا مہینا تھا ، ایک سنی مولوی مرزا سے ملنے کو آئے - عصر کا وقت تھا ، مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا - مولوی صاحب نے تعجب سے کہا ”کیا جناب کا روزہ نہیں ہے ؟“ مرزا نے کہا ”سنی مسلمان ہوں، چارگھڑی

دن رہے روزہ کھول لیتا ہوں[1]۔"

بہادر شاہ کا شیعہ مشہور ہونا

ایک دفعہ بہادرشاہ بہت سخت بیمار ہوئے؛ اس زمانے میں مرزا حیدر شکوہ جو اکبر شاہ کے بھتیجے اور مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے[2] تھے وہ بھی لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے اور بادشاہ کے ہاں مہمان تھے۔ اُن کا مذہب اثنا عشری تھا۔ جب بادشاہ کو کسی طرح آرام نہ ہوا، مرزا حیدر شکوہ کی صلاح سے خاک شفا دی گئی اور اس کے بعد بادشاہ کو صحت ہوگئی۔ مرزا حیدر شکوہ نے نذر مانی تھی کہ بادشاہ کو صحت ہوجائے گی تو حضرت عباس

۱۔ یہ لطیفہ حالی نے آب حیات سے اخذ کیا ہے۔ آب حیات میں اس طرح مرقوم ہے:-

"ایک مولوی صاحب جن کا مذہب سنت و الجماعت تھا۔ رمضان کے دنوں میں ملاقات کو آئے۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی، مرزا نے خدمت گار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے کہا، "حضرت غضب کرتے ہیں، رمضان میں روزے نہیں رکھتے؟" مرزا نے کہا: "سنی مسلمان ہوں چار گھڑی دن سے روزہ کھول لیا کرتا ہوں۔" (آب حیات، ناشر شیخ مبارک علی، لاہور۔ بار دوازدہم صفحہ ۵۳۰)

۲۔ یہ بالکل غلط ہے۔ مرزا حیدر شکوہ نہ تو اکبر شاہ ثانی کے بھتیجے تھے اور نہ مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے۔ مرزا حیدر شکوہ مرزا کام بخش کے بیٹے تھے اور مرزا کام بخش، مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے تھے۔ اس طرح مرزا حیدر شکوہ، مرزا سلیمان شکوہ کے بیٹے نہیں، بلکہ پوتے ہوئے۔ مرزا سلیمان شکوہ اور اکبر شاہ ثانی دونوں بھائی بھائی تھے۔ مرزا حیدر شکوہ چونکہ مرزا سلیمان شکوہ کے پوتے تھے، اس لیے اکبر شاہ ثانی کے بھی پوتے ہوئے۔ انھیں اکبر شاہ کا بھتیجا کہنا یقیناً غلطی ہے۔ اس نسبت سے اکبر شاہ ثانی کے لڑکے ابوظفر بہادر شاہ ثانی، مرزا حیدر شکوہ کے چچا ہوئے۔ مرزا حیدر شکوہ مثنوی 'شوکت حیدری' میں لکھتے ہیں:-

جناب بہادر شۂ نام دار   کہ ہم عم ما ہست و ہم شہر یار

داؤدی

کی درگاہ میں جو کہ لکھنؤ میں ہے، علم چڑھاؤں گا؛ چنانچہ انھوں نے لکھنؤ جا کر بادشاہ کو عرضداشت بھیجی کہ میرا مقدور نذر ادا کرنے کا نہیں ہے، حضور مدد فرمائیں- یہاں سے بادشاہ نے کچھ روپیہ مرزا حیدر شکوہ کو بھجوایا اور انھوں نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا جس میں اودہ کا تمام شاہی خاندان اور امراء و علما سب شریک تھے اور مجتہدالعصر کے ہاتھ سے علم چڑھوایا گیا۔

اس واقعے کے بعد یہ بات عموماً مشہور ہوگئی کہ بادشاہ شیعہ ہوگئے۔ اس شہرت کا بادشاہ کو بہت رنج ہوا اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے اس کے تدارک کے لیے کچھ رسالے شائع کرائے اور بہت سے اشتہارات کوچوں اور بازاروں میں چسپاں کرائے گیے اور بادشاہ کے حکم سے مرزا صاحب نے بھی ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس کا نام غالباً دمغ الباطل[1] رکھا گیا تھا اور جس میں بادشاہ

۱- یہ غلط ہے- مثنوی 'دمغ الباطل' کے مصنف مولوی امام بخش صہبائی ہیں؛ مرزا غالب کی مثنوی کا نام 'کلمات طیبات' ہے-

مرزا حیدر شکوہ نے بہادر شاہ ثانی کی طرف سے ۱۲- ربیع الاول ۱۲۷۰ ہجری کو حضرت عباس کی درگاہ میں مجتہدالعصر کے ذریعے وہ شاہانہ علم چڑھوایا کہ جس کے بعد دہلی میں ایک شورش پیدا ہو گئی اور بادشاہ کو اپنی شیعیت کے خلاف بیانات دینے پڑے - اس سلسلے میں مرزا غالب سے یہ مثنوی بھی لکھوائی گئی جس میں بہادر شاہ کی طرف سے شیعیت کا انکار مرقوم ہے- مرزا حیدر شکوہ نے مرزا غالب کی مثنوی کا جواب 'شوکت حیدری' کے عنوان سے دیا تھا - مرزا غالب کی مثنوی 'کلمات طیبات' کے جواب میں میردوست علی خلیل، شاگرد خواجہ آتش نے لکھنؤ سے 'مثنوی شیعیان علی در رد مثنوی جعلی دہلی' ۱۲۷۰ھ ہی میں شائع کی- خلیل کی اس مذکورہ بالا

(بقیہ صفحہ ۱۱۴ پر)

کو تشیع کے اتہام سے بری کیا گیا تھا ۔ اس مثنوی میں مرزا نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی تھی ، بلکہ جو مضامین حکیم احسن اللہ خاں نے بتائے تھے ، اُن کو فارسی میں نظم کر دیا تھا ۔

جب یہ مثنوی لکھنؤ پہنچی تو مجتہدالعصر نے مرزا سے دریافت کیا کہ آپ نے خود مذہب شیعہ اور مرزا حیدر شکوہ کی نسبت اس مثنوی میں ایسا لکھا ہے ؟ مرزا نے لکھ بھیجا کہ میں ملازم شاہی ہوں ، جو کچھ بادشاہ کا حکم ہوتا ہے اُس کی تعمیل کرتا ہوں ۔ اس مثنوی کا مضمون بادشاہ اور حکیم احسن اللہ خاں کی طرف سے اور الفاظ میری طرف سے تصور فرمائے جائیں ۔ مرزا کی طبیعت نہایت سلیم واقع ہوئی تھی ۔ باوجودیکہ تیزیٔ ذہن اور سلامتیٔ طبع دونوں ایک جگہ بہت کم جمع ہوتی ہیں ، مرزا میں یہ دونوں باتیں بوجہ اتم موجود تھیں ۔ اسی سلامتئی طبع کا اقتضا تھا کہ ابتدائے مشق سخن میں جو ٹیڑھا رستہ انھوں نے اختیار کیا تھا ، بغیر اس کے کہ کوئی استاد رہبری کرے ، جس قدر عقل و تمیز بڑھتی گئی اُسی قدر آہستہ آہستہ اُس سے انحراف ہوتا گیا اور آخرکار اساتذۂ مسلم الثبوت کی روش مستقیم پر آرہے ۔

بقیہ از صفحہ ۱۱۳
مثنوی کے جواب میں امام بخش صہبائی نے ایک اور مثنوی 'دمغ الباطل' تصنیف کی ۔ دمغ الباطل مطبع افضل المطابع دھلی سے ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوئی ۔ (دمغ الباطل کے جواب میں مفتی میر محمد عباس صاحب شوستری نے ۱۲۷۶ھ میں مثنوی 'خطاب فاصل' لکھی ۔ غرض کہ صہبائی کی تصنیف 'دمغ الباطل' کو مرزا غالب سے منسوب کرنا حالی کی زیادتی ہے ۔ داؤدی

مرزا از راہ عجز و انکسار کہا کرتے تھے کہ قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی و انوری پہنچتے ہیں، افتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں، مگر مدح و ستائش میں مجھ سے ان کا ساتھ نہیں دیا جاتا ۔ مرزا کا یہ کہنا بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ جو زور اُن کی تشبیبوں میں پایا جاتا ہے، وہ مدح میں آ کر باقی نہیں رهتا، مگر ہم اس کو ان کے نقص شاعری پر محمول نہیں کرتے، بلکہ غایت درجے کی سلامت ذہن اور استقامت طبع کی دلیل جانتے ہیں۔ جھوٹی اور بے اصل باتوں کا چمکانا، زمین اور آسمان کے قلابے ملانا اور مبالغہ و اغراق کا طوفان اٹھانا فی الحقیقت شاعر کا کمال نہیں ہے، بلکہ جس قدر اس کی طبیعت ان باتوں سے ابا کرتی ہے اسی قدر جاننا چاہئے کہ وہ شاعری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ مرزا کی ساری عمر قصیدہ گوئی اور مدح سرائی میں گزری، کیوں کہ ضرورت انسان سے سب کچھ کراتی ہے، مگر فی الحقیقت جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، اُن کو بھٹئی کرنے کا طریقہ جیسا کہ چاہئے ویسا نہیں آتا تھا۔

مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبین

اس مقام پر ہم ایک واقعہ لکھتے ہیں جس سے مرزا کی سلامتئی طبع کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے ۔ مولانا فضل حق مرحوم مرزا کے بڑے گاڑھے دوست تھے اور اُن کو فارسی زبان کا نہایت مقتدر شاعر مانتے تھے ۔ چونکہ مولانا کو وھابیوں سے سخت مخالفت تھی، انھوں نے مرزا پر نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمائش کی کہ فارسی میں وھابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو جس میں ان کے بڑے بڑے اور

مشہور عقیدوں کی تردید اور خاص کر امتناع نظیر خاتم النبیین کے مسئلے کو زیادہ شرح اور بسط کے ساتھ بیان کرو ۔ اس مسئلے میں مولانا اسماعیل شہید کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے ، ممتنع بالذات نہیں ہے ، یعنی آنحضرت کا مثل اس لیے پیدا نہیں ہوسکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے ، نہ اس لیے کہ خدا اُس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے ۔ برخلاف اس کے مولانا فضل حق کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع با الذات ہے ۔ جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کر سکتا اسی طرح خاتم النبیین کا مثل پیدا نہیں کر سکتا ۔

مرزا صاحب پر یہ فرمائش ہوئی کہ اس مسئلے پر جو رائے مولانا فضل حق کی ہے وہ فارسی نظم میں بیان کی جائے ۔ مرزا نے اول عذر کیا کہ مسائل علمی کا نظم میں بیان کرنا مشکل ہے ، مگر انہوں نے نہ مانا ۔ لاچار مرزا نے ایک مثنوی جو کہ ان کے کلیات میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے ، لکھ کر مولانا کو سنائی ۔ اُنھوں نے بے انتہا تعریف کی اور کہا کہ اگر میں فارسی شعر میں تمھاری برابر مشاق ہوتا تو بھی ایسی خوبی سے ان مطالب کو نہ ادا کرتا ، مگر جو کچھ مرزا نے مسئلۂ نظیر خاتم النبیین کے باب میں کسی قدر مولانا کی رائے کے خلاف لکھا تھا ، اس پر مولانا سخت ناراض ہوئے ۔ مرزا نے صاف صاف تو نہیں لکھا تھا کہ خدا خاتم النبیین کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے ، مگر اس مضمون کو اس پیرائے میں ظاہر کیا تھا کہ اس موجودہ عالم میں تو ایک خاتم کے سوا دوسرا خاتم پیدا نہیں ہو سکتا ، لیکن خدا قادر ہے

کہ ایسا ہی ایک اور عالم پیدا کر دے اور اُس میں خاتم النبیین کا مثل جو اس دوسرے عالم کا خاتم النبیین ہو، خلق فرمائے۔ چنانچہ اُنھوں نے اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے:

یک جہان تاہست یک خاتم بس است
قدرت حق را نہ یک عالم بس است
خواہد از ہر ذرہ آرد عالمی
ہم بود ہر عالمی را خاتمی
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینی ہم بود
کثرت ابداع عالم خوب تر؟
یا یک عالم دو خاتم خوب تر؟
در یکے عالم دو خاتم تا مجوی
صد ہزاران عالم و خاتم بگوئی

جب مرزا اول بار مثنوی لکھ کر مولانا کے پاس لائے تو مضمون مذکور اس اخیر شعر پر ختم کرکے لائے تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ "یہ تم نے کیا بکا ہے کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہو سکتے ہیں؛ نہیں، بلکہ اگر لاکھ عالم خدا پیدا کرے تو بھی خاتم النبییں ایک ہی ہوگا۔ پس اس مضمون کو مثنوی میں سے بالکل نکال ڈالو اور جس طرح میں کہتا ہوں اُس طرح بیان کرو۔" مرزا کو نہ وہابیوں سے کچھ خصومت تھی اور نہ ان کے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا، بلکہ صرف دوست کی رضا جوئی مقصود تھی۔ انھوں نے مولانا کے حکم کی فوراً تعمیل کی۔ جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے اُس کو تو اسی طرح رہنے دیا،

مگر اُس کے آگے چند اشعار اور اضافہ کر کے کلام کو اس طرح مربوط کر دیا:

غالب این اندیشہ نہ پزیرم همی
خردہ هم بر خویش می گیرم همی
ای کہ ختم‌المرسلینش خواندۂ
دانم از روئی یقینش خواندۂ
این الف لامی کہ استغراق راست
حکم ناطق معنی اطلاق راست
منشاءِ ایجاد هر عالم یکی ست
گر دو صد عالم بود خاتم یکی ست

اس کے بعد اسی مضمون کو اور زیادہ پھیلایا ہے اور پھر مثنوی کو ان دو شعروں پر جن میں نظیر خاتم‌النبیین کے ممتنع بالذات ہونے کی تصریح ہے ختم کر دیا ہے:

منفرد اندر کمال ذاتی است لا جرم مثلش محال ذاتی است
زین عقیدت بر نگردم والسلام نامہ را در می نوردم والسّلام

اوپر کے بیان سے ناظرین کو معلوم ہوا ہوگا کہ مرزا کی طبیعت میں کس قدر سلامت روی تھی اور اعوجاج سے کس قدر اُن کا ذہن ابا کرتا تھا۔ باوجودیکہ مولانا فضل حق نے اُس مسئلے کے متعلق جو کچھ ان کی رائے تھی، مرزا کے خوب ذہن نشین کر دی تھی اور مرزا اُس کو اپنی مثنوی میں بیان کرنا چاہتے تھے، مگر جس طرح ایک ٹیڑھی چیز نلکی میں آ کر سیدھی ہو جاتی ہے، اسی طرح مرزا کی راست بیانی نے اُس ٹیڑھی رائے کے تمام بل نکال ڈالے اور بغیر اس کے کہ مرزا کو وہابیوں کی حمایت منظور ہو، جو

ٹھیک بات تھی وہ ان کے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑی۔ پھر اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا کے جبر سے لکھا ہے، اس کو مرزا کے اصلی خیالات سے کچھ تعلق نہیں ۔

داد سخن

ہماری سوسائٹی میں جو ایک عام دستور ہے کہ جو شخص اپنا کلام سناتا ہے اُس کے ہر ایک شعر پر خواہ اچھا ہو، خواہ برا، برابر تحسین و آفرین کی جاتی ہے اور اچھے اور برے شعروں میں کچھ تمیز نہیں کی جاتی؛ مرزا کی عادت بالکل اس کے خلاف تھی ۔ کوئی کیسا ہی معزز و محترم آدمی ہو، جب تک اس کا کوئی شعر فی‌الواقع مرزا کو پسند نہ آتا تھا، وہ ہرگز اس کی تعریف نہ کرتے تھے ۔ اخیر عمر میں تو اُن کا ثقل سماعت انتہا کو پہنچ گیا تھا، مگر پہلے ایسا حال نہ تھا ۔ وہ کسی قدر اونچی آواز سے بات‌چیت اور شعر و سخن سن لیتے تھے ، مگر جب تک کوئی شعر اُن کے دل میں نہ چبھتا تھا ٹس سے مس نہ ہوتے تھے ۔ اُن کے بعض معاصرین اس بات سے آزردہ رہتے تھے اور اسی لیے اُن کی شاعری پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، مگر مرزا باوجودیکہ ان کی طبیعت نہایت صلح جو واقع ہوئی تھی، شعر کی داد دینے کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا تھا اُس کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے ؛ لیکن جو شعر اُن کے دل میں چبھ جاتا تھا، اُس کی تعریف ایسی کرتے تھے جو مبالغے کی حد کو پہنچ جاتی تھی ۔ وہ درحقیقت کسی کے خوش کرنے کے لیے ایسا نہیں کرتے تھے ، بلکہ ذوق سخن اُن کو بے اختیار کر دیتا تھا ۔ شیخ ابراہیم ذوق جن کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو اُن سے چشمک تھی، ایک روز جب

کہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے، منشی غلام علی خاں مرحوم نے اُن کا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سنانے کو پڑھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خان مرحوم کہتے تھے کہ مرزا کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی؛ فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ سے کہا ''بھیا تم نے کیا پڑھا؟'' میں نے پھر وہ شعر پڑھا، پوچھا ''کس کا شعر ہے؟'' میں نے کہا ذوق کا۔ یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اُردو خطوں میں اس شعر کا جا بہ جا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔ اسی طرح مومن خاں کا جب یہ شعر سنا:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اس کی بہت تعریف کی اور یہ کہا ''کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔'' اس شعر کو بھی اُنھوں نے اپنے متعدد خطوں میں نقل کیا ہے۔ اسی طرح سودا کا یہ شعر بھی ایک مقام پر لکھا ہے!

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا

ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے:

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
''اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے''

بعض اوقات وہ اپنے شاگردوں کے کلام سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ ان کی تعریف میں، شاید ان کا دل بڑھانے کو، حد سے زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔ انھوں نے اخیر عمر میں اپنے ایک شاگرد کی غزل دیکھ کر اس کی بے انتہا تعریف کی اور یہ کہا کہ ''اگر اب میں رشک کے قابل ہوتا تو تم محسود ہوتے اور میں حاسد۔''

تقریظ لکھنے کا ڈھنگ

مرزا پر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں اور جیسا کہ ظاہر ہے تعریف کی مستحق فی الحقیقت بہت ہی کم کتابیں ہوتی ہیں۔ مرزا کی طبیعت چونکہ صلح جو اور مرنج و مرنجان واقع ہوئی تھی، وہ کسی سے انکار تو نہیں کرتے تھے، مگر تقریظ نگاری کا انھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف بھی نہ ہو اور صاحب کتاب خوش بھی ہو جائے۔ بہت سا حصہ تمہید میں یا مصنف کی ذات اور اس کے اخلاق یا اس کی محبت اور دوستی کے بیان میں یا اور لطیف یا پاکیزہ باتوں کے ذکر میں جو بے محل ہوں، ختم ہو جاتا تھا۔ اخیر میں کتاب کی نسبت چند جملے جو اصلیت سے خالی نہ ہوتے تھے اور مصنف کے خوش کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے، لکھ دیتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ مرزا سے شکایت کرتے تھے کہ آپ نے ستایش میں مضائقہ کیا ہے۔

تقریظ دیوان تفتہ

جب مرزا نے منشی ہرگوپال تفتہ کے دیوان کی تقریظ

جو کلیات نثر غالب میں موجود ہے، لکھ کر بھیجی تو انھوں نے بھی اسی قسم کی شکایت کی تھی۔ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں ''کیا کروں، اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کردوں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم‌تر؛ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفٰی خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم‌الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ انطباع دیوان حافظ کی 'جان جاکوب بہادر' کی فرمائش سے لکھی ہے، اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی نثر میں اور ہی مطالب ہیں۔ واللہ باللہ اگر کسی شاھزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدل کر اس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھئی میری روش نہیں۔ ظاھرا تم خود فکر نہیں کرتے، اور حضرات کے بہکانے میں آ جاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیشتر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے، کس واسطے کہ ان کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ قتیل کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے!''

تقریظ تصحیح آئین اکبری

سر سید احمد خاں نے جب نہایت جاں فشانی اور عرق ریزی سے آئین اکبری کی تصحیح کی تو دلی کے مشاہیر نے اس پر نثر میں تقریظیں لکھی تھیں اور مرزا نے نظم میں ایک مثنوی لکھی تھی جو ان کے کلیات میں موجود ہے۔ باوجودیکہ مرزا کو سرسید کی خاطر بہت عزیز تھی اور وہ ان سے اور ان کے خاندان سے مثل یگانوں[1] کے ملتے تھے، مگر چونکہ مرزا ابوالفضل کی طرز تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے اور جو آئین اس کتاب میں لکھے ہیں، ان کو اس زمانے کے آئینوں کے مقابلے میں ہیچ و پوچ سمجھتے تھے اور تاریخ کا مذاق جیسا کہ خود انھوں نے اعتراف کیا ہے، بالکل نہ رکھتے تھے، اس لیے آئین اکبری کی تصحیح کو انھوں نے ایک فضول کام سمجھا۔ گو ان کی یہ رائے غلط ہو یا صحیح، مگر جو کچھ آئین اکبری اور اس کی تصحیح کی نسبت ان کا خیال تھا، اس کو تقریظ میں ظاہر کیے بغیر نہیں رہے۔ چنانچہ اس مثنوی کے اول کے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

مژدہ یاران را کہ این دیرین کتاب
یافت از اقبال سید فتح باب
دیدہ بینا آمد و بازو قوی
کہنگی پوشید تشریف نوی
وین کہ در تصحیح آئین رائی اوست
ننگ و عار ہمت والائے اوست

---

۱ - مرزا آثارالصنادید کی تقریظ میں سر سید کی نسبت لکھتے ہیں - ''باھمگنانش دلیست از فرزانگی بایں مردی دانا دیا منش پیماں مہریست از دلنشینی بہ پیوند خون مانا''

دل به شغلی بست و خود را شاد کرد
خود مبارک[1] بندۂ آزاد کرد
گوهرش را آن که نه تواند ستود
هم بدین کارش همی داند ستود
بر چنین کاری که اصلش این بود
آن ستاید کش ریا آئین بود
من که آئین ریا را دشمنم
در وفا اندازه دان خود منم
گر بدیس کارش نه گویم آفرین
جای آن دارد که جویم آفرین

اس کے بعد انگریزوں کے آئین و قانون و ایجادات کسی قدر بیان کیے ھیں اور لکھا ھے کہ ان چیزوں کے سامنے پچھلے آئین سب تقویم پارینہ ہوگئے ھیں۔ اس کے بعد لکھتے ھیں:

طرز تحریرش اگر گوئی خوش ست
نی فزون از هرچه می جوئی خوش ست
هرخوشی را خوش‌تری هم بوده است
گر سری هست افسری هم بوده است
مبداء فیاض را مشمر بخیل
نوز[2] می[3] ریزد رطب ها زآں نخیل
مرده پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کان نیز جز گفتار نیست
غالب آئین خموشی دل کش ست
ترچه خوش گفتی نه گفتن هم خوش ست

۱- 'مبارک بندہ آزاد کردن' عبث کام کرنے کو کہتے ھیں۔ اس میں لطف یہ ھے کہ ابوالفضل کے باپ کا نام مبارک تھا۔
۲ - ھنوز۔
۳- یہ اپنی شاعری اور انشاپردازی کی طرف اشارہ ھے۔

در جہان سید پرستی دین تست
از ثنا بگزر دعا آئین تست
این سراپا فره و فرهنگ را
سید احمد خان عارف جنگ را
هرچه خواهد از خدا موجود باد
پیش کاوش طالع مسعود باد

چونکہ اس تقریظ میں آئین اکبری کی تنقیص کی گئی تھی اور سر سید نے جو ایک نہایت مفید کام کیا تھا اس کی کچھ داد نہیں دی گئی تھی، بلکہ اس کو غیر مفید ظاہر کیا گیا تھا ، اس لیے انھوں نے آئین اکبری کے آخر میں مرزا کی تقریظ کو نہیں چھپوایا ۔

محققانہ نظر

مرزا کی درّاکی اور عالی فطرتی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ باوجودیکہ ایسی سوسائٹی میں گھرے ہوئے تھے جس میں سلطنت کی تقلید سے ایک قدم تجاوز کرنا ناجائز سمجھا جاتا تھا ، اپنے فن میں محققانہ چال چلتے تھے ؛ اندھا دھند اگلوں کی تقلید ہرگز نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جامع برہان قاطع کی شہرت اور ناموری ان کو اس کا تخطیہ کرنے سے مانع نہیں ہوئی ۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں : ''یزدان دل دانا و چشم بینا بهر آن داده است که کار دانش و بینش ازین هر دو گوهر بر فرگیریم و هرچه بنگریم جز به دستوری دانش آن را نه پزیریم ۔ استادی و شاگردی پیری و مریدی نیست که انتها اعتقاد بس باشد و بدین کلمۂ مشهور که پیر من خس است و اعتقاد من بس است

از باز پرس ایمنی روئے دہد۔'' حالانکہ وہ ایران کے نامور شعراء کا نہایت ادب کرتے تھے اور ان کا ذکر ہمیشہ تعظیم اور احترام کے ساتھ کرتے تھے، پھر بھی اندھوں کی طرح ان کی تقلید نہ کرتے تھے۔ جو امور سماع اور نقل سے علاقہ رکھتے تھے ان میں ان کے کلام کو بے چون و چرا تسلیم کرتے تھے، مگر جو باتیں عقل اور درایت سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں ان کی تقلید کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ ایک خط میں حزیں کا، جس کو وہ بہت بڑا استاد جانتے تھے، یہ مطلع نقل کرتے ہین:

ز ترکتازی آن نازنین سوار ہنوز
ز سبزہ می‌دمد انگشت زینہار ہنوز

پھر لکھتے ہیں کہ ''اس مطلع میں ایک ہنوز زائد اور بیہودہ ہے، تتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے، اس کی کون پیروی کرے گا؟ حزیں تو آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔'' ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں۔ ''یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے وہ حق ہے، کیا اس وقت آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے۔''

حق پسندی

مرزا کے کلام پر اگر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا تھا یا کوئی عمدہ تصرف اُن کے شعر میں کرتا تھا اس کو فوراً تسلیم کرلیتے تھے اور شعر کو بدل ڈالتے تھے۔ مثنوی ''درد و داغ'' میں ان کا ایک مصرعہ تھا ''خوک شد و پنجہ

زدن ساز کرد،، جب مرزا نے یہ مثنوی تحفۃً ناطق مکرانی کو بھیجی تو اُس نے مرزا کو لکھا ''خوک سم دارد نہ پنجہ اگر نزدیک اساتذہ اطلاق سم و پنجہ بیک محل روا باشد اعلام باید فرمود۔،، مرزا نے اس کے جواب میں صاف لکھ بھیجا کہ ''اگر کلیات فارسی کے چھپنے سے پہلے آپ کا خط پہنچ جاتا تو میں اس لفظ کو بدل ڈالتا اور اس مصرعے کو یوں بنا دیتا ''خوک شد و بدنفسی ساز کرد۔،، چنانچہ جب مرزا کا کلام دوسری بار چھپا تو انھوں نے یہ مصرع اسی طرح بنا دیا۔ مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا یہ شعر ہے:

همچنان در تتق غیب ثبوتے دارند
بو جودے کہ ندارند ز خارج اعیان

مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے ثبوتے کی جگہ نمودے لکھا تھا؛ مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انھوں نے کہا کہ اعیان ثابتہ کے لیے نمود کا لفظ نامناسب ہے۔ اس کی جگہ ثبوت بنا دو۔ چنانچہ طبع ثانی میں انھوں نے بجائے نمود کے ثبوت بنا دیا ہے۔ اسی طرح ایک قصیدے کے مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے ''عیداضحیٰ بسر آغاز زمستاں آمد،، مرزا نے اول عید قرباں لکھا تھا، پھر نواب مصطفے خان مرحوم کے کہنے سے عیداضحیٰ بنا دیا گیا، حالانکہ نواب موصوف خود مرزا سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور مومن خاں مرحوم کے بعد ہمیشہ انہیں کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔

ان باتوں کے بیان کرنے سے مرزا کی لغزشیں خلقت کو دکھانی مقصود نہیں، بلکہ انصاف اور حق پسندی کی شریف خصلت اور وہ ملکہ جس کے بغیر انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا، مرزا کی ذات میں دکھانا مقصود ہے۔ جن

لوگوں میں اپنی غلطی تسلیم کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی ان کا اپنے فن میں ترقی کرنا ناممکن ہے۔

راست گفتاری

حالانکہ ایشیائی شاعری جس کی بنیاد جھوٹ اور مبالغے پر رکھی گئی ہے، مرزا کی رگ وپے میں سرایت کر گئی تھی باوجود اس کے وہ روایت اور حکایت اور وعدہ و اقرار اور بات چیت میں نہایت راست گفتار اور صادق اللہجہ تھے، اسی لیے جو شخص اُن کے وعدے یا اقرار کا یقین نہ کرتا تھا، اُس سے نہایت ناراض ہوتے تھے۔ تفضل حسین خان مرحوم خلف دیوان فضل اللہ خان سے مرزا نے اپنا دیوان مانگا ہے اور اقرار کیا ہے کہ میں اُس کو دیکھ کر واپس بھیج دوں گا۔ انھوں نے دیوان کے دینے سے انکار کیا ہے۔ اُن کے انکار کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں ''کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و استادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے؟ میرا کلام! خرید آٹھ دس روپے کی! سووہ بھی میں یہ نہیں کہتا کہ ہ کو دے ڈالو۔ تم کو مبارک رہے۔ مجھ کو مستعار دو۔ میں اس کو دیکھ لوں۔ جو میرے پاس نہیں ہے اُس کی نقل کر لوں، پھر تم کو واپس بھیج دوں۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو، میرا اعتبار نہیں یا یہ کہ مجھ کو آزار دینا اور ستانا بہ دل منظور ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دے دو، واللہ باللہ میں اس میں سے جو میرے پاس نہیں ہے، نقل کر کے بھیج دوں گا۔ اگر تم کو واپس نہ دوں تو

مجھ پر لعنت اور اگر تم میری قسم کو نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ نہ کو دو تو تم کو آفرین۔''

اسی طرح ایک خط میں نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں :

''بہ دست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا، مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کون سی رباعیات مانگتے ہو، پھر لکھتے ہو رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج۔ معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے، اب کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، استاد کی قسم نہ میرے پاس وہ قصیدہ نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔ کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں

برہانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود''

مرزا کی اسی راست بازی کا سبب تھا کہ وہ کوئی کام چھپا کر نہیں کرتے تھے۔ جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا؛ جو خلوت میں کرتے تھے وہی جلوت میں بھی کرتے تھے۔ پس اگر ان میں کوئی عیب تھا تو وہی تھا جس کو ہر کس و ناکس جانتا تھا؛ مخفی عیبوں سے وہ بالکل پاک تھے۔

نا قدردانی کی شکایت

وہ اس خیال سے کہ ان کے کلام کی قدر کرنے والے بہت کم تھے، اکثر تنگ دل رہتے تھے۔ چنانچہ اس بات کی انھوں نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں جابجا شکایت کی ہے۔ ایک روز قلعے سے سیدھے نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر آئے

اور کہنے لگے کہ "آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی فرمائی۔ عید کی مبارک باد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا؛ جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ مرزا تم پڑھتے بہت خوب ہو۔" اس کے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانے کی ناقدردانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے "مہر نیم‌روز"، میں اس مضمون کو کہ میں نے اپنا کمال شاعری محض نا قدردانوں کی مدح سرائی میں صرف کیا، وہ ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں: "سینۂ من نفسی داشت به روان آسائی نسیمی که از نسترن زار و زد، زیان زده من که دم جز به نا بایست نه زدم۔ بنان مرا قلمی بود به دجله باری ابری که از قبیله خیزد، بیهده گوش من که باران بشوره زار فرو ریختم" یہی وجہ تھی کہ جب حسن اتفاق سے اُن کو کوئی سخن سنج اور سخن فہم میسر آ جاتا تھا تو اُس کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر تخلص جو ایک زمانے میں کول میں سررشتہ دار تھے اور جن کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی بڑے بڑے لوگوں سے تعریف سنی گئی ہے۔ کہیں وہ دلی میں آئے ہیں اور مرزا کے مکان پر ٹھہرے ہیں۔ اُن کی نسبت منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں جس کا ما حصل یہ ہے کہ "خدا نے میری بے کسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا۔ اُس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی، جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی، دیکھی۔

میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجے کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے! حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں، مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہم کس کو کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کئے، آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہم سخن اور ذوق معنی کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو، میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں؛ اور اس نعمت پر دنیا سے قانع۔،،

اپنے عجز کا اقرار

مرزا پر جب شعر کے متعلق کوئی ایسی فرمائش کی جاتی تھی جو اُن سے بآسانی سرانجام نہ ہو سکتی تھی تو وہ اس بات کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ میری شاعری کی شہرت و ناموری پر حرف آئے گا، بلکہ صاف لکھ بھیجتے تھے کہ میری طاقت سے باہر ہے۔ ایک بار غالباً مجتہدالعصر سید محمد صاحب مرحوم و مغفور نے مرزا سے اس بات کی خواہش کی کہ اُردو میں جناب سیدالشہدا کا مرثیہ لکھیں۔ چونکہ مرزا اُن کی بہت تعظیم کرتے تھے اور اُن کے سوال کو رد کرنا نہیں چاہتے تھے، اُن کے حکم کی تعمیل کے لیے مرثیہ لکھنے بیٹھے۔ چونکہ اس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا اور فرمائش ایسی چیز کی ہوئی تھی جس کو اور لوگ حد

کمال تک پہنچا چکے تھے اور قویٰ میں انحطاط شروع ہو گیا تھا، مشکل سے مسدس کے تین بند لکھے جن میں سے پہلا بند ہم کو یاد ہے اور یہاں نقل کیا جاتا ہے:

ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو
اے دجلۂ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لب عیسیٰ پہ فغاں ہو
اے ماتمیان شہ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

ایک یہ اور دو بند اور لکھ کر مجتہد العصر کی خدمت میں بھیج دیے اور صاف لکھ بھیجا کہ ''یہ تین بند صرف امتثال امر کے لیے لکھے ہیں ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ یہ اُن لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں۔ مجھ کو اُن کے درجے تک پہنچنے کے لیے ایک دوسری عمر درکار ہے۔ پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے'' اُن کا قول تھا کہ ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔

لطیفہ

بعض اوقات ایسی فرمائشوں سے جن کے سرانجام کرنے میں ان کو دقّت اٹھانی پڑتی تھی، بڑے لطف کے ساتھ پہلو بچاتے تھے۔ یہ بات معلوم ہے کہ مادۂ تاریخ نکالنے سے وہ ہمیشہ گھبراتے تھے۔ ایک بار نواب علاؤالدین خاں مرحوم نے اپنے لڑکے کی ولادت کی تاریخ اور اس کے تاریخی نام کی

فرمائش کی ۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں ''شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریق صیدافگنی سکھاتا ہے، جب جوان ہوجاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں ۔ تم سخن‌ور ہوگئے، حسن طبع خدا داد رکھتے ہو، ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکالو؟ کہ مجھ پیر غم زدہ دل مردہ کو تکلیف دو ۔ علاؤالدین خاں تیری جان کی قسم! میں نے پہلے لڑکے کا جو اسم تاریخی نظم کردیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا ۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میرے نحوست طالع کی تاثیر تھی ۔ میرا ممدوح جیتا نہیں ۔ نصیرالدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے ۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے ۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گیے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا ۔ نا صاحب دہائی خدا کی! میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا ۔''

ھجو نہ لکھنا

باوجودیکہ مرزا کی تمام عمر قصیدہ گوئی اور مدح و سرائی میں گزری اور اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ مدح و ستائش کا صلہ اُن کو کچھ نہیں ملا اور جو محنت وکاوش اُن کو قصیدوں کی ترتیب میں کرنی پڑی وہ سب رائگاں گئی، مگر انھوں نے کسی کی ھجو میں کوئی قطعہ یا قصیدہ کبھی نہیں لکھا[1] ۔ صرف ایک قطعہ جو مرزا کے مطبوعہ

۱۔ کلیات نظم غالب میں قطعات نمبر ۱۲، ۱۳، ۱۴، اور ۱۶ کو ھجویہ قطعات نہ کہیں گےتو اور کیا کہیں گے؟ داؤدی

کلیات میں درج نہیں ہے[1]، ہم کو اُن کے قلمی مسودات میں دستیاب ہوا ہے جو میرے دوست اور مرزا صاحب کے عزیز شاگرد لالہ بہاری لال مشتاق دھلوی نے اس کتاب کے لکھتے وقت میرے پاس بھیجے ہیں ۔ اس قطعے کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے ایک امیر کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ مع عرضداشت کے ارسال کیا ہے اور اس کا جواب مدت دراز تک مرزا کو نہیں ملا ؛ تب مرزا نے بطور تقاضے کے یہ قطعہ بھیجا ہے جس کو مشکل سے ہجو ملیح کہا جاسکتا ہے ۔ چونکہ اس قطعے کا مضمون لطف سے خالی نہیں ہے، ہم اول اس کا خلاصہ اُردو زبان میں لکھتے ہیں ، اس کے بعد قطعہ بجنسہ نقل کیا جائے گا ۔

قطعے کا ما حصل یہ ہے کہ میں نے عقل سے پوچھا کہ میں ۔ ' ایسا اور ایسا قصیدہ نواب کی خدمت میں بھیجا تھا اور اس کے ساتھ عرضداشت بھی گزرانی تھی ، پھر کیا سبب ہے کہ جواب عنایت نہیں ہوا ؟ کیا نواب مجھ سے آزردہ ہوگیا ؟ اگر یہ بات ہے تو میں نے ناحق تعریف لکھی ۔ خدا جانے میں نے کیا لکھ دیا ہوگا جس پر نواب کو آزردگی ہوئی ۔ عقل نے کہا تو کیوں گھبراتا ہے ۔ نواب جس ساز و سامان کے ساتھ صلہ بھیجنا چاھتا ہے وہ جلدی فراہم نہیں ہوسکتا ۔ اُس نے بہت دن سے حکم دے رکھا ہے کہ دمشق سے دیبا ، روم

۱۔ یہ قطعہ واقعی 'کلیات نظم غالب' میں تو موجود نہیں ہے۔ لیکن کلیات نظم کے بعد غالب کا جو متفرق کلام دستیاب ہو سکا تھا وہ غالب کی زندگی ھی میں 'سبد چین' کی شکل میں شائع ہو گیا تھا ۔ یہ قطعہ 'سبد چین' میں موجود ہے ۔ یہ قطعہ نواب وزیرالدولہ فرماں روائے ٹونک کے لیے لکھا گیا تھا ۔ داؤدی

سے مخمل ، معدن سے الماس ، کان سے سونا ، دکن سے ہاتھی ، پہاڑ سے زمرد ، عراق سے گھوڑا ، دریا سے موتی ، نیشاپور سے فیروزہ ، بدخشاں سے یاقوت ، بغداد سے سانڈنی ، اصفہان سے تلوار ، کشمیر سے پشمینہ ، ایران سے زربفت ، یہ سب چیزیں فراہم کرکے لائیں تب غالب کو صلہ بھیجا جائے پس جب کہ یہ ساری ڈھیل اس وجہ سے ہے تو اس کو نواب کی آزردگی کی دلیل نہ سمجھنا چاہیے۔ جب عقل نے مجھ کو یہ دم دیا تو میری تمام یاس و ناامیدی امید کے ساتھ بدل گئی۔ میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ جب ممدوح میرے لیے یہ کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اس کے لیے آئینہ اور تاج سکندر سے ، انگشتری اور تخت سلیمان سے ، جام جمشید عالم غیب سے ، آب حیواں چشمۂ خضر سے ؛ عمر ابد، نشاط جاوید ، دل کی قوت ، ایمان کی مضبوطی اپنے خدا سے ، اور اپنی عرضی کا جواب اور قصیدے کا صلہ ممدوح سے کیوں نہ مانگوں !

قطعہ

گفتم بخرد بخلوت انس
کای شمع و چراغ هفت ایوان
آیا ز چه رو بود که نواب
ننوشت جواب نامه ام ، هان !
آن گونه عریضه که دانی
درویش نوشته سوی سلطان
آن گونه قصیدهٔ که گوئی
از صفحه دمیده سنبلستان

این هردو رسید و نیست پیدا
زان سو اثری بهیچ عنوان
رنجید مگر ز مدح نواب
اے کاش نه گشتمی ثنا خوان!
هیهات چه گفته ام که باشم
از گفتهٔ خویشتن پشیمان
عقلم بجواب گفت ''غالب!
زنهار مخور فریب شیطان
نواب بفکر ارمغان ست
تا نامه فرستدت بسامان
وآنها که بخاطرش گزشته است
زود آن همه جمع کرد نتوان
زودست که جمع نیز گردد
دیرست که داده است فرمان
تا راه روان بحروبر گرد
آرند بکوشش فراوان
دیبا ز دمشق و مخمل از روم
الماس ز معدن و زر از کان
فیل از دکن و زمرد از کوه
توسن ز عراق و در ز عمان
فیروزهٔ نغز از نشاپور
یاقوت گزیده از بدخشان
جمازهٔ تیزرو ز بغداد
شمشیر برنده از صفاهان
پشمینهٔ قیمتی ز کشمیر
زر بفت گران بها ز ایران

بالجملہ درنگ چون ازین روست
بر رنج و ملال نیست برهان
چون پیر خرد بہ دل فریبی
گفت این همہ راز هائی پنهان
گشتم بدم امید واری
مرهم نہ زخم یاس و حرمان
گفتم کہ چوبامن این کرم کرد
آن قبلۂ و قبلہ گاہ اعیان
ناچار ز راہ حق گزاری
تا کردہ شود تلافئی آن
من نیز طلب کنم برایش
این خواهش اگرچہ نیست آسان
آئینۂ و تاج از سکندر
انگشتر و تخت از سلیمان
از عالم غیب جام جمشید
ازچشمۂ خضر آب حیوان
عمر ابد و نشاط جاوید
نیروئی دل و ثبات ایمان
توفیق جواب نامۂ خویش
توقیع عطا و بدل و احسان

خانگی تعلقات

مرزا کی بی بی جو الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں ، وہ نہایت متقی ، پرہیزگار اور نماز روزے کی سخت پابند تھیں - جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالات تھے اُسی قدر اُن کی بی بی احکام مذہبی کی پابند تھیں ،

یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور شوہر کے الگ رہتے تھے۔ بااین ہمہ بی بی شوہر کی خدمت گزاری اور خبر گیری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے، مگر اُن کے کھانے اور دوا، ٹھنڈائی اور جڑاول وغیرہ کا انتظام سب گھر میں سے ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقت معیّن پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے اور بی بی اور ان کے تمام رشتے داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے تھے اور اپنی جان سے بڑھ کر اُن کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا، مگر چونکہ شوخی اور ظرافت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، اُن کی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔

لطیفہ

کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں؛ اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اُس کے جواب میں لکھتے ہیں ''امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ!!! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اُس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں

کو میں پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔" وہ ہمیشہ تعلقات خانگی کو جداً یا ہزلاً ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے۔

لطیفہ

جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا تھا۔ طوطا سردی کے سبب پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا "میاں مٹھو! نہ تمھارے جورو نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہو؟"

لطیفہ

ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان خود دیکھ کر آئے۔ اس کا دیوان خانہ تو پسند آ گیا، مگر محل سرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آ کر اس کے دیکھنے کے لیے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھ کر آئیں تو ان سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا "اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔" مرزا نے کہا "کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟" یہاں مرزا کا ایک قطعہ اور ایک رباعی مقتضائے مقام کے موافق لکھی جاتی ہے:

قطعہ

گیر کہ در روز حشر چون تو بیفتی
بر سر دوزخ نہند تیرہ نہنبن[1]
لیک نہ باشد در آن مضیق مصیبت
درطلب نان و جامہ کشمکش از زن

۱- سرپوش-

لیک نہ باشد در آن مقام صعوبت
شور تقاضائے ناروائے مہاجن

رباعی

ای آنکہ براہ کعبہ روی داری
دانم کہ گزیدہ آرزوئ داری
زیں گونہ کہ تند می خرامی۔ دانم
در خانہ زنے ستیزہ خوئ داری

لطیفہ

مرزا اپنی شوخ طبع کے ہاتھ سے مجبور تھے اور کسی موقع پر خوش طبعی کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش خاں معروف، جن کے تقدس اور بزرگی کے سبب آن کے بڑے بھائی زانوئے ادب تہ کر کے آن کے سامنے بیٹھتے تھے اور جو مرزا کے خسر ہونے کے سبب آن کے قبلہ و کعبہ تھے، آن کے آگے بھی مرزا اپنی شوخی سے باز نہ آتے تھے۔ وہ لوگوں کو مرید بھی کیا کرتے تھے اور جب بہت سے مرید ہو جاتے تھے تو آن کو اپنے سلسلے کے تمام مشائخ کا شجرہ لکھوا کر ایک ایک کاپی سب کو تقسیم کیا کرتے تھے۔ آنھوں نے مرزا کو شجرہ دیا کہ اس کی نقل کر دو۔ آپ نے شجرے کی نقل اس طرح کی کہ ایک نام لکھ دیا، دوسرا حذف کر دیا؛ تیسرا پھر لکھ دیا، چوتھا پھر ساقط۔ غرضکہ اسی طرح بہت سے حذف و اسقاط کر کے نقل اور اصل جا کر آن کے حوالے کی۔ وہ دیکھ کر بہت خفا ہوئے کہ یہ کیا غضب کیا! مرزا نے کہا ''حضرت آپ اس کا کچھ خیال نہ فرمائیے۔ شجرہ دراصل

خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے؛ سو زینے کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ میں سے نکال دی جائے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا - آدمی ذرا اُچک اُچک کے اوپر چڑھ سکتا ہے -“ وہ یہ سن کے بہت جزبز ہوئے اور وہ نقل پھاڑ ڈالی اور کسی اور شخص سے اُس کی نقل کرائی اور مرزا ہمیشہ کے لیے اس تکلیف سے چھوٹ گئے -

موت کی آرزو

مرزا یا تو اس وجہ سے کہ اُن کی زندگی فی الواقع مصائب اور سختیوں میں گزری تھی اور یا اسی لیے کہ اُن پر ناملائم حالتوں کا بہت زیادہ اثر ہوتا تھا ، آخر عمر میں موت کی آرزو کیا کرتے تھے - ہر سال اپنی وفات کی تاریخ نکالتے اور یہ خیال کرتے کہ اس سال ضرور مر جاؤں گا -

لطیفہ

۱۲۷۷ھ میں اُنھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ یہ کہی کہ ”غالب مرد“، اس سے پہلے کئی مادے غلط ہو چکے تھے - منشی جواہر سنگھ، جوہر تخلص جو مرزا صاحب کے مخصوصین میں سے تھے، اُن سے مرزا صاحب نے اس مادے کا ذکر کیا- اُنھوں نے کہا ”حضرت! ان شاءاللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا“ مرزا نے کہا ”دیکھو صاحب! تم ایسی فال منہ سے نہ نکالو؛ اگر یہ مادہ مطابق نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا-“

لطیفہ

ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پڑی- میر مہدی حسین

مجروح نے دریافت کیا کہ حضرت! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی تک موجود ہے؟ اُس کے جواب میں لکھتے ہیں "بھئی کیسی وبا! جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکے تو تف بریں وبا!"، اسی قسم کی اور بہت سی باتیں اور حکائتیں اُن سے منقول ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مرنے کے کس قدر آرزومند تھے۔

اخیر عمر کی حالت

مرنے سے کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چھ چھ سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی۔ طشت چوکی پلنگ کے پاس ہی کسی قدر اوجھل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت معلوم ہوتی تھی تو پردہ ہو جاتا تھا۔ آپ بغیر استعانت کسی نوکر چاکر کے، کپڑے اُتار کر بیٹھے ہی بیٹھے کھسکتے ہوئے چوکی پر پہنچتے تھے۔ پلنگ پر سے چوکی تک جانا، چوکی پر چڑھنا، چوکی پر دیر تک بیٹھے رہنا اور پھر چوکی سے اُتر کر پلنگ تک آنا، ایک بڑی منزل طے کرنے کے برابر تھا، مگر خطوں کے جواب اس حالت میں بھی برابر خود پلنگ پر پڑے پڑے لکھتے تھے یا کسی دوسرے آدمی کو بتاتے جاتے تھے، وہ لکھتا جاتا تھا۔

مرض الموت کی حالت

مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ پہر پہر، دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا تھا،

پھر بے ہوش ہو جاتے تھے - جس روز انتقال ہوگا اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا؛ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاؤالدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے - انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا- اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی کا شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا - فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو! ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا" اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں رہا ، دوسرا مصرع یہ تھا :

"نہ کرد ہجر مدارا بمن سر تو سلامت"

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر ورد زبان رہتا تھا :

دم واپسیں بر سر راہ ہے ۔۔۔ عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

تاریخ وفات

آخر ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں کو تہتر برس اور چار مہینے[1] کی عمر میں دنیا سے رحلت کی اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہ میں اپنے خسر کے پائین مزار دفن کئے گئے- ان کی وفات کی تاریخیں جو مدت تک ہندوستان کے اردو اخباروں میں چھپتی رہیں وہ گنتی اور شمار سے باہر ہیں؛ صرف ایک تاریخ جس میں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا یاد رکھنے کے قابل ہے، یعنی "آہ غالب بمرد" جس کو مختلف لوگوں نے مختلف طور

۱- مولانا حالی اسی کتاب کے آغاز (دوسری سطر) میں خود فرماتے ہیں کہ مرزا غالب کی پیدائش ۸ - رجب ۱۲۱۲ ہجری کو ہوئی - یہاں وفات کی تاریخ ۲ - ذیقعد ۱۲۸۵ ہجری دی ہے- ذرا حساب کر کے دیکھیے کہ صحیح عمر کتنی ہوتی ہے- ۷۳ برس ۳ مہینے اور ۲۲ دن ہوتے ہیں- انھیں تہتر برس اور پورے چار مہینے کہنا کہاں تک مناسب ہے؟ داؤدی

پر قطعات میں منتظم کیا تھا ۔ تاریخوں کے علاوہ مرزا قربان علی بیگ سالک، میر مہدی حسین مجروح اور مولف کتاب ھذا نے اردو میں اور منشی ھرگوپال تفتہ نے فارسی میں مرزا کے مرثیے بھی لکھے تھے جو اسی زمانے میں چھپ کر شائع ہو گئے تھے۔

جنازے کی نماز

مرزا کے جنازے پر جب کہ دلی دروازے کے باھر نماز پڑھی گئی، راقم بھی موجود تھا اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب ضیاءالدین احمد خاں، نواب محمد مصطفی خاں، حکیم احسن اللہ خاں وغیرھم اور بہت سے اھل سنت اور امامیہ دونوں فرقوں کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان نبیرۂ بخشی محمود خاں نے نواب ضیاءالدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے، ھم کو اجازت ھو کہ ھم اپنے طریقے کے موافق اُن کی تجہیز و تکفین کریں، مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اھل سنت کے موافق ادا کئے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ اُن کے اصلی مذھبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ھو سکتا تھا، مگر ھمارے نزدیک بہتر ھوتا کہ شیعہ اور سنی دونوں ملکر یا علیحدہ علیحدہ اُن کے جنازے کی نماز پڑھتے اور جس طرح زندگی میں اُن کا برتاؤ سنی اور شیعہ دونوں کے ساتھ یکساں رھا تھا اسی طرح مرنے کے بعد بھی دونوں فرقے اُن کی حق گزاری میں شریک ھوتے۔

شاگردوں کی کثرت

مرزا صاحب کے شاگرد اطراف ھندوستان میں بے شمار

تھے - اُن کی وسعت اخلاق اور عام رضا جوئی نے یہ دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا - جو شخص اصلاح کے لیے اُن کے پاس غزل بھیجتا تھا ، ممکن نہ تھا کہ وہ اُس کے خط کا جواب اور اُس کی غزل میں اصلاح دے کر نہ بھیجیں - اگرچہ مرزا کی فطرت شاعری میں اپنے طبقے کے لوگوں سے اس قدر بلند واقع ہوئی تھی کہ وہ کسی شاگرد یا مستفید کو اپنے ساتھ ساتھ نہیں لے چل سکتے تھے، جیسا کہ اُنھوں نے خود ایک فارسی شعر میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے ، وہ کہتے ہیں :

ما ہمائی گرم پروازیم فیض از ما مجوی
سایہ ھمچون دود بالا می رود از بال ما

با این همه اہل دہلی و نواح دہلی میں چند اصحاب جو مرزا کے فیض صحبت اور مشورۂ سخن سے زیادہ مستفید ہوئے تھے ، اُن کے ارشد تلامذہ سمجھے جاتے تھے؛ جیسے نیّرؔ رخشاں ، عارف ، سالک ، مجروح ، علائی ، تفتہ وغیرہم - ان کے سوا خاص اہل دہلی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو عرفاً مرزا کے شاگرد نہیں سمجھے جاتے تھے ، لیکن درحقیقت ان کے شاگرد معنوی تھے؛ جیسے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ، جنھوں نے مومن خاں مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام فارسی ہو یا اردو ، مرزا ھی کو دکھایا یا جیسے سید غلام علی خاں[1] مرحوم ، متخلص بہ وحشت جو

۱- یہ صاحب دلی کے ممتاز لوگوں میں تھے - ان کے والد کا نام سید فرحت اللہ خاں تھا اور مولانا رشید الدین خاں مرحوم کے داماد تھے - قطع نظر علم و فضل کے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت خوش بیان اور شعر کا مذاق اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے - اول سرکار

(بقیہ صفحہ ۱۴۶ پر)

مرزا کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد اور اُن کی صحبت سے مستفید رہے تھے - مرزا نے انھیں دونوں صاحبوں کی طرف اپنی ایک اُردو غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے اور کہا ہے :

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید
مر گیا غالب آشفتہ نوا ، کہتے ہیں

لطیفہ

یہ دونوں صاحب باہمدگر نہایت گہری دوستی رکھتے تھے ، یہاں تک کہ اُن کی دوستی عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی - ایک دفعہ جب کہ راقم بھی جہاں گیر آباد میں موجود تھا، سید غلام علی خاں مرحوم نواب صاحب سے ملنے کو آئے ہوئے تھے اور مرزا صاحب نے بھی اُن کا یہاں آنا سن لیا تھا - اُنھیں دنوں میں مرزا کا خط نواب صاحب کے نام آیا ؛ اُس میں خان صاحب کو بھی سلام لکھا تھا اور اخیر میں خواجہ حافظ کے مشہور شعر کا پہلا مصرع اس طرح بدل کر لکھا تھا :

چو با حبیب نشینی و چائے پیمائی
بیاد آر حریفان بادہ پیما را

ایک عزیز نے یہ لطیفہ سن کر کہا کہ خواجہ حافظ کے

بقیہ از صفحہ ۱۴۵
انگریزی میں ملازم رہے ، پھر الور میں فوج دار ہو گیے - پھر لکھنؤ میں نواب سعید الدولہ مرحوم نائب وزیر کے توسط سے کہ اُن سے قرابت قریبہ رکھتے تھے ، ایک معزز خدمت پر ممتاز ہو گیے - وہاں سے پھر الور چلے آئے تھے اور غدر تک وہیں رہے - غدر کے بعد اخیر عمر تک سر رشتہ تعلیم میں منسلک رہے اور نواب مصطفیٰ خاں مرحوم اُن کی ہر حال میں مدد کرتے رہے -

اصل شعر میں اس قدر لطف نہ تھا جیسا کہ اس موقع پر مرزا صاحب کے اس تصرف سے اُس میں لطف[1] پیدا ہوگیا ہے۔

مرزا صاحب کے اُن شاگردوں کا حال جن کے نام کے بہت سے خطوط اُردوے ''معلّی'' اور ''عود ہندی'' میں مرزا کے لکھے ہوئے موجود ہیں، یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں، اس لیے ہم صرف دو صاحبوں کا مختصر ذکر اس مقام پر لکھتے ہیں؛ ایک نواب ضیاء الدین احمد خان مرحوم اور دوسرے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہ غالباً ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کے نام کا کوئی خط مرزا کے اردو مکاتبات میں نہیں ہے جس سے اُن کی خصوصیت مرزا صاحب کے ساتھ خاص و عام کو معلوم ہو۔

نواب ضیاءالدین احمد خاں

نواب ضیاءالدین احمد خاں جو فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے قطع نظر کمال شاعری و انشا پردازی کے تاریخ، جغرافیہ، علم انساب، علم اسماء رجال، تحقیق لغات اور جنرل انفورمیشن (عام واقفیت) میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ اُنھوں نے فنون مذکورہ میں کوئی مستقل تصنیف اپنے نام سے نہیں چھوڑی، لیکن اکثر مصنفین اُن سے مدد لیتے تھے اور جو مشکل پیش آتی تھی اُس میں اُن سے مشورہ کرتے تھے؛ خصوصاً الیٹ صاحب نے جو ہندوستان کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی ہے اُس کی تصنیف و ترتیب میں نواب ممدوح نے بے انتہا مدد پہنچائی

۱- یعنی نواب صاحب تو شراب سے مجتنب تھے اور مرزا پیتے تھے، اس لیے اُن کی نسبت چائے پیمائی اور اپنی نسبت بادہ پیما کا لفظ کہا - ۱۲

تھی جس کا مصنف نے اپنی کتاب کے دیباچے میں خود اعتراف کیا ہے۔

چونکہ نواب ممدوح اہل کمال کے عاشق تھے اور خاص کر مرزا صاحب سے اُن کی حقیقی چچازاد بہن منسوب تھیں، اس لیے مرزا کے ساتھ اُن کو خاص تعلق تھا۔ وہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکر شعر کرتے تھے، مگر زیادہ‌تر فارسی نظم و نثر لکھتے تھے اور مرزا کے قدم بہ قدم چلتے تھے۔ مرزا نے جو ایک قصیدہ نہایت بلیغ و لطیف نواب ممدوح کی شان میں لکھا ہے اور جس میں اُن کا اُستاد ہونے پر فخر ہے، اُس کے کچھ اشعار مختلف مقامات سے التقاط کر کے یہاں لکھے جاتے ہیں:

صد آفتاب توان ساختن ببازیچہ
ز ذرۂ کہ بود در ضیائی نیّر من
نہ این سپہر و نہ این مہر عالمی دگر ست
من آسمانم و او مہر نور گستر من
من آن سپہر کہ دایم، چنانکہ مہر بہ‌ماہ
بہ مہر نور دھد نیر منور من
من آن سپہر کہ ھر دم رسد عطیہ فیض
بہ سعد اکبر گردون ز سعد اصغر من
منم خزینۂ راز آو در خزینۂ راز
ضیائی دین محمد کہیں برادر من
بہ دین و دانش و دولت یگانۂ آفاق
بہ عمر کہتر و از روئی رتبہ مہتر من
بہ مہر دل بہ برادر دھم، نہ یعقوبم
کہ پور خویش بود دلستان و دلبر من

سخن سرائی نو آئین نوائی را نازم
بناله هم نفس من به شور همسر من
به نکته شیوهٔ شاگرد من با من مانا ست
صنم بصورت خود می تراشد آذر من
اگرچه اوست ارسطو و من فلاطونم
بود به پایه ارسطوئی من سکندر من
زمین کوئی مرا آسمان کند هر صبح
طلوع نیر رویش ز طرف منظر من
اگر شوم به مثل آتشی شراره فشان
شود بقاعدهٔ همدم سمندر من
به بحر گرفتدم ره، بود سفینهٔ من
به تخت گر بودم رائی گردد افسر من
به مهر دوست دهم دل، نشاط خاطر من
به کین خصم نهم رخ لوائی لشکر من
گرم ز غصه تبه گشته کار، مونس من
ورم ز کار فرومانده دست، یاور من
زهے ز روئی تو پیدا فروغ دانش و داد
بدیں فروغ جهان تاب گشته اختر من
ز توکه آئینهٔ فیض صحبت اولیا
هوائی دیدن غالب فتاده در سر من
مرا ستودی[1] و گفتی که من ازان تو ام
فدائی آن تو بادا اقل و اکثر من!
سعادت و شرف چون منی بعرض کمال
نه بس بود که بود چون توئی ثنا گر من

۱- معلوم ہوتا ہے کہ نواب نے مرزا کی مدح میں کوئی قصیدہ لکھا تھا جس کی طرف ان دونوں بیتوں میں اشارہ ہے- ۱۲

نواب محمد مصطفیٰ خاں

نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے، اگرچہ مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے، بلکہ جب تک مومن خاں مرحوم زندہ رہے انھیں سے مشورۂ سخن کرتے رہے، لیکن خاں موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونوں زبانوں میں وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد اُن کے معاصرین میں سے کسی کی فارسی غزل اُن کی غزل سے لگّا نہیں کھاتی تھی اور شعر کا جیسا صحیح مذاق اُن کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا، ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ لوگ اُن کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے۔ اُن کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اُس کی نظر سے گر جاتا تھا اور اُن کی تحسین سے اُس کی قدر بڑھ جاتی تھی۔ یہی وہ شخص تھے جن کی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں :

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

نواب ممدوح کی شان میں بھی مرزا کا ایک فارسی قصیدہ اُن کے دیوان میں موجود ہے جس میں اول فخریہ تشبیب لکھی ہے۔ اشعار لکھتے لکھتے کہتے ہیں :

دست رو بر تاج قیصر می نہم
پشت پا بر تخت خاقاں می زنم
خردہ می گیرند برمن قدسیان
گر نقس در مدح سلطاں می زنم

آن همائی تیز پروازم که بال
درهوائی مصطفی‌ٖخان می زنم
عرفی و خاقانیش فرمان پزیر
سکه در شیراز و شروان می زنم
او خرامد مست و من چاؤش وار
بانگ بر اجرام و ارکان می زنم
گلشن کویش گزرگاه من ست
دوش در رفتن به رضوان می زنم
خوبئی خویش بد آموز من ست
دم ز یاری می زنم، هان می زنم
مهرورزی بین که باشم هم‌نشین
من که زانو پیش دربان می زنم
بشنود بی آنکه باد آن را برد
ناله گر درکنج زندان می زنم
بنگردبی آنکه کلک آن‌را کشد
نقش گر بر صفحهٔ جان می زنم

———

دوسرا حصہ

مرزا کے کلام پر ریویو اور اس کا انتخاب

تمہید

مرزا کے کلام پر ریویو کرنا اور اُس کی حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی، ایک ایسے زمانے میں جب کہ فارسی زبان ہندوستان میں بمنزلہ مردہ زبان کے ہوگئی ہے اور ذوق شعر روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے، ایک نہایت مشکل کام ہے۔ مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گراں قدر ہے، وہ اُن کی فارسی نظم ونثر ہے، لیکن اول تو فارسی زبان سے ملک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے، دوسرے مرزا کے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل نا آشنا ہیں۔ پس جو شخص اس زمانے میں اُن کے کلام پر ریویو کرنا اور اُس کے ذریعے سے مصنف کی حقیقت اور اُس کا رتبہ ظاہر کرنا چاہتا ہے وہ درحقیقت ایک ایسے کام کے درپے ہے جس میں کامیابی کی بہت ہی کم اُمید ہوسکتی ہے، لیکن اگر کچھ امید ہے تو اُسی صورت میں ہے کہ کچھ کیا جائے، نہ یہ کہ کام کی مشکلات پر نظر کرکے اُس سے ہاتھ اٹھا لیا جائے۔

دفع غم نیست جز بغم خوردن چارۂ کارنیست جز کردن

مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی، بلکہ اُن کی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے، جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے، گیارہ برس کی عمر میں[1] شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اُسی زمانے میں اُنھوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل کے موزوں کئے تھے جن کی ردیف میں ''کہ چہ'' بجائے ''یعنی چہ'' کے استعمال کیا تھا۔ جب اُنھوں نے وہ اشعار اپنے اُستاد شیخ معظم کو سنائے تو اُنھوں نے کہا کہ ''یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے؟ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔'' مرزا یہ سن کر خاموش ہو رہے۔ ایک روز ملا ظہوری کے کلام میں ایک شعر اُن کی نظر پڑ گیا جس کے آخر میں لفظ ''کہ چہ'' ''یعنی چہ'' کے معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لے کر دوڑے ہوئے اُستاد پاس گئے اور وہ شعر دکھایا۔ شیخ معظم اُس کو دیکھ کر حیران ہو گئے اور مرزا سے کہا تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے، تم ضرور فکر شعر کیا کرو اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروا نہ کرو۔

۱- منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنھیالال ایک صاحب آگرے کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہم عمر تھے، ایک بار دلی میں آئے اور جب مرزا صاحب سے ملے تو اثناء کلام میں اُن کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی، وہ بھی آپ کو یاد ہے؟ اُنھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا وہ اُردو مثنوی میرے پاس موجود ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لا کر دی اور وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اُس کے آخر میں یہ فارسی شعر کسی اُستاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا۔

''رشتہ درگردنم افگند دوست می کشد ہرجا کہ خاطر خواہ اوست''

لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جب کہ یہ مثنوی لکھی تھی، آٹھ نو برس کی تھی۔ ۱۲

مرزا کو، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، باپ نے پانچ برس کی اور چچا نے نو برس کی عمر میں چھوڑا تھا۔ چچا کے بعد کوئی مربی و سرپرست اُن کے سر پر نہ رہا تھا۔ مرزا کی نانہال جہاں اُنھوں نے پرورش پائی تھی بہت آسودہ حال تھی اور نانہال کی ثروت سے ظاہرا مرزا اور اُن کے بھائی سے بڑھ کر کوئی فائدہ اٹھانے والا نہ تھا۔ آغاز شباب میں جب کہ سر پر کوئی مربی نہ ہو دولت و آسودگی سے زیادہ کوئی چیز خانہ بر انداز نہیں ہو سکتی۔ مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اُس آسودگی نے وہ کام کیا جو کہ آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے۔ جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گزری ہے، اُس کی کیفیت کا خود اُنھیں کے الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ ایک جگہ اپنی جوانی کی حالت اس طرح ظاہر کرتے ہیں ''با فرو فرھنگ بیگانہ، و با نام و ننگ دشمن؛ با فرومائگاں ہم نشیں، و با اوباش ہم رنگ و پائے بے راہہ پوی، و زبان بے صرفہ گوئی ؛ در شکست خویش گردوں را دستیار، و در آزار خویش دشمن را آموزگار۔'' اس کے بعد لکھتے ہیں ''تیزی رفتار من از مسجد و بت خانہ گرد انگیخت و خانقاہ۔ میکدہ را بہ یک دگر زد''۔ الغرض مرزا کا لڑکپن اور اُن کی جوانی ایسی حالت میں بسر ہوئی تھی کہ ایک ایسے فن میں، جس کا نہ کوئی قدر دان نظر آتا تھا اور نہ کوئی خریدار دکھائی دیتا تھا، اعلیٰ درجے کا کمال بہم پہنچانا تو درکنار اُس کا خیال بھی دل میں گزرنا قریب ناممکن کے تھا۔ پس یہ صرف اُن کی طبعی مناسبت اور فطری قابلیت کا اقتضا تھا کہ اُس غفلت و بدمستی کے عالم میں بھی شعر کا کھٹکا برابر لگا رہا اور شاعری کی تکمیل کا خیال ایسی بے خبری کے زمانے میں بھی فراموش نہیں ہوا۔

دیوان ریختہ

مرزا نے گل رعنا[۱] کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اول اردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا، اس لیے ہم بھی پہلے اُن کے اردو دیوان کا ذکر کرتے ہیں۔ جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اردو شعر کہنا شروع کیا تھا، قطع نظر اس کے کہ اُس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے، اُس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی[۲] نے جو مرزا کے ہم وطن تھے اُن کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ ''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔''

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد[۳]

۱- مرزا نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج احمد کی فرمائش سے اپنے تمام اردو فارسی دیوان کا انتخاب کیا تھا جس کا دیباچہ اُن کے کلیات نثر فارسی میں موجود ہے، اُس کا نام 'گل رعنا' رکھا تھا۔

۲- مرزا کی ولادت ۱۲۱۲ھ میں ہوئی ہے اور میر کی وفات ۱۲۲۵ھ میں واقع ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرزا کی عمر میر کی وفات کے وقت تیرہ چودہ برس کی تھی؛ مرزا کے اشعار اُن کے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم والد ناظرحسین مرزا صاحب نے میرتقی کو دکھائے تھے - ۱۲

جناب مولانا غلام رسول مہر کو اس کی صحت سے اتفاق نہیں ہے (ماہ نو، فروری ۱۹۴۹ء) لیکن مالک رام صاحب (ذکر غالب، طبع سوم، صفحہ ۴۲) نے اس کے امکان پر ایک اطمینان بخش بحث کی ہے۔
داؤدی

۳- انھیں عبدالصمد کی تعلیم کے متعلق بحث کرتے ہوئے مولانا حالی اسی کتاب کے صفحہ ۱۸ پر یہ الفاظ لکھ آئے ہیں:-

''پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے، اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ ''مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔''

بقیہ صفحہ ۱۵۷ پر

کی تعلیم کے سبب فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کے بول چال اور اُن کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا - یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی‌الطبع لڑکے ابتداء میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے، زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں، مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا، چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اُسی روش پر مرزا نے اردو میں چلنا اختیار کیا تھا، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہاں بطور نمونے کے مرزا کے ابتدائی کلام میں سے چند اشعار لکھے جاتے ہیں:

(۱) کرے¹ گر فکر تعمیر خرابی ہائے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثل استخواں بیروں ز قالب ہا

(۲) اسد ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزودن
بہ بند گریہ ہے نقش بر آب امید رستن ہا

(۳) بہ حسرت گاہ ناز کشتۂ جاں بخشی خوباں
خضر کو چشمۂ آب بقا سے ترجبیں پایا

(۴) رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوق فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا

بقیہ از صفحہ ۱۵۶

جس عبدالصمد کی تعلیم کا عدم و وجود برابر تھا پھر اسی عبدالصمد کی تعلیم کا اس درجہ اثر انگیز ہونا سخت تعجب خیز ہے - کیا مولانا حالی کی یہ تضاد بیانی لائق توجہ نہیں ہے؟ داؤدی

۱- یہ شعر مرزا نے اپنے دیوان ریختہ میں سے تو نکال ڈالا مگر دیوان فارسی میں بتغیر الفاظ داخل کر دیا یعنی اس طرح:

کند گر فکر تعمیر خرابیہائی ما گردوں
نیاید خشت مثل استخواں بیروں زقالب ہا

(۵) پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبۂ بالش
خیال شوخئ خوباں کو راحت آفریں پایا

(۶) موسم گل میں مے گلگوں حلال سے کشاں
عقد وصل دخت رز انگور کا ہر دانہ تھا

(۷) ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہوگیا
گوئیا صحرا غبار دامن دیوانہ تھا

چونکہ مذکورۂ بالا شعروں میں قطع نظر اس کے کہ طرز بیان اردو بول چال کے خلاف ہے ، خیالات میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم ہوتی ، اس لیے ان کے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے ، صرف چوتھے شعر کی جو کسی قدر آسان ہے، یہاں بطور نمونے کے شرح کی جاتی ہے ، تاکہ معلوم ہو کہ مرزا نے مشق سخن کس قسم کے خیالات سے شروع کی تھی اور کس قدر کاوش سے وہ یہ نئی قسم کے مضمون پیدا کرتے تھے -

کہتا ہے کہ فنا میں جو لذت اور ذوق تھا ہماری غفلت نے اس سے ہمیشہ دور دور رکھا - اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو اشارت فہم کے لیے ہر ایک ناخن جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے ، ابرو کا کام دیتا تھا - ابرو کا کام ہے اشارہ و ایماء کرنا اور ناخن بریدہ جو ابرو کی شکل ہوتا ہے ، وہ بھی فنا کی لذت کی طرف اشارہ کرتا تھا ، کیوں کہ ناخن کے کٹنے سے جو ایک قسم کی فنا ہے ، لذت اور راحت حاصل ہوتی ہے -

یہ اوپر کی سات بیتیں ہم نے مرزا کے ان نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی ہیں جو انھوں نے اپنے دیوان ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اس میں سے نکال

ڈالی تھیں ، مگر اب بھی اُن کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سے اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن پر اُردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے ، جیسے ذیل کے اشعار جو اب دیوان موجود ہیں :

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ انداز بہ خوں غلطیدن بسمل پسند آیا
لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا
شب خمار چشم ساقی رستخیز اندازہ تھا
محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی ، مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جاں کاہی اور جگر کاوی سے سر انجام کئے ہوں گے ۔ جب کہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دکھا ہوگا ؟ ظاہرا یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار جوفی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے اُن کے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اُٹھ سکا ۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار اُن کی نظر میں کھٹکے ہوں ، مگر چونکہ دیوان چھپ کر شائع ہوچکا تھا ، اس لیے اُنھوں نے ان اشعار کا نکالنا فضول سمجھا ۔

مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی میر تقی نے کی تھی اُس کی دونوں شقیں اُن کے حق میں پوری ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مرزا اول اول ایسے رستے پر پڑ لیے تھے کہ اگر استقامت طبع اور سلامت ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چیں ہم عصروں کی خردہ‌گیری اور

اور طعن و تعریض سدّ راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ سنا گیا ہے کہ اہل دہلی مشاعروں میں ، جہاں مرزا بھی ہوتے تھے، تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے جو الفاظ و ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پر شوکت و شان دار معلوم ہوتی تھیں، مگر معنی ندارد ؛ گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔

لطیفہ

ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رام پوری نے جو نہایت ظریف‌الطبع تھے اور جن کو چند روز قلعۂ دہلی سے تعلق رہا تھا ، مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اُردو شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اُسی وقت دو مصرعے خود موزوں کرکے مرزا کے سامنے پڑھے :

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا ”حاشا یہ میرا شعر نہیں۔“ مولوی عبدالقادر نے از راہ مزاح کے کہا ”میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔“ آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے

ہیں کہ تمھارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اُردو اور فارسی دیوان میں جا بجا اشارہ کیا ہے۔ اُردو میں ایک جگہ کہتے ہیں:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے:

گر خامشی سے فائدۂ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

یعنی اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حال دل ظاہر نہیں ہوتا تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی خاموشی ہی کا فائدہ دیتا ہے، کیونکہ میرا کلام کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

چونکہ مرزا کی طبیعت فطرتاً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی، اس لیے نکتہ چینوں کی تعریضوں سے اُن کو بہت تنبّہ ہوتا تھا اور آہستہ آہستہ اُن کی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی۔ اس کے سوا جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا اُن کو اپنا خالص و مخلص دوست اور خیرخواہ سمجھنے لگے تو اُنھوں نے اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی، یہاں تک کہ اُنھیں کی تحریک سے اُنھوں نے اپنے اُردو کلام میں سے جو اُس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اُس کے بعد اُس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔

مرزا نے ریختہ میں جو روش ابتداء میں اختیار کی تھی،

ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبول خاص و عام نہیں ہوسکتی تھی ؛ لوگ عموماً میر ، سودا ، میر حسن ، جرأت اور انشا وغیرہ کا سیدھا سادا اور صاف کلام سننے کے عادی تھے ، جو محاورے روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے ، اُنھیں کو جب اهل زبان وزن کے سانچے ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو اُن کو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا ۔ شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی کہ ادھر قائل کے منہ سے نکلا اور اُدھر سامع کے دل میں اُتر گیا ، مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی ۔ جیسے خیالات اجنبی تھے ، ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی ۔ فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروف ربط اور توابع فعل، جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں ، اُن کو مرزا اردو میں عموماً استعمال کرتے تھے ۔ اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر اُن میں ایک لفظ بدل دیا جائے توسارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے ۔ بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے جو نہ اُن سے پہلے اردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں ، مثلاً اُن کے موجودہ اردو دیوان میں ایک شعر ہے :

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
ای نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے ، فرمایا کہ اے کی جگہ جز پڑھو ، معنی خود سمجھ میں آ جائیں گے ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری جو ایک کف خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں ، اُن کے جگر

سوختہ ، یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف اُن کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اے کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہرا یہ انہیں کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سن کر کہا کہ گر وہ اے کی جگہ جز کا لفظ رکھ دیتے یا دوسرا مصرع اس طرح کہتے :

'اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے'

تو مطلب صاف ہو جاتا۔'' اُس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے ، مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تا بہ مقدور بچتے تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے ، اس لیے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرز خیال اور طرز بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے۔

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو ، مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے اُن کی ارجنیلٹی[۱] اور غیرمعمولی اُپچ کا خاطرخواہ سراغ ملتا ہے اور یہی اُن کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پک ڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے ، اسی پر آنکھیں بند کر کے گلے کے پیچھے پیچھے ہو لیں اور لیک سے ادھر اُدھر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اُس میں اگلوں کی چال ڈھال سے سر مو تجاوز نہ کریں اور اُن کے نقش قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے ، بلکہ دوسرے رستے پر چلنا اُن کی قدرت سے

۱- Originality

ہر ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے جن کی طبیعت میں ارجنیلٹی[1] اور غیر معمولی اُپچ کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر ان کو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ ان کو قوم کی شاہراہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھلی نظر آتی ہیں۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنون کو چلتا دیکھتے ہیں اس پر چلنے سے ان کی طبیعت ابا کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیرمسلوک وہ اختیار کریں، وہ منزل مقصود تک پہنچانے والا نہ ہو، مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہ ہو جائیں، عام راہ‌گیروں کی طرح آنکھیں بند کر کے شارع عام پر پڑ جائیں۔

مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی۔ وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے۔ وہ خست شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے، عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہو سکتا تھا، اجتناب کرتے تھے۔

لطیفہ

ایک صاحب نے جو غالباً بنارس یا لکھنؤ سے دلی میں آئے تھے، مرزا کے ایک شعر کی ان کے سامنے نہایت تعریف کی۔ مرزا نے کہا، ارشاد تو ہو وہ کون سا شعر ہے؟ انھوں نے میر امانی متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا:

۱۔ Originality

"اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی"

چونکہ شعر میں اسد تخلص واقع ہوا تھا، انھوں نے یہ سمجھا کہ مرزا غالب کا شعر ہے - مرزا یہ سن کر بہت جز بز ہوئے اور فرمایا "اگر کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس کو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی"

مرزا کو اس شعر کا اپنی طرف منسوب ہونا غالباً اس لیے ناگوار گزرا ہوگا "کہ مرے شیر" اور "رحمت خدا کی" یہ دونوں محاورے زیادہ تر عامیوں اور سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں اور اسد کی رعایت سے مرے شیر کہنا یہ بھی اُن کی طبیعت کے خلاف تھا ، کیوں کہ وہ ایسی مبتذل رعایتوں کو جو ہر شخص کو بآسانی سوجھ جائیں ، مبتذل جانتے تھے -

اس قسم کی اور بہت سی حکائتیں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعری میں ، بلکہ وضع میں ، لباس میں ، طعام میں ، طریق ماند و بود میں ، یہاں تک کہ مرنے اور جینے میں بھی عام طریقے پر چلنا پسند نہ کرتے تھے - یہاں ایک لطیفہ قابل لکھنے کے ہے -

لطیفہ

مرنے سے آٹھ سات برس پہلے اُنھوں نے ایک مادۂ تاریخ اپنی وفات کا نکالا تھا جس میں ۱۲۷۷ھ نکلتے تھے - اتفاق سے اُسی سال شہر میں وبا آئی مگر مرزا بچ گئے - اس امر کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی (یعنی اس سنہ میں مجھے مرنا چاہیے تھا) مگر میں

نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا ؛ واقعی اس میں میری کسر شان تھی ، بعد رفع فساد ہوا کے سمجھ لیا جائے گا،، اگرچہ یہ محض ایک ہنسی کی بات لکھی ہے ، مگر اُن کی طبیعت کا اقتضا اس سے صاف جھلکتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب جس کو یہ خط لکھا ہے ، وہ ان کی اس خصلت سے خوب واقف ہے ۔

بہر حال مرزا ایک مدت کے بعد اپنی بیراہ روی سے خبردار ہوئے اور استقامت طبع اور سلامتئی ذہن نے اُن کو راہ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا ۔ گو اُن کا ابتدائی کلام جس کو وہ حد سے زیادہ جگر کاوی اور دماغ سوزی سے سرانجام کرتے تھے ، مقبول نہ ہوا ، مگر چونکہ قوت متخیلہ سے بہت زیادہ کام لیا گیا تھا اور اس لیے اُس میں ایک غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہو گئی تھی ، جب قوت ممیزہ نے اُس کی باگ اپنے قبضے میں لی تو اُس نے وہ جوہر نکالے جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھے ۔

یہاں یہ امر جتا دینا ضرور ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا ، بلکہ محض تفنن طبع کے طور پر کبھی اپنے دل کی اُپج سے ، کبھی دوستوں کی فرمائش سے اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لیے ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اُردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف بقدر معتدبہ نہیں پائی جاتی ۔ وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں ؛ یہ غزلیں کاہے کو ہیں ، پیٹ پالنے کی باتیں ہیں ۔ میرے فارسی کے قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی اُن کا

لطف نہیں اٹھاتا - اب قدردانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظل‌سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے، یعنی نیا ریختہ، ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں -''

قطع نظر اس کے وہ اس زمانے کے خیالات کے موافق اردو شاعری کو داخل کمالات نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس میں اپنی کسر شان جانتے تھے، چنانچہ ایک فارسی قطعہ جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس میں شیخ ابراہیم ذوق کی طرف خطاب ہے، کہتے ہیں:

فارسی بین تا به بینی نقش‌های رنگ رنگ
بگزر از مجموعه اردو که بے رنگ من ست
راست می‌گویم من و از راست سرنتواں کشید
ہر چه در گفتار فخر تست آں ننگ من ست

مگر چونکہ مرزا کے معاصرین اکثر نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے، اس لیے وہ ریختہ کے سرانجام کرنے میں بھی اپنی پوری توجہ اور ہمت صرف کرتے تھے اور دونوں زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر رکھتے تھے-

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ شاعر اور اس کے کلام کے رتبے کا اندازہ اس کے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ہوتا، بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں - میر کی قدر لوگ اس لیے نہیں کرتے کہ اس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں، بلکہ صرف اس کے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں، اس کو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے - لطف علی خان آذر ''آتش کدہ'' میں

نوری، صفاہانی کی نسبت لکھتا ہے کہ اُس کے دیوان کا مختصر ہونا یہی اس کے کلام کی خوبی اور حسن طبع کی کافی دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعراء کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا، ورنہ فردوسی و نظامی دونوں مثنوی میں اور انوری و خاقانی دونوں قصیدے میں مسلم الثبوت نہیں ٹھہر سکتے، کیونکہ انوری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی باعتبار سادگی اور صفائی و عام فہم ہونے کے خاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے، حالانکہ چاروں شخص فارسی شاعری کے رکن رکین مانے جاتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ جدا جدا کلام جدا جدا معیاروں سے جانچے جائیں۔ مرزا کے اردو کلام میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بمقابلہ بعض شعراء کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں، لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں اور جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں سے نکلیں گے اس قدر کسی ریختہ کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے؛ البتہ ہم کو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لیے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑے گا جس کو امید ہے کہ اہل انصاف تسلیم کریں گے۔

میر و سودا اور ان کے مقلّدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اولاً فارسی اور اس کے بعد اردو غزل میں بندھتے

چلے آتے ہیں وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بہ تغیر اسالیب بیان عامہ اہل زبان کی معمولی بول چال اور روز مرہ میں ادا کیے جائیں ، چنانچہ میر سے لے کر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہل زبان میں گزرے ہیں ، ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں ۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضامین پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے ، وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لے جائے ۔ بر خلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے ۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جن کو اور شعراء کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہے اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے اول سے آخر تک قوم کی شاہراہ سے سر مو انحراف نہیں کیا اور جس چال سے کہ اگلوں نے راہ طے کی تھی اسی چال سے تمام رستہ طے کیا ہے ۔ مرزا نے اول شاہراہ کا رخ چھوڑ کر دوسرے رخ چلنا اختیار کیا اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا تو ان کو بھی آخر اسی رخ پر چلنا پڑا ، مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا اس کے سوا ایک اور لیک اسی کے متوازی اپنے لیے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی ، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور ان کے مقلدین

کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات ور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جاکر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سما نظر آتا ہے۔ یہاں اول ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں جن سے ان کے خیالات کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے:

اخلاق

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بادیٔ النظر میں یہ ایک بات معلوم ہوتی ہے، مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے، اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے، بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔

فطرت انسانی

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نشاط کے معنی امنگ کے ہیں، نشاط کار، یعنی کام کرنے کی امنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے اور نرا خیال ہی نہیں، بلکہ فیکٹ ہے، کیوں کہ دنیا میں

جو کچھ چہل پہل ہے ، وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے ۔ یہ انسان کی ایک طبیعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سر انجام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اُسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے ۔

ترجیح

نہ تھا کچھ تو خدا تھا ، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم ض ہونے کی تمنا کی ہے ۔ پہلے مصرعے کے معنی ظاہر ہیں ، دوسرے مصرعے سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کیا برائی ہوتی ، مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہئے کہ میں کیا چیز ہوتا ۔ مطلب یہ کہ خدا ہوتا کیوں کہ پہلے مصرعے میں بیان ہوچکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ۔

اخلاق

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اُس کو ادا کیا گیا ہے ۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اُس کی فہم کا قصور ہے ۔ دعویٰ یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے، اُسی کے موافق اُس کی تائید غیب

سے ہوتی ہے اور ثبوت یہ ہے قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے ، اگر اس کی ہمت جب کہ وہ دریا میں تھا ، موتی بننے پر قانع ہوجاتی تو اس کو جیسا کہ ظاہر ہے ، یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا ۔

عاشقانہ

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

''لاگ'' دشمنی اور ''لگاؤ'' محبت ۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو ، مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا، اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی و لطافت سے ہرگز نہ باندھا ہوگا ۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی ؛ اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لیے کہ اس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے ، ہم اسی کو دوستی سمجھتے ، لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں ۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے ''لاگ'' اور ''لگاؤ'' ایسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چہار چند کردیا ہے ۔

فضیلت نوع انسانی

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور

پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اُس کو اٹھالیا - شاعر کہتا ہے کہ برق تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہ طور، کیوں کہ شراب خوار کا ظرف دیکھ کر اُس کے موافق اس کو شراب دی جاتی ہے - پس کوہ طور جو منجملہ جمادات کے ہے، وہ کیوں کر تجلی الٰہی کا متحمل ہوسکتا ہے - یہ خیال بھی مع اس تمثیل کے جو اس میں بیان ہوئی ہے، بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے -

شوخی

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

چوں کہ خیال وسیع تھا اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اس لیے پہلا مصرع اُردو روز مرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے، مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی - کہتا ہے کہ مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو -

شوخی

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اس میں بھی نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے ؛ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے

گناهوں کا حساب نہ مانگ اور در پردہ الزام دیتا ہے، گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیوں کر دوں وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب اُن کو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیئے ہیں اور جو شمار میں اُسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، اُن کی گنتی یاد آتی ہے ۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدم استطاعت کے اُس کو خاطر خواہ نہ کر سکا، کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہوا اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی پس جتنے گناہ کیے ہیں اُتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں ۔

شکایت اہل وطن

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

پردیس میں مرنا جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے، اُس پر خدا کا اس لیے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا؟ لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقف حال ہو مگر خریدار و غم خوار ایک بھی نہ ہو، وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی؛ پس خدا کا شکر ہے کہ اُس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی ۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے فی الحقیقت سراسر اہل وطن کی شکایت ہے جس کو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔

تصوف

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو شہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیّت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراء الوراء ہے۔ کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ در حقیقت غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں؛ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لیے مثال نہیں ہو سکتی۔

عاشقانہ

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

عشق حقیقی ہو یا مجازی اس کے زخم کی گہرائی اس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی۔

اخلاق

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ خیال بالکل اچھوتا ہے اور نرالا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آ سکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ضد

حقیقی یعنی اُن کے آسان ہو جانے سے کرنا درحقیقت حسن مبالغے کی معراج ہے جس کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی۔

عاشقانہ

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے۔ اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ تھی کیونکہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں اور اس لیے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔

وفاداری

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بت خانے میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اُس کو کعبے میں دفن کیا جائے کیونکہ اس نے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کر دیا اور یہی ایمان کی اصل ہے۔

تصوف

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

یعنی جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت اس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملے گی - پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیے ، تا کہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں -

حسن بیان کی تعریف

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے حسن بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اتر جائے کہ اس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی -

اخلاق

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

جام جم پر جام سفال کو کس خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اس کی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی اور بالکل نیا خیال ہے جو کبھی نظر سے نہیں گزرا -

تصوف

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مے خانہ خالی ہے

یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو ، مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے - کہتے ہیں کہ

دنیا میں اگر اہل ہمت کا وجود ہوتا جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے تو دنیا ویران ہو جاتی - پس یہ جاننا چاہیے کہ عالم اس سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہل ہمت مفقود ہیں ، یعنی جس طرح مے خانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ مے خانے میں کوئی مے خوار نہیں ہے ، اسی طرح عالم کا آباد ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہل ہمت معدوم ہیں -

نا امیدی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہئے

نا امیدی کی غایت اس سے بڑھ کر اور ایسی خوبی سے شاید ہی کسی نے بیان کی ہو -

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یعنی جو گناہ ہم نے کیے ہیں اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی ان کی داد بھی ملنی چاہئے -

علاوہ جدت مضامین اور طرفگئی خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں - اولاً عام اور متبذل تشبیہیں جو عموماً ریختہ گویوں کے کلام میں متداول ہیں ، مرزا جہاں تک ہو سکتا ہے ان تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے ، بلکہ تقریباً ہمیشہ

نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے، بلکہ خیالات کی جدت ان کو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان کے ابتدائی ریختہ میں جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں وہ اکثر غرابت سے خالی نہیں ہیں، مثلاً سانس کو موج سے، بے خودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغز سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقد وصال سے، استخواں کو خشت اور بدن کو قالب خشت سے، اور اسی قسم کی اور بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں ان کے ابتدائی ریختہ میں پائی جاتی ہیں، لیکن جس قدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی اسی قدر تشبیہوں میں باوجود ندرت اور طرفگی کے سنجیدگی اور لطافت بڑھتی گئی، مثلاً وہ کہتے ہیں:

مثال ۱

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ راہ گزر بادیاں

یہاں سورج کو اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادۂ زوال و فنا ہیں، چراغ راہ گزار باد سے تشبیہہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔

مثال ۲

دوسری جگہ سورج کو اس لحاظ سے کہ حسن معشوق کے مقابلے میں اس کو ناقص‌الخلقة قرار دیا ہے، ماہ نخشب کے ساتھ تشبیہ دی ہے، چنانچہ کہتے ہیں:

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

مثال ۳

ایک جگہ انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اس کو غم سے نجات نہیں ہوتی، شمع سے تشبیہ دی ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے، جیسا کہ کہتے ہیں:

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

اس قسم کی بدیع و نادر تشبیہات سے مرزا کے دونوں دیوان اردو اور فارسی بھرے ہوئے ہیں۔ قطع نظر تشبیات کے مرزا ہر ایک بات میں جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے، ابتذال سے بہت بچتے تھے۔ مبتذل مضامین، مبتذل تشبیہیں، مبتذل محاورے، مبتذل ترکیبیں جس قدر اُن کے کلام میں کم ملیں گی، ظاہراً کسی ریختہ گو شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں۔ مثلاً صل[۱] علیٰ کا لفظ جو بجائے سبحان اللہ وغیرہ کے استعمال ہوتا ہے اُس کو وہ کبھی جائز نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ شاگردوں کی غزل میں بھی ہمیشہ اس لفظ کو کاٹ کر نام خدا یا کوئی اور لفظ بنا دیتے تھے۔ اسی طرح جو محاورے یا الفاظ صرف عام الناس کی زبان پر جاری ہیں اور خواص اُن کو کبھی نہیں بولتے، تا بہ مقدور وہ اُن کو استعمال نہیں کرتے تھے، اگرچہ ہمارے نزدیک ایسا التزام کرنے سے زبان کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہونا چاہئے، وہ وت ہوجاتا ہے، مگر مرزا کے کلام میں جو خصوصیتیں ہم

۱- مرزا کہتے تھے کہ حرف جار بغیر مجرور کے بولنا ایک عامیانہ اور سوقیانہ بول چال ہے۔ ۱۲

کو معلوم ہوئی ہیں ، اُن کا بیان کرنا ضرور ہے۔

دوسری خصوصیت

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے استعارہ و کنایہ و تمثیل کو جو کہ لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے اور جس کی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے، ریختہ میں بھی نسبتاً اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا اور شعرا نے استعارے کو صرف محاورات اُردو میں بلاشبہ استعمال کیا ہے لیکن استعارے کے قصد سے نہیں ، بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں۔ استعارے بلا قصد اُن کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں ؛ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کی جاتی ہیں۔

مثال ۱

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہاں اس مطلب کو کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھا دی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے ، اس طرح ادا کیا ہے ''بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا۔''

مثال ۲

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقت سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو درد ناک کیفیت گزری تھی اور جو اُس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اُس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے ، اُس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا۔ ایسے بلیغ شعر اُردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر

گزرتی ہے ، ان دو مصرعوں میں اس کی تصویر کھینچ دی ہے جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا ۔

مثال ۳

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔

مثال ۴

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

جو مطلب اس طریقے سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا ۔

مثال ۵

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا اس وقت ان کے دفع کرنے کی طاقت تھی۔

ان اشعار میں جیسا کہ ظاہر ہے اصل خیالات سیدھے سادے ہیں، مگر استعارے اور تمثیل نے ان میں ندرت اور طرفگی پیدا کر دی ہے ۔

تیسری خصوصیت

تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں اور کیا فارسی میں؛ کیا نظم میں اور کیا نثر میں باوجود سنجیدگی و متانت کے شوخی و ظرافت ہے جیسا کہ مرزا کے انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا۔ مرزا سے پہلے ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گزرے ہیں؛ ایک سودا، دوسرا انشاء، مگر دونوں کی تمام شوخی و خوش طبعی ہجو گوئی یا فحش و ہزل میں صرف ہوئی، بخلاف مرزا غالب کے کہ اُنھوں نے ہجو یا فحش و ہزل سے کبھی زبان قلم کو آلودہ نہیں کیا۔

چوتھی خصوصیت

چوتھی خصوصیت مرزا کی طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے اور جس کو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں مابہ‌الامتیاز کہا جا سکتا ہے۔ اُن کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد اُس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں، لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں:

مثال ۱

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے\
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا[۱]

۱۔ یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
یہ شعر یاسمن کنیز انشاء اللہ خاں انشا کا ہے (تذکرہ 'بہارستان ناز' مولفہ حکیم فصیح الدین انجم میرٹھی، طبع سوم، طبع عثمانی میرٹھ ۱۲۹۹ھ ص ۱۰۶) داؤدی

اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں ، وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے، یعنی خوف معلوم ہوتا ہے، مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی ، مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے ۔

مثال ۲

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مرگیا ہوں ، مئے مرد افگن عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے ، یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے ، مطلب یہ کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا ، اس لیے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے ، مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے ، اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع یہی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے ۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے ''کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق'' یعنی کوئی ہے جو مئے مرد افگن عشق کا حریف ہو ؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے ''کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق'' یعنی کوئی نہیں ہوتا ۔ اس میں لہجے اور طرز ادا کو بہت دخل ہے ؛ کسی

کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کروگے فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائیں گے۔

مثال ۳

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لے گا، اس لیے جان کو عزیز نہیں رکھتا اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے، پھر اس سے جان کیوں کر عزیز رکھی جا سکتی ہے۔

مثال ۴

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اس کو گوارا نہ ہوتی اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اس قصے کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب خدا تعالےٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا ''کیا تو دنیا میں اس شخص یعنی اس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خون ریزی کرے؟ وہاں سے ارشاد ہوا کہ ''تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا

ہوں‘‘ اور پھر آدم سے اُن کو زک دلوائی اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں ۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی ۔

مثال ۵

ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سروقامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے اور دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اُسی میں سے بنایا گیا ہے ، اس لیے وہ ایک قد آدم کم ہوگیا ہے ۔

مثال ۶

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

اس شعر میں ’’ترے سر کی قسم ہے ہم کو‘‘ اس جملے کے دو معنی ہیں ، ایک یہ کہ ترے سر کی قسم ہے ہم ضرور سر اُڑائیں گے اور دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے ، یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اُڑائیں گے جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے ، یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے ۔

مثال ۷

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو اور دوسرے

معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی‌الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

مثال ۸

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

"ہمارے بھی منہ میں زبان ہے" اس میں دو معنی رکھے ہیں، ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تم کو قائل کردیں گے اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتاسکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا یا نہیں۔

مثال ۹

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھادیتے تھے
دیکھوں اب مرگئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

"کون اٹھاتا ہے مجھے" اس کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اٹھادیتے تھے اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اٹھاتا ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل ہے تو اٹھا دیتے تھے دیکھوں اب میرا جنازہ کون اٹھاتا ہے۔

مثال ۱۰

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے اس میں باد پیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کردئے ہیں۔ باد پیمائی عبث کام کرنے کو

کہتے ہیں۔ پس ایک معنی تو اس کے یہ ہیں کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اُس میں شراب کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیمائی، یعنی فضول کام ہے، اس صورت میں بادہ‌نوشی مبتدا ہوگا اور بادہ پیمائی خبر۔ دوسرے معنی یہ ہیں باد پیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح باد پیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لیے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے۔

مذکورہ بالا خصوصیتوں کے علاوہ ایک اور بات قابل ذکر ہے جو مرزا اور اُن کے بعض معاصرین و متبعین کی غزل میں عموماً پائی جاتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ریختہ کی بنیاد فارسی غزل پر رکھی گئی ہے، جو جذبات اور خیالات اهل ایران ۔ غزل کے پیرایہ ظاہر کیے ہیں ریختہ گویوں نے زیادہ تر بلکہ بالکل اُنھیں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالا ہے، پس جو انقلاب ایک مدت کے بعد فارسی غزل میں پیدا ہوا، ضرور تھا کہ وہی انقلاب اُردو غزل میں‌ایک عرصے کے بعد پیدا ہوتا۔ قدمائے اہل ایران جن کا دور مولانا جامی پر ختم ہوتا ہے اُن کی غزل میں جو جذبات و خیالات بیان ہوئے ہیں، وہ اپنی نیچرل حالت سے متجاوز نہیں ہوئے اور گو اسالیب بیان میں تلاحق افکار کے سبب رفتہ رفتہ بہت وسعت اور لطافت پیدا ہوگئی لیکن بیان کا طریقہ نیچرل سادگی کی حد سے آگے نہیں بڑھا؛ مگر چونکہ خیالات نہایت محدود تھے ایک مدت کے بعد جتنے سیدھے سادھے عمدہ اور

لطیف اسلوب تھے وہ سب نبڑ گئے اور متاخرین کے لیے ایک چچوڑی ہوئی ہڈی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ اگر متاخرین غزل کو ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ بناتے تو اُن کے لیے میدان غیر متناہی موجود تھا مگر انھوں نے اس محدود دائرے سے باہر نکلنا نہ چاہا؛ اب جو لوگ تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے انھوں نے تو اُسی چچوڑی ہوئی ہڈی پر قناعت کی مگر جن کی فطرت میں اُرجنیلٹی اور اُپج کا مادہ تھا وہ انھیں قدیم خیالات و جذبات میں اپنے اپنے مبلغ فکر کے موافق نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کرنے لگے۔ چنانچہ نظیری، ظہوری، عرفی، طالب، اسیر اور اُن کے اقران و امثال کی غزل میں بمقابلہ سعدی، حافظ، خسرو وغیرہم کی غزل کے ہم اس قسم کا تفاوت پاتے ہیں مثلاً خواجہ حافظ کہتے ہیں:

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب باش و گو گناہ من است

نظیری نے اسی مضمون کو حقیقت سے مجاز میں لا کر اُس میں ایک نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے۔ وہ کہتا ہے:

تا منفعل ز رنجش بے جا نہ بینمش
مے آرم اعتراف گناہ نبودہ را

یا مثلاً دوسری جگہ خواجہ حافظ کہتے ہیں۔

از عدالت نبود دور گرش پرسد حال
پادشاہے کہ بہمسایہ گدائے دارد

ظہوری کے ہاں یہ سیدھا سادہ خیال ابراہیم عادل شاہ کے حق میں جو کہ اُس کا ممدوح بھی ہے اور محبوب بھی ایک

مئے انداز سے بندھا ہے وہ کہتا ہے :

مروت کردہ شبہا بر تو سیر بام و در لازم
نمے باشد چراغی - خانۂ بے دستگاھاں را

یعنی چونکہ بے مقدور لوگوں کے گھر میں چراغ نہیں ہوتا اس لیے مروت اور کرم نے تجھ پر لازم کر دیا ہے کہ راتوں کو کوٹھے پر چڑھ کر ٹہلا کرے تاکہ تیرے چہرے کی روشنی سے اُن کے گھر میں چاندنا ہو جائے مطلب یہ کہ اُن کے حال سے واقف ہو کر اُن کی مدد کرے -

مگر یہ انقلاب فارسی غزل میں کم و بیش چار سو برس بعد ظہور میں آیا تھا کیوں کہ نئی طرز اُس وقت تک ایجاد نہیں ہوتی جب تک ضرورتیں اہل فن کو سخت مجبور نہیں کرتیں - لیکن ریختہ میں یہ انقلاب ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر پیدا ہو گیا کیونکہ متاخرین اہل ایران کا نمونہ موجود تھا اس لیے نئی طرز کے ایجاد کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو طرز فارسی میں متاخرین نکال چکے تھے اُسی کو ریختہ میں ڈھالنا تھا -

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا غالب نے سب سے پہلے یہ طرز اختیار کی تھی کیونکہ جس طرح کیمسٹری کے مدون ہونے اور علم کے درجے پر پہنچنے سے پہلے اُس کے متفرق اصول مشرقی ملکوں میں بھی پائے جاتے تھے اسی طرح مرزا سے پہلے بھی بعض شعرا کے کلام میں اس نئی طرز کی کہیں کہیں جھلکی سی نظر آ جاتی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اول مرزا نے اور انھیں کی تقلید سے مومن ، شیفتہ ، تسکین ، سالک ، عارف ، داغ وغیرہم نے اس طرز کو بہت زیادہ رواج دیا ، خصوصاً مومن خاں مرحوم اس خصوصیت

میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں یہاں ایسی ایک دو مثال لکھنی مناسب معلوم ہوتی ہے جس سے ناظرین بخوبی سمجھ جائیں کہ متاخرین کے اس خاص گروہ نے قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسلوبوں میں کس قسم کی نزاکتیں اور لفظی و معنوی تصرفات کر کے اُن میں ندرت اور طرفگی پیدا کی ہے، مثلاً میر تقی کا شعر ہے:

میری تغئیر رنگ پر مت جا　　اتفاقات ہیں زمانے کے

اسی تغئیر رنگ کو مومن خاں نے اس طرح باندھا ہے۔

میری تغئیر رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

یا مثلاً خواجہ میر درد نے معشوق کے رخ روشن کو شمع پر اس طرح ترجیح دی ہے:

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

نواب مرزا خاں داغ نے اسی مضمون میں نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے، وہ کہتے ہیں:

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

الغرض اس قسم کی معنی آفرینیاں غالب، مومن اور اُن کے متبعین کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں۔ چونکہ اس موقع پر صرف مرزا کے کلام پر بحث کرنی مقصود ہے، اس لیے چند شعر مرزا کی غزلیات میں سے اسی قبیل کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

غلط ہے جذب دل کا شکوہ ، دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نگہت گل سے حیا مجھے

ضد کی ہے اور بات ، مگر خو بری نہیں
بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اُس کی بزم آرائیاں سن کر دل رنجور یاں
مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

نقش کو اُس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یہاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

نسیۂ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

پہلے شعر میں خون کا رنگ ہو کر اُڑ جانا ، دوسرے میں عاشق کے جذبے اور معشوق کی کشیدگی سے کشاکش کا لازم آنا ، تیسرے میں نگہت گل سے حیا آنی ، چوتھے میں بھولے سے سینکڑوں وعدے وفا کرنے ، پانچویں میں آپ اپنے پر رشک آنا ، چھٹے میں دل رنجور کا نقش مدعائے غیر کی طرح بیٹھا جانا ، ساتویں میں کھینچنے سے نقش کا

مصور سے کھنچنا ، آٹھویں میں مٹتے مٹتے آپ اپنی قسم ہو جانا ، نویں میں آپ اپنی ہمت عالی کے ہاتھ بک جانا ، دسویں میں باوجود موت آنے کے موت نہ آنی ، یہ سب متاخرانہ نزاکتیں ہیں جو ولی سے لے کر میر ، سودا اور درد تک کے کلام میں نہ تھیں اور اگر تھیں تو صرف اس قدر جیسے آٹے میں نمک ۔

اگرچہ ایران میں زمانۂ حال کے شعراء ظہوری و عرفی و طالب و اسیر وغیرہ کی طرز کو ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی روز بروز طبیعتیں نیچرل شاعری کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ رفتہ رفتہ اس قسم کے تکلفات اور نزاکتیں نظروں سے گر جائیں ، لیکن یہ سب زمانے کے مقتضیات ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں ۔ ایسی باتوں سے اُن لوگوں کی اُستادی اور گراں مایگی میں کچھ فرق نہیں آتا جن کو نئی طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل تھا ۔

بہر حال جو نسبت ظہوری ، نظیری ، عرفی ، طالب ، اسیر وغیرہم کے کلام کو سعدی ، خسرو ، حافظ اور جامی کے کلام سے ہے تقریباً ویسی ہی نسبت مرزا کے ریختہ کو ، میر، سودا اور درد کے ریختہ سے سمجھنی چاہیئے۔ قدمائے اردو روز مرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے، بر خلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیب بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمال شاعری سمجھتے تھے اور زبان کی صفائی اور روز مرہ کی نشست کو محض خیالات کے

ظاہر کرنے کا ایک آلہ (نہ کہ مقصود شاعری) تصور کرتے تھے، چنانچہ مرزا ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں کہ ''بھائی! شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے۔''

اگرچہ مرزا کی اردو شاعری پر بحث کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے، لیکن چونکہ لوگوں کو ایسی باتوں سے زیادہ دل چسپی نہیں ہے، اس لیے ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور صرف اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ مرزا کے دیوان ریختہ میں جس قدر اشعار سرسری نظر میں ممتاز معلوم ہوں، وہ بطور انتخاب کے یہاں نقل کر دیئے جائیں۔ جو اشعار اس سے پہلے مثالوں میں لکھے جا چکے ہیں اُن کو اب مکرر نہ لکھیں گے اور جہاں ضرورت ہو گی شعر کے معنی بھی بتائیں گے اور کہیں کہیں محاسن شعری کی طرف بھی اشارہ کیا جائے گا۔

رندانہ

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ ایک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

طاق نسیاں وہ طاق جس میں کچھ رکھ کر بھول جائیں، طاق نسیاں کا گلدستہ وہ گلدستہ جس کو طاق میں رکھ کر بھول جائیں۔ بے خودوں کے بہشت کو گلدستۂ نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے جو کہیں نہیں لکھی گئی۔

تصوف

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

یعنی راز کے نغموں سے تو خود ہی نا آشنا ہے ورنہ دنیا

میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردۂ ساز کی طرح بول رہے ہیں اور بج رہے اور اسرار الٰہی ظاہر کر رہے ہیں۔

عاشقانہ

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خون جگر ودیعت مژگان یار تھا

یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگان یار کی امانت تھی اور اس لیے اس کے ایک ایک قطرہ کا حساب اسی طرح دینا پڑے گا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔

عاشقانہ

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

تصوف

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

ظرافت

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سنا ہے کہ جس وقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سن کر کہا ”بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے۔“ مرزا نے کہا ”حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں، مگر یہ اس لیے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔

عاشقانہ

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر
رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا

کہتا ہے کہ تو نے ایک مشتاق قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لیے قتل نہیں کیا کہ خون بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے، مگر اب تیری گردن پر بجائے خون بے گنہ کے حق آشنائی کا رہے گا۔

عاشقانہ

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

شوخی

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

کہتا ہے کہ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے بلکہ عبودیت ہے؛ بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

خندہ گل کو خندہ بے جا اس لیے کہا ہے کہ وہ کچھ سمجھ کر یا ازراہ تعجب نہیں ہنستا، پس گویا اس کا خندہ بے محل ہے۔

توبہ

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

یعنی اس نے زبردستی کیوں نہ پلا دی ؟

عاشقانہ دل کی حقیقت

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگئی دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

شوخی

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

یعنی ہمارے جرم کے ثبوت کے لیے کسی کی شہادت ہونی ضرور ہے ؛ صرف فرشتوں کا لکھنا ہی کافی نہیں ہے ۔

عاشقانہ

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

حوصلہ گناہ

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کہتا ہے کہ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پلہ تک نہیں بھیگا ۔ ”تذکرۂ آبحیات“ میں

لکھا ہے کہ ذوق اس شعر کو نہایت پسند کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مرزا کو اپنے اچھے شعروں کی خود خبر نہیں ہوتی - یہ بعینہ ویسے ہی ہے جیسے مولانا آزردہ نے مرزا کا ایک عمدہ شعر سن کر اس کی تعریف کرتے وقت کہا تھا ''مرزا کا کیا کمال ہے یہ تو ہمارے انداز کا شعر ہے -'' غرض کہ ایک ہم عصر دوسرے ہم عصر کی تعریف بھی کرتا ہے تو اس میں ایک نہ ایک بات ضرور ایسی شامل کر دیتا ہے جس سے تنقیص لازم آئے یا اپنی تعریف اس سے بھی زیادہ نکلے -

عاشقانہ

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایان دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

رقابت

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

کہتا ہے کہ میں نے جو معشوق کے حسن کی تعریف کی تو جو شخص میرا محرم راز اور ہمنشین تھا وہی سن کر میرا رقیب بن گیا، اول تو ایسے پری وش کی تعریف تھی اور وہ بھی مجھ سے جادو بیان کی زبان سے - پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی ''اور پھر بیان اپنا'' سارے شعر کی جان ہے جس

کی خوبی بغیر ذوق سلیم کے معلوم نہیں ہو سکتی ۔

ظرافت

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسبان اپنا

یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسباں ہمارا جان پہچان نکلا ؛ اب ہمارے لئے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلت دے، ہم اس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے ،ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے ۔

شکوہ چرخ

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

آسماں کی دشمنی کے کیا اسباب بتائے ہیں اور اپنی دانائی اور ہنر مندی کس خوبصورتی سے ثابت کی ہے ۔

عاشقانہ

رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہاں میرا

یعنی اگر نالہ کی اجازت نہ ہو گی تو ہم اُس کو ضبط کریں گے اور اس کا اثر تجھ تک پہنچے گا ۔

صبر

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

شوخی

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

دکھلائیں کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے، کہتا ہے کہ عمر بھر موت کا منتظر رہا کہ وہ حالت زندگی سے ضرور بہتر ہو گی اب دیکھئے مرنے کے بعد کیا حالت دکھلاتے ہیں، جس کا تمام عمر منتظر رکھا ہے۔

توحید

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

حریف جوشش دریا نہیں خود داری ساحل
جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا

یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا اسی لئے جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ چل نہیں سکتا، یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے۔

تصوف

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

یعنی جب درد حد سے گزر جائے گا تو مر جائیں گے یعنی فنا ہوجائیں گے گویا قطرہ دریا میں کھپ جائے گا اور یہی اس کا مقصود ہے، پس درد کا حد سے گزرجانا یہی اس کا دوا ہو جانا ہے۔

عاشقانہ

تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہوجانا
ضعف سے گریہ مبدل بدم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غم فرقت میں فنا ہوجانا

یعنی غم فرقت میں روتے روتے تمام ہوجانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابر بہاری کا برس کر کھلنا ۔ یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے ۔

عاشقانہ

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اسے پر کس وقت

شوخی

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر
بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

عاشقانہ

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

قدر سخن سنجی

بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ
لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر

رضا

ان آبلوں سے پانوں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

عاشقانہ

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

شکوہ ابنائے زماں

یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے مگر اس میں در پردہ اُن لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہتے تھے۔

تصوف

ہرچند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

اس شعر میں سارا زور ''ہم'' کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اُس وقت تک راہ معرفت الٰہی میں ایک اور سنگ گراں سد راہ ہے، پس اگر ہم نے بت توڑنے میں سبک دستی حاصل کی ہے تو کیا فائدہ؟ یہ بڑا بھاری بت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

نالے یعنی ندی نالے نہ آہ و نالے ۔ مثال کس قدر ممثل لہ کے مطابق ہے اور مضمون کتنا مطابق واقع کے ہے، فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رکتی ہے اُسی قدر زیادہ راہ دیتی ہے، خصوصاً جو مضمون وہ اس وقت اپنے حسب حال لکھتا ہے، وہ نہایت مؤثر اور درد انگیز ہوتا ہے۔

غلط فہمی

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

متاع بردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع ۔ یہ مضمون بھی بالکل وقوعیات میں سے ہے، جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہوجاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور اخیر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور ہمارا اقبال پھر عود کرے گا۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

یعنی تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے وہ عشق و محبت کی بدولت ہے، خواہ زن و فرزند کی محبت ہو، خواہ مال و دولت کی، خواہ ملک و ملت کی، خواہ اور کسی چیز کی۔ پس اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اُس کی مثال اس انجمن کی ہے جس میں شمع کی روشنی نہیں۔

عاشقانہ

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

شکوہ اہل وطن

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں

اپنے تئیں خس یعنی پھونس وغیرہ سے اور وطن کو گلخن سے تشبیہ دی ہے یعنی جس طرح پھونس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا تو اس کی کچھ قدر نہیں ہوتی ، یہی حال میرا ہے ، کہ وطن میں تھا تو جلتا تھا اور اب پردیس میں ہوں تو بے قدر ہوں ۔

عاشقانہ

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستم گر ۔ ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

جب کہتے ہیں کہ اس کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کو کام کرنے سے انکار ہے ، پس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیوں کر کھا سکتا ہے ۔ کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اس کو کھا نہ سکوں ، مگر چونکہ وہ ملتا نہیں اس لیے نہیں کھا سکتا ۔

رندانہ

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

معاملہ

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

شوخی

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
آخر زبان تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

فخریہ

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

یہاں ''ہم زباں'' کے لفظ میں ابہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہو سکتی اور در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں۔

عاشقانہ

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

''چکر'' پھرنے کی دھت، کہتے ہیں اس کے پاؤں میں چکر ہے یعنی اس کو پھرنے کی دھت ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی تدبیر مجھے دشت نوردی سے روک نہیں سکتی۔ پس زنجیر جو اس غرض سے میرے پاؤں میں ڈالی گئی ہے، اسے زنجیر نہ سمجھو، بلکہ چکر سمجھو۔

عاشقانہ

حسرت لذت آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہ وفا جز دم شمشیر نہیں

جادہ ، یعنی بڑھیا کو دم شمشیر سے تشبیہ دی ہے ، مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار و تکلیف میں جو لذت ہے ، جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں ، مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے ، اس لیے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے - پس افسوس ہے کہ لذت آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے -

عاشقانہ

الفت گل سے غلط ہے دعوئ وارستگی
سرو ہے با وصف آزادی گرفتار چمن

مطلب یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد و وارستہ مزاج ہو ، دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا -

تصوف

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قبلے پر قبلہ نما کا اطلاق ظاہرا مرزا کے سوا کسی نے نہیں کیا -

عاشقانہ

راز معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں ، خواہ پوشیدہ مصلحت ہو اور خواہ پوشیدہ قباحت ہو - یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے اگر مر جانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت کے ہو جاتے -

عاشقانہ

کہتے ہیں، جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

یہ شعر سہل ممتنع ہے۔ اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

شوخی

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوء ظن ہے ساقئی کوثر کے باب میں

یعنی آج اس خوف سے شراب نہ دینی کہ کل نہ ملے گی ساقی کوثر کی فیاضی پر سوء ظن کرنا ہے۔

عاشقانہ

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

دوسرے مصرع میں بطور طنز کے کہتا ہے کہ جو کچھ وہ جواب میں لکھیں گے مجھے معلوم ہے، یعنی وہ کچھ نہیں لکھنے کے، اس لیے قاصد کے واپس آنے سے پہلے ایک اور خط لکھ رکھوں۔

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس شعر میں پہلے مصرع کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے "پھر آج جو خلاف عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے۔" اس حذف نے شعر کا رتبہ بہت بلند کر دیا ہے، ایسا حذف

جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کیے گئے ہیں وہ بغیر ذکر کیے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہوں ، محسنات شعر میں شمار کیا جاتا ہے ۔

عاشقانہ

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب کا

یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے ۔ یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اُس کا التفات اور میلان طبع پایا جائے ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور ایک نگاہ کا چرانا ایک طرف ، اور اُس کے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف ۔ یہ شعر بھی سہل ممتنع ہے، اگر الفاظ کی طرف دیکھئے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیوں کر ایسے دو ہم پلہ مصرعے بہم پہنچ گئے جن میں حسن ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نظر کیجئے تو ہر ایک مصرعے میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گزرتا رہتا ہے ۔ معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لیے بہت بڑی چیز ہے ، مگر اس کا آنکھ چرانا جو لگاوٹ کی ضد ہے وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے زیادہ دل فریب و دلآویز ہوتا ہے ، اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بے شک دوبالا ہو جاتا ہے ، مگر اس کا غصے میں بگڑنا اُس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوش نما اور دل ربا معلوم ہوتا ہے ۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں ، اس کی اصل خوبی و جدانی ہے

جس کو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

ایک روز مولانا آزردہ مرحوم کے رو برو کسی نے یہ شعر پڑھا، چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے اس لیے مرزا کا کلام سن کر اکثر اُلجھتے تھے اور اُن کی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے، مگر اُس روز اس شعر کو سن کر وجد کرنے لگے اور متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے۔ کہا گیا مرزا غالب کا۔ چونکہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے اور اُس روز لاعلمی میں بے ساختہ اُن کے منہ سے تعریف نکل گئی تھی، غالب کا نام سن کر بطور مزاح کے جیسی کہ اُن کی عادت تھی فرمایا ''اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے۔'' مگر فی الحقیقت یہ شعر بھی معناً و لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ مرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا۔ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے یہ اسلوب بیان آج تک اس عمدگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔

انسان کی مجبوری

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا اُس کے قابو سے باہر ہونا چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حسن تشبیہ کا حق ادا کر دینا ہے۔

تصوف

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یہاں کیا دھرا ہے قطرہ وموج و حباب میں

وحدت وجود اور کثرت موہوم کی تمثیل ہے ، قطرہ و موج و حباب کے ہیچ و ناچیز ہونے کو ایک عام محاورے میں اس طرح ادا کرنا کہ ''یہاں کیا دھرا ہے'' منتہائے بلاغت ہے -

منقبت

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

عاشقانہ

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

سلوک

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

طالب راہ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اس کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے ، طالب اول اول جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد و سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے ، پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اس کا تعاقب کرتا ہے ، وھلم جراً اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا -

تصوف

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفئی منصور نہیں

شکوہ اہل وطن

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

عالی ظرافی

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یہاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اپنی فراخ حوصلگی اور اُس کے ساتھ شرافت نفس کا اظہار ہے یعنی میں جو دونوں جہاں لے کر خاموش ہو رہا ، اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں اُن پر قانع ہو گیا بلکہ مجھ کو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی اس لیے خاموشی اختیار کی -

تصوف

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

شوخی

میں نے کہا کہ ''بزم ناز چاہئے غیر سے تہی''
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

''ستم ظریف'' وہ ظریف جس کی ظرافت کے ساتھ ظلم بھی ملا ہوا ہو۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ میں نے تو رقیب کو غیر سمجھ کر کہا تھا کہ آپ کی محفل غیر سے خالی ہونی چاہئے؛

اُس نے یہ سن کر مجھے بزم سے اُٹھوا دیا یعنی یہاں ایک تو
ھی غیر نظر آتا ھے۔

عاشقانہ

ھو گئی ھے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ھم بے زبانوں پر نہیں

قیامت ھے، کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ھوتا ھے زمانے میں

وہ آئیں گھر میں ھمارے خدا کی قدرت ھے
کبھی ھم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ھیں

اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ھوئی ھے،
دوسرے مصرعے میں اُس کی کیا عمدہ تصویر کھینچی ھے
یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ھے اور کبھی اپنے گھر کو
دیکھتا ھے کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ھوا!

شوخی

کبھی جو یاد آتا ھوں میں تو کہتے ھیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

شکایت

جہاں میں ھو غم و شادی بہم ھمیں کیا کام
دیا ھے ھم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ھے کس لیے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ھوں میں

حد چاھئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ‌گار ھوں کافر نہیں ھوں میں

تناسخ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

انتظار

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہوگئیں

یعقوب کی آنکھوں کو روزن دیوار زنداں قرار دیا ہے کیوں کہ جس طرح روزن زنداں ہر وقت یعقوب پر کشادہ رہتا تھا اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب و روز یوسف کی طرف نگراں رہتی تھیں۔

عاشقانہ

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب دل کے پار
جو مری کوتاہئی قسمت سے مژگاں ہوگئیں

نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم و حیا کے سبب اُوپر نہیں اُٹھتیں بلکہ پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔

شوخی

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہوگئیں

یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو درباں کو دے چکا ہوں، دوست کے

حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاھتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اُس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے کیوں کہ سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ اُن کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا جب کہ دعائیں سب نبڑ چکیں۔

تصوف

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

تمام ملتوں اور مذہبوں کو من جملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے اور کہتا ہے کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایماں بن جاتی ہیں۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بار ہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

تصوف

جب وہ جمال دل فروز، صورت مہر نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

حقیقت و مجاز دونوں پر محمول ہوسکتا ہے۔

نا گریزی غم

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اخلاق

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شائد کثرت نظارہ سے وا ہو

یہ محض خیالی مضمون نہیں ہے بلکہ حقیقت واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے ۔ فی‌الواقع جب انسان گھر کی چار دیواری میں محصور ، دنیا کے حالات سے ناواقف اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا لیکن جس قدر اُس کا دائرہ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اُسی قدر اُس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے کہ لوگوں کی خوش حالی محض اتفاق نہیں ہے جس پر حسد و رشک کیا جاوے بلکہ اُن کی محنت و تدبیر کا نتیجہ ہے اور اس لیے انصاف و فیاضی اُس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے اور بجائے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے میں متوجہ ہوجاتا ہے ۔ اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے کہ "چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو" جس طرح شعرا نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے ۔

وفاداری

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ ، کیا کہیں
بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو

نگوں طالعی

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم صواب سے
ٹیڑھا لگا ہے خط قلم سر نوشت کو

استقلال

آئی اگر بلا تو جگہ سے ٹلے نہیں
ایراھی دے کے ہم نے بچایا ہے کشت کو

عاشقانہ

خدا شرمائے ھاتوں کو، کہ رکھتے ھیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو ، کبھی جاناں کے دامن کو

شکر و بے سرو سامانی

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

رندانہ

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو ، مدرسہ ہو ، کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں از راہ تہذیب اس کام کا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لیے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا ، جب وہی چھٹ گیا ، اب مسجد میں مل جائے تو اور مدرسہ و خانقاہ میں ھاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے ۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص از راہ شوخی کے کی گئی ہے ، یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وھاں بھی مے کدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب

پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔

تصوف

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اس شعر کو حقیقت و مجاز دونوں پر محمول کر سکتے ہیں۔

شکایت

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

اس دن کی سیاہی کیسی ہوگی جس کے آگے رات بھی دن معلوم ہوتا ہے۔

تصوف

یہ کہہ سکتے ہو؟ ہم دل میں نہیں ہیں۔ پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

اس شعر میں مخاطب معشوق حقیقی ہے۔

رندانہ

مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

عاشقانہ

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف۔ تھا ایک انداز جنوں وہ بھی
مرے دل میں ہے غالب شوق وصل وشکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یعنی جب غم دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ھے تو سر اٹھاتے ھی آسمان پر نظر جا پڑتی ھے اور چونکہ وہ جفا پیشہ ھے، اس کے دیکھتے ھی تو یاد آجاتا ھے، اب دوسرا غم شروع ھوجاتا ھے، غرضکہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔

شوخی

ایک جا حرف وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا
ظاھرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ھے

غلط بردار اس کاغذ کو کہتے ھیں جس پر سے حرف بآسانی کزلک وغیرہ سے اڑ سکے اور کاغذ پر اس کا نشان باقی نہ رھے، مگر یہاں از راہ ظرافت غلط بردار کے یہ معنی لیے ھیں جس پر سے حرف غلط خود بخود اڑ جائے۔ کہتا ھے کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرف وفا لکھا تھا سو وہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ھوتا ھے کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ھے کہ جو بات سچے دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی وہ خود بخود مٹ جاتی ھے۔

تصوف

ھے وھی بد مستئی ھر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمین تا آسمان سرشار ھے

ھر ذرہ، یعنی ھر مخلوق، عذر خواہ معافی چاھنے والا یا معذور رکھنے والا۔ اس شعر میں دعویٰ ایسے طریقے سے کیا گیا ھے کہ خود دعویٰ متضمن دلیل واقع ھوا ھے۔

مطلب یہ ہے کہ ذرات عالم ، یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں، اُن کی بد مستی و غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جس کے پرتو وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں۔

عاشقانہ

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

شکایت

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

عاشقانہ

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

شوخی

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ مضمون تھوڑے سے فرق کے ساتھ فارسی غزل میں بھی مرزا صاحب نے باندھا ہے اور وہ یہ ہے :

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ این بندہ خداوند نداشت

معاملہ

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

غیر کو یارب وہ کیوں کر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

یہ شعر معاملے کا ہے جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا ہے اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرعے میں پائی جاتی ہے - ظاہر ہے کہ حیا آنی اور شرما جانا در حقیقت ایک ہی چیز ہے پھر اس کے کیا معنی کہ حیا بھی آتی ہے تو شرما جاتا ہے - بات یہ ہے کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرمانے کا متعلق اور ''گر حیا بھی اس کو آتی ہے'' یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بے جا سے اور ''شرما جائے ہے'' یعنی غیر سے یا اس کے ساتھ تکرار کرنے سے -

عاشقانہ

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

نا امیدی

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

عاشقانہ

فردا و دی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا
تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

کہتا ہے کہ تمھارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو گئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی اور ایسا ہی قیامت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بہ زمانۂ حال ہوجائیں گے - پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گزر گئی - قیامت گزر جانے کے دونوں معنی ہیں نہایت سختی کا زمانہ گزرنا اور خود قیامت کا آ جانا -

رشک

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

شوخی

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

عاشقانہ

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

شکایت

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

شکایت

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

حسرت

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

ضبط راز

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

شوخی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

بیخودی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

عاشقانہ

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

گویا ابھی عشق کے کوچے میں قدم رکھا ہے اور معشوق و عاشق میں جو ناز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں اُن سے ناواقف ہے اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے ۔

عاشقانہ

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

شوخی

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

"بادۂ دوشینہ" یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی - محض از راہ شوخی کے کہتا ہے کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں تاکہ نکیرین اس کی بو کی کراہت سے بغیر سوال جواب کئے چلے جائیں -

تصوف

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

گویا خدا کے سوا کسی کو نہیں جانتے -

نتیجہ بے اعتدالی

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

گرفتاری

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیاں کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ ہم گرفتار ہوئے

شوخی

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

عاشقانہ

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آئے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستم گر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آئے

حسن مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

دوسرے مصرع میں دعویٰ متضمن دلیل ہے؛ معشوق کو مہ خورشید جمال اس لیے کہا ہے تا کہ اس کو ماہ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔

شوخی

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اخلاق

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

عاشقانہ

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے رونق منہ پر
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اسی کے قریب قریب سعدی کا بھی ایک شعر ہے وہ کہتے ہیں :

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اپنی تکلیف یا رنج معشوق پر ظاہر نہیں کر سکتے مگر سعدی کے بیان میں یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ شاید معشوق عاشق کی ظاہری بد حالی

دیکھ کر سمجھ جائے کہ اس کا دل مغموم ہے کیونکہ سعدی کے بیان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کے آنے سے غم جاتا رہتا ہے نہ یہ کہ ظاہری حالت بھی بدل جاتی ہے مگر مرزا کے بیان میں یہ احتمال باقی نہیں رہتا ۔ با ایں ہمہ سعدی کے شعر کو بہر حال مرزا کے شعر پر ترجیح دینی چاہئے کیوں کہ ''الفضل للمتقدم ۔''

عاشقانہ

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال کو اچھا بتایا ہے تو اس کے اچھا ہونے کے یہی معنی سمجھتا ہے کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہو جائیں نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑنے کا یا وبا نہیں آنے کی یا لڑائیاں نہیں ہوں گی وغیرہ وغیرہ ۔

شوخی

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

شکایت

پُرھوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

عاشقانہ

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

شوخی

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

زارنالی

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دئے ہوتے

عاشقانہ

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو ہیں عاشق تمہارے نام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غزل بہاریہ و شکر صحت بادشاہ

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

که زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکش سطح چرخ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کو دیکھنے کے لیے
چشم نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دیندار نے شفا پائی

عاشقانہ

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

شکایت ناقدردانی

قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرانی کے معنی بھاری پن کے بھی ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی۔ کہتا ہے کہ میری قدر اس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہو اور ہر شخص آتے جاتے اس پر پاؤں رکھ کر گذرے، یعنی ہوں تو گراں قدر مگر اس پتھر کی طرح بے قدر ہوں، پس میری گرانی کس قدر ارزانی ہے۔

عاشقانہ

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچ مدانی میری

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

لفظ 'تو' نے جو دوسرے مصرع میں ہے، یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ آنکھ سے لہو روتے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہیں رہا اس لیے دوست کے سرانگشت حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔

عاشقانہ

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یہاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

"بے حوصلگی" یعنی کم ظرفی 'یہاں' سے مراد دنیا۔ معشوق سے کہتا ہے کہ تو اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے جورو ظلم سے تنگ آ کر حاکم سے یا خدا سے تیری فریاد کریں گے کیوں کہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا۔

نیچر کی ہدایت

چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

پھول کے کھلنے کو چاک گریباں سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے؛ کہتا ہے کہ نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیے پس جب تک پھول اپنا دریبان چاک نہ کرے تو بھی گریبان

چاک مت کر ؛ اس میں لطف یہ ہے کہ مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوش جنوں زیادہ ہوتا ہے۔

رندانہ

پلا دے اوک سے ساقی جو منہ سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

تصوف

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

رندانہ

کیوں رد قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

مگس کی قے یعنی شہد۔ زاہد جو شہد کے پینے کو موجب ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے اُس کو شراب پینے کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کے قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

انتظار

ہائے وہاں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ

دی ہے بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے۔

عاشقانہ

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع مرزا صاحب مجھے

شوخی

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

یعنی اس خیال سے کہ تمام عمر اس پر ظلم کئے ہیں اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے اُس کی کیا تلافی ہو سکتی ہے، نیکی نہیں کر سکتا۔

عاشقانہ

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھیرا جائے ہے مجھ سے

اس میں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے؛ مطلب یہ ہے کہ وہ قویٰ جن سے عشق کے ترک کرنے یا اُس کے شدائد پر تحمل کرنے کی قدرت تھی، ابتدائے عشق میں اُنھیں کو صدمہ پہنچا ہے؛ پس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے نہ س پر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے۔

تصوف

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

عاشقانہ

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے
نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیئے

اخلاق

سفینہ جب کہ کنارے پر آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیئے

عاشقانہ

رونے سے اور عشق میں بیباک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

''دھویا جانا'' بےشرم و بیباک ہونا۔ ''پاک'' آزاد یا شھدا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھ سے آنسو نہیں نکلے تھے اس بات کا پاس و لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاھر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے راز عشق کا خیال جاتا رہا۔ ایسے بے شرم و بے حجاب ہوگئے کہ آزادوں اور شھدوں کی طرح کھل کھیلے۔ اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کرنا کہ ''رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہوگئے'' بلاغت اور حسن بیان کی انتہا ہے۔

تصوف

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہوگئے

شاهد حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اس کو تغافل کے ساتھ اور عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ سحابی بھی کہتا ہے۔

رباعی

اے زاھد و عاشق از تو در نالہ و آہ
دور توؤ نزدیک ترا حال تباہ
کس نیست کہ جاں از تو سلامت ببرد
آں را بہ تغافل کشی ایں رابہ نگاہ

پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے تغافل سے تنگ آ کر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے، جب اس نے توجہ کی تو ایک ھی نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا۔

تصوف

جب تک دھان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

صوفیہ کی اصطلاح میں محادثت اور مسامرت (یعنی عبد اور معبود کے درمیان گفتگو ہونا) دو مرتبے ھیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ھیں۔ کہتا ہے کہ شاھد حقیقی کے ساتھ اس معمولی لب و دھن سے بات چیت نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے لیے دھان زخم پیدا کرنا چاھئے، یعنی جب تک دل تیغ عشق سے مجروح نہ ہو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

عاشقانہ

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

یعنی ساری عمر تو وعدۂ صبر آزما کے پورے ہونے کے انتظار میں گزر گئی پھر تیرے ملنے کی تمنا کس وقت کی جاتی ۔

تعریض

بات پر وہاں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

شکایت

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے راہنما کرے کوئی

مایوسی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

زار نالی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

''خواہش پر دم نکلنا'' اس کے پورا ہونے کے لیے جلدی کرنا، چنانچہ کہتے ہیں: کیوں دم نکلا جاتا ہے یا کیوں مرے جاتے ہو ، یعنی کیوں جلدی کرتے ہو۔ پہلے مصرعے میں بمقتضائے مقام یہ الفاظ کہ ''دل میں باقی ہیں'' مقدر ماننے چاہئیں ، باقی شعر کے معنی صاف ہیں ۔

شکایت

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

دوسرے مصرعے میں بہت کے لفظ پر زور دینا چاہئے تا کہ آدم کی نسبت زیادہ بے آبروئی کے ساتھ نکلنا ثابت ہو۔

شوخی

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

عاشقانہ

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

شوخی

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

انتظار

پچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یہاں انتظار ہے

تصوف

اے پرتو خورشید جہاں‌تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

یہ خطاب ہے آفتاب حقیقت کی طرف۔ کہتا ہے کہ جیسا سایہ متّہم بوجود ہے اور فی‌الواقع اس کی کچھ ہستی نہیں ہے اسی طرح ہم بھی اس دھوکے میں پڑے ہیں؛ اگر آفتاب حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر لمعہ فگن ہو جائے تو یہ دھوکا جاتا رہے اور ہم فنا فی‌الشمس ہو جاویں

کیوں کہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کافور ہوا :

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

یہ شعر حقیقت و مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے ، مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے ۔

شوخی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

عاشقانہ

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

شوخی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

اس شعر سے مرزا کی کمال شوخئی طبع ظاہر ہوتی ہے ۔ یہ غزل اُس زمانے میں لکھی تھی جب کہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا ۔ مرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کے لیے منت مانتے ہیں ، مگر منت یہ مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کروں گا ، اُدھر سفر حج کا وہ اشتیاق اور ادھر حج کے ثواب کی یہ بے قدری ۔

رندانه

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

قناعت و غیرت

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھ کو
ہے یوں کہ مجھے دُرد تہ جام بہت ہے

یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ بھی میرے لیے کافی ہے ، مگر اس خیال سے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم همت اور قانع بہ هیچ نہ سمجھے ، اس پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا ۔

قناعت

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یعنی جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے ، اس کا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا ، ساری خرابیاں شہرت اور اقتدار اور نام و نمود کے ساتھ وابستہ ہیں ۔

عاشقانہ

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگاں خوں فشاں کے لیے

شوخی

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

کوشش

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

اس سے زیادہ کوشش کی سختی کسی پیرائے میں بیان نہیں ہوسکتی۔

شوخی

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ھی چار اور نکلیں گے۔ مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے، وہ بھی اس شعر کے انداز بیان پر پروانہ تھے۔ ہم نے مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ ریمارک کیا ہے، یہاں اس کی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی ایک یہ کہ پاسبان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا، دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا، سو یہ دونوں باتیں بصراحت بیاں نہیں کی گئیں۔ صرف کنایہ میں ادا کی گئی ھیں مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ھیں، پہلی بات پر لفظ ''شامت'' اور دوسری پر ''قدم لینا'' صاف دلالت کرتا ہے۔ اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے، یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ھیں۔

اس غزل کے اخیر میں چند شعر نواب فرخ آباد کی مدح میں لکھے ھیں جنھوں نے مرزا کو نہایت اشتیاق کے ساتھ فرخ آباد میں بلایا تھا مگر غالباً مرزا کا وھاں جانا نہیں ھوا ۔ اُن مدحیہ اشعار میں سے صرف دوشعر اس مقام پر لکھے جاتے ھیں :

دیا ھے اور کو بھی ، تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ھے عیش تجمل حسین خاں کے لیے
زمانہ عہد میں ھے اُس کے محو آرائیش
بنیں گے اور ستارے اب آسمان کے لیے

قطعات

قطعہ ۱

یہ وہ قطعہ ھے جو مرزا نے پادشاہ کی حضور میں اس درخواست سے گذارنا تھا کہ اُن کی تنخواہ جو ششماھی گزرنے پر اکٹھی چھ مہینے کی ملا کرتی تھی وہ ماہ بماہ ملا کرے چنانچہ اس درخواست کے موافق ماہ بماہ ملنے لگی تھی۔

اے شہنشاہ آسماں اورنگ
اے جہاں دار آفتاب آثار

تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک درد مند سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ھوئی میری وہ گرمئے بازار

کہ ھوا مجھ سا ذرۂ نا چیز
روشناس ثوابت و سیار

گرچہ از روئے ننگ بے ہنری
ہوں خود میں اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلام کارگذار
خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ[1] سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہوگیا صد شکر
نسبتیں ہوگئیں مشخّص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوق و آرائش سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہئے آخر
جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کے بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان
دھوپ کھاوے کہاں تلک جان دار

---

[1] بادشاہ کی ملازمت سے پہلے بھی مرزا کی آمد و رفت قلعہ میں جاری تھی اور مدحیہ قصیدے برابر بادشاہ کے ہاں گزارتے تھے اور خلعت پاتے تھے ۱۲ -

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقید حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعر نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستاں گر سنئے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میری ابر گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں آدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری[1] سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعہ ۲

شوخی

گو ایک پادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام
ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

بادشاہ کے دربار کا یہ ادب تھا کہ آپس میں جو وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے ؛ چونکہ اردو محاورے میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں اس لیے مرزا نے اس کو اس پیرائے میں بیان کیا ہے ۔

قطعہ ۳

شکریہ

نہ پوچھ اس کی حقیقت ۔ حضور والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

۱۔ شاعری سے مراد یہاں صنعت شاعرانہ ہے، چونکہ یہ قطعہ مرزا نے اپنے خاص طرز کے خلاف بہت سیدھا سادا لکھا ہے تو دعا بھی ایسی ہی سیدھی سادی ہے جس میں کسی طرح کی صنعت شاعرانہ نہیں ہے ۱۲ ۔

جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے تو اکثر مصاحبین اور اہل دربار کے لیے بطور اولوش کے بھیجا کرتے تھے اس کے شکریئے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی پادشاہ کے حضور میں گذرانتے تھے ؛ یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے ۔

لطیفہ

جس وقت چوبدار پادشاہی یہ اولوش لے کر آیا ایک باہر کا رہنے والا طالب علم جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا ، موجود تھا ۔ چوبدار کے چلے جانے کے بعد اس نے مرزا سے متعجّب ہوکر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور اولوش کے تقسیم ہوتی ہے ؟ مرزا نے کہا "ارے احمق ! چنا وہ چیز ہے کہ اس ۔ ایک دفعہ جناب الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں : مجھے دلتے ہیں ، پیستے ہیں ، بھونتے ہیں ، پکاتے ہیں اور مجھ سے سینکڑوں کھانے کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں ۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا ۔ وہاں سے حکم ہوا کہ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جا ۔ ورنہ ہمارا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں ۔

قطعہ ۴

شوخی

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگـر نہ کھاوے تو ناچـار کیا کـرے

مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں بادشاہ کی حضور میں پڑھا گیا تھا جس کو سن کر بادشاہ اور تمام مصاحبین جو دربار میں موجود تھے، بے اختیار ہنس پڑے۔

قطعہ ۵

معذرت

سہـل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل، تین تبریدیں، یہ سب کَے دن ہوئے

ایک شعر میں مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل جن میں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں کس عمدگی سے بیان کی ہے؛ یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے۔

قطعہ ٦

شوخی

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے[1]

۱- شریک غالب اُس شریک کو کہتے ہیں جس کا حصہ دوسرے شریکوں سے غالب ہو۔ شریک غالب لفظ میں جو لطف ہے وہ ظاہر ہے

رباعیات

رباعی ۱

شوخی

مشکل ہے ز بس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن وران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

اس اخیر کے مصرعے میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں: ایک یہ کہ اگر اُن کی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے اور آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ برا مانتے ہیں؛ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں تو سخن وران کامل کی نافہمی اور کند ذہنی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اگر صاف صاف نہ کہوں تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں، پس ہر طرح مشکل ہے۔

رباعی ۲

شکریہ

بھیجی ہے مجھے جو شاہ جم جاہ نے دال
ہے لطف و عنایت شنہشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

پادشاہوں کے ہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو

بادشاہ پسند کہلاتی تھی۔ یہ رباعی اُس کے شکریہ میں لکھی گئی ہے۔

رباعی ۳

مبارکباد سالگرہ

حق شاہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوع دانش و داد کرے
دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

رباعی ۴

شوخی

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں، کہیں خدا سے، اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

اس رباعی میں مرزا نے غایت درجے کی شوخی کی ہے جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم ہر چند دربار کے بااختیار لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں مگر وہ ہماری کام روائی میں درنگ اور لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں کہ آؤ خدا ہی سے کہیں، پھر یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں۔ ''صبح و شام کرنا'' لیت ولعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چوں کہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے تو خدا

کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ وہ صبح شام کرنے والے ہیں مگر شاعر کا اصل مقصود یہی ہے کہ کام روائی خلق میں جیسی لیت و لعل وہاں ہوتی ہے ویسی کہیں نہیں ہوتی کہ اکثر ساری عمر امید ہی میں گزرجاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

رباعی ۵

شوخی

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی بھی اسی قطعہ کے ساتھ جس میں روزے کا مضمون باندھا ہے ، دربار میں پیش کی گئی تھی۔

رباعی ٦

عاشقانہ

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیوں کر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

یہ رباعی عاشقانہ ہے اور بالکل نیا مضمون ہے ''ظلم سے ہاتھ اٹھانا'' اس سے دست بردار ہونا اور اس کو ترک کرنا ، باقی الفاظ کے معنی ظاہر ہیں۔

رباعی ۷

شکریہ

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ھیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فروزے کی تسبیح کے ھیں یہ دانے

بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا ہے ، اُس کے شکریے میں یہ رباعی لکھی ہے ، بڑا فیروزہ جو بیضوی شکل کا ھوتا ہے وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہے ۔

نثر اردو

معلوم ھوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ھمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ھمہ تن "مہر نیم روز" کے لکھنے میں مصروف ھوگئے ، اُس وقت بضرورت اُن کو اُردو میں خط کتابت کرنی پڑی ھوگی ۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوت متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ھوتا ہے ، نہایت کاوش سے لکھتے تھے ، پس جب اُن کی ھمت "مہر نیم روز" کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اُس وقت اُن کو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں شاق معلوم ھوئی ھوگی ۔ اس لیے قیاس چاھتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ھیں ، چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ھیں کہ زبان فارسی میں

خطوط کا لکھنا پہلے سے متروک ہے، پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاری کی قوت مجھ میں نہیں رہی، حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:

مضمحل ہوگئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

غالباً اُردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اول اول اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اُس کی شہرت اور قبولیت کا باعث ہوجاتا ہے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے اور اُن کے اُردو دیوان کو بھی ایک عالی رتبہ کلام عام افہام سے بالاتر سمجھتے تھے مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلیداً تھا نہ تحقیقاً۔ وہ خود اپنے ایک مرتبہ دان اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں "میرے فارسی قصیدے کہ جن پر مجھ کو ناز ہے، کوئی اُن کا لطف نہیں اُٹھاتا مگر بطریق اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے، داد سخن کہاں اور ادراک پایۂ معنی کہاں؟ تاریخ نمریہ (یعنی مہر نیم روز) کے پان سات جزو جو آپ کے پاس بھیجے ہیں میری خاطر نہ کیجیے؛ انصاف سے کہیے کہ یہ نثر کہیں اُور ہے؟ اور پھر اُس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو"

اگرچہ مرزا کی اُردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہیے

ویسی نہیں ہوئی ؛ چنانچہ بعض اوفشل تحریروں میں دیکھا گیا کہ اُردوئے معلیٰ اور بوستان خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے لیکن پھر بھی مرزا کی اُردو نثر کے قدر دان بہ نسبت نا قدر دانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے۔

مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں ، چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختصر رسالے ہیں[1] جو 'برھان قاطع' کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں : لطائف غیبی ، تیغ تیز اور نامۂ غالب ۔ اس کے سوا چند اجزا ایک نا تمام قصے کے بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا ۔ ان میں سب سے زیادہ دل چسپ اور لطف انگیز اُن کے خطوط ہیں جن میں سے زیادہ تر 'اُردوئے معلیٰ' میں اور اُس سے کم 'عود ہندی' میں جمع کر کے چھپوائے گیے ہیں اور بہت سے خطوط ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں جو اب تک شائع نہیں ہوئے مگر عنقریب بعض احباب کا ارادہ اُن کے چھپوانے کا ہے ۔

مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے ؛ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ اُن کے بعد کسی سے اُس کی پوری تقلید ہو سکی ۔ انھوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں

---

۱ - ان کے علاوہ دو ۲ رسالے اور بھی مرزا نے بزبان اردو لکھے تھے جو اُس زمانے میں دہلی سے شائع بھی ہوئے تھے - ان کے نام یہ ہیں : 'سوالات عبد الکریم' اور 'نکات واقعات غالب' پہلا رسالہ خود مرزا نے لکھا اور عبد الکریم طالب علم کے نام سے منسوب کر دیا - دوسرا رسالہ مرزا کے نام سے چھپا - داؤدی

سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں، سب اڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخودار، کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں؛ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں مثلاً اُن کو یہ لکھنا تھا کہ محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گذرا، میں نے پوچھا کہ لوھارو کی سواریاں روانہ ہوگیئں؟ اُس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائیں گی؟ اُس نے کہا آج ضرور جائیں گی تیاری ہو رہی ہے۔ اس مطلب کو اُنھوں نے اس طرح ادا کیا ہے: "محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ! لوھارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔"

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے، اُس میں لکھنا یہ ہے کہ میرن صاحب آئے اور اُن سے یہ باتیں ہوئیں مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اُس کو اس طرح شروع کرتے ہیں "اے میرن صاحب! السلام علیکم۔ حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا، جواب لکھنا

ضرور ہے - حضرت ! وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہوں گے - بھائی ! آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو ؟ سبحان اللہ ! اے لو ، حضرت ! آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے - اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں ؟ کیا عرض کروں ؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا ؛ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے ؛ میں اب پنج شنبہ کو روانہ ہوتا ہوں ، میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا - میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو، تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ ؟ میں بوڑھا آدمی ، بھولا آدمی ، تمہاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا - لاحول ولاقوۃ'' اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر اصل مطلب لکھتے ہیں ۔

بعضی جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اُس کو غائب فرض کر لیتے ہیں یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے انداز بیان سے واقف نہیں ، وہ اُس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں ''میرمہدی ! جیتے رہو - آفریں صد ہزار آفریں - اُردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے -سنو دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوھر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے ؛ یہ [illegible]اص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے کا رہنے والا لوٹ لے گیا مگر میں نے اُس کو بحل

اللہ برکت دے ‘‘

ظاہر ھے کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میرمہدی مجروح ھیں کیوں کہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلۂ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے ، مگر جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے ناواقف ھیں، وہ غلطی سے اس کے دوسرے معنی سمجھ جاتے ھیں ۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلے کا رہنے والا ھے ، ان الفاظ سے یہ دھوکا ھوا ھے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ھے اور لطف یہ ھے کہ میں نے جس قدر اُن کو سمجھایا کہ یہ خود میرمہدی ھی کی نسبت لکھا ھے ، میری نسبت نہیں لکھا ، اُسی قدر اُن کو اس بات کا زیادہ خیال ھوا کہ از راہ کسر نفسی کے ایسا کہتا ھوں ۔

مغربی طریقے پر جو قصے لکھے جاتے ھیں ، اُن میں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ھوتے ھیں جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ھم اوپر دکھا چکے ھیں مگر وھاں پر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا اُن کے ناموں کی کوئی علامت لکھ دی جاتی ھے ورنہ یہ نہیں معلوم ھو سکتا کہ سوال کہاں ختم ھوا ؟ اور جواب کہاں سے شروع ھؤا ؟ مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے اور نہ اُن کے نام کی علامت لکھتے ھیں مگر سوال جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ھیں جس سے صاف معلوم ھو جاتا ھے کہ سوال کیا ھے ؟ اور جواب کیا ؟ شاید قصے یا نوول میں یہ بات نہ چل سکے مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ بالکل صاف کر دی ھے ۔

مرزا کی طرز تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں، یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اس کی پیروی نہ کر سکیں ، مگر وہ چیز جس نے اُن کے مکاتبات کو ناول اور ڈرامہ سے دل چسپ بنا دیا ہے ، شوخئی تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی - ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے مگر اُن کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بھروپ میں ہوتا ہے - مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوتے ہیں اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلّاق ہے ، اُس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ - اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے ، علمی ، اخلاقی ، پولٹیکل ، سوشل اور رلیجس مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دئے ہیں ، بائیوگرافی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں ؛ بادجود اس کے مرزا کی تحریر خط کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دل چسپی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی .

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو - پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اُس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے-

مثلاً ایک اپنے دوست کو خط لکھا ہے، اُس میں اُن کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہوگئی ہے، بعد دعا کے لکھتے ہیں "کیوں بھئی اب ہم اگر کول آئے بھی تو تم کو کیوں کر دیکھیں گے؟ کیا تمھارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟" یا مثلاً نواب میر الدین احمد خان کو جو اب رئیس لوھارو ہیں، اُن کے بچپن کے زمانہ میں اُن کے رقعے کا جواب، جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا، اس طرح لکھتے ہیں "اے مردم چشم جہاں بین غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو یعنی چشم جہاں بین، غالب کی پتلی۔ چشم جہاں بین تمھارا باپ مرزا علاء الدین احمد خان بہادر اور پتلی تم۔ میاں تمھارے دادا تو نواب امین الدین خان بہادر ہیں! میں تو صرف تمارا دل دادہ ہوں۔"

لطیفہ

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے، انھوں نے اُس کا جواب ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا۔ اُس کے جواب میں اُن کو اس طرح لکھتے ہیں "دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔"

شوخی

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا، اُس میں لکھتے ہیں "دھوپ بہت تیز ہے، روزہ رکھتا ہوں، مگر

روزے کو بہلاتا رہتا ہوں ، کبھی پانی پی لیا ، کبھی حقہ پی لیا ، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں ، میں روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا ، یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے ۔''

جس زمانے میں ''برہان قاطع'' پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مؤلف برہان کی حمایت کی ہے، ایک خط میں صاحب برہان کا ذکر کرنے کے بعد اس کی اور اس کے طرف داروں کی نسبت لکھتے ہیں ''ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے ، جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھ دیا ، نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں ، ہندیوں کو کیوں کر مسلم الثبوت جانیں۔ ایک گائے[۱] کا بچہ بزور سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا ، بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے ۔''

لطیفہ

ایک خط کے اخیر میں جو نواب علاؤالدین خاں کو لکھا ہے ، لکھتے ہیں ''استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھپھی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں ، دعا ، اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی و بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے ، سلام اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں ، بندگی

---

۱ یہ اشارہ صاحب برہان قاطع کی طرف ہے ۱۲

اور اس نظر سے کہ سید ہیں ، درود اور موافق مضمون اس مصرعے کے 'سوے اللہ واللہ ما فی الوجود' مسجود ۔''

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں ''دیوان خانے کا حال محل سرائے سے بدتر ہے ۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا ، فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں ۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے ، ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے ۔''

نواب علاؤالدین خاں اور اُن کے والد نواب امین‌الدین خاں میں کچھ شکررنجی ہے ، باپ دلی آئے ہیں اور بیٹے کر لوہارو چھوڑ آئے ہیں، مرزا نواب علاؤالدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں ''سنا گیا کہ نواب امین‌الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا ، پھر دن رہے ، از راہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے ۔ میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے ، بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے ، اس کے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں میں نے کہا اتنا ہی جتنا تم اُس کو چاہتے ہو ؟ ہنسنے لگے ۔ غرض کہ میں نے بظاہر اُن کو تم سے اچھا پایا ، آگے تم لوگوں کے (یعنی احمد بخش خانیوں کے) دلوں کا اللہ مالک ہے ۔''

ایک دفعہ کثرت اخراجات سے تنگ آ کر بعضے ضروری خرچ بند کر دیے ہیں یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا ہے ، نواب علاؤالدین خاں نے اپنے والد کے

اشارے سے اس کا سبب دریافت کیا ہے اور مولوی حمزہ خاں کی طرف سے بطور نصیحت کے مرزا صاحب کو یہ شعر لکھا ہے:

''چوں پیر شدے حافظ از مے کدہ بیروں شو'' الخ

اس کا جواب اس طرح لکھتے ہیں ''بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ادھر درباری مل کو جا مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مُہری موجود، شہد لگاؤ اور چاٹو، نہ مول نہ سود، اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھپھی کے سر؛ با ایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے؛ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار؛ وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے، مول میں قسط اس کو دینی پڑے، انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ؛ تنگ آ گیا، گذارا مشکل ہوگیا! روز مرہ کا کام بند رہنے لگا، سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجایش نکالوں؟ قہر درویش بجان درویش؛ صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف، بیس بائیس روپے مہینا بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گذرا تھا کہ

رام پور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آ گیا ، قرض مقسط ادا ہو گیا ، متفرق رہا ، خیر رہو ؛ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی ، گوشت پورا آنے لگا ۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی اُن کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا''

''اے ۔ خبر ز لذت شرب مدام ما'' دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں ؛ دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے ۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں ، وہ مشرک ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں ، مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابوالائمۃ کا ہم سر مانتے ہیں ، دوزخ اُن لوگوں کے واسطے ہے ؛ میں موحّد خالص اور مومن کامل ہوں، زبان سے 'لااله الاالله' کہتا ہوں اور دل میں 'لا موجود الاالله' 'لا موثر فی‌الوجود الاالله' سمجھا ہوا ہوں ۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے، محمد علیہ‌السلام پر نبوت ختم ہوئی ، یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں ۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ، ثم حسن ثم حسین ، اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام ۔ بریں زیستم ہم بریں بگذرم'' ہاں اتنی اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں ۔ اگر مجھ کو دوزخ میں

ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ تیز کروں گا تاکہ مشرکین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اُس میں جلیں۔ سنو! مولوی صاحب تم نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا 'چوں شدی حافظ از میکدہ بیروں شوالخ' اور پھر پڑھتے ہو اُس کے سامنے کہ اُس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے؛ مجموعۂ نثر جدا گانہ اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں۔''

ایک خط میں تعلقات خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں ''سنو عالم دو ہیں؛ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے 'لمن الملک الیوم' اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے 'للہ الواحد القہار'۔'' ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہ‌گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا)۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا، ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اُس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا، پایان کار مجھے کلکتے سے پکڑ کر لائے اور پھر اُسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا

کہ یہ قیدی گریزپا ہے دو ہتکڑیاں[1] اور بڑھادیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں، سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زندان میں چھوڑ، مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا، میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا، کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا میں بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوئے شہر خود ازین وادی ویراں بروم

ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کو اُن کی محبوبہ چنّاں جان کی تعزیت میں لکھا ہے اُس میں لکھتے ہیں "آپ کا غم فزا نامہ پہنچا، یوسف علی خاں عزیز کو پڑھوادیا۔ اُنھوں نے جو میرے سامنے اُس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اس کی اطاعت اور تمہاری اُس سے محبت، سخت ملال ہوا۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سردفتر اور پیشوا ہیں۔

۱۔ بیڑی سے مراد اہلیہ اور دو ہتکڑیوں سے مراد حسین علی خاں اور باقر علی خاں جن کو مرزا نے اُن کے والد زین العابدین خاں کی وفات کے بعد خود فرزندوں کی طرح پرورش کیا تھا۔

شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہوجائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو، لیلٰی اُس کے سامنے مری تھی تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری بلکہ اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اُس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک........کو میں نے بھی مار رکھا ہے، خدا اُن دونوں کو بخشے اور ہم تم دنوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا واقعہ ہے با آں کہ یہ کوچہ چھٹ گیا، اس فن سے میں بیگانہ محض ہوگیا ہوں لیکن کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں، اُس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو او ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑو:

سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی
عشق محمد بس ست و آل محمد

اللہ بس ما سوائے ہوس۔"

ایک اور خط مرزا صاحب موصوف کو اسی چنّا جان کی تعزیت میں اس طرح لکھا ہے: مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی، ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی کہ ہم کو زھد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اُڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ

بنو ، سو میرا اس نصیحت پر عمل آرہا ہے ۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے ، کیسی اشک افشانی ؟ کہاں کی مرثیہ خوانی ؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنّا جان نہ سہی منّا جان سہی ۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی ، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے ؛ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہوجائے گی ۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی وہی زمردین کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ ، چشم بد دور وہی ایک حور ، بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ ۔

زن نو کن اے دوست ہر نو بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بہ کار

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے اس کی رسید اس طرح لکھتے ہیں ”حلیۂ مبارک نظر افروز ہوا ـــــ تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے ، تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کرتے تھے ، اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے ۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی گھٹی ہوئی ہے ، وہ مزے یاد آئے ، کیا کہوں جی پر کیا گزری ؟ بقول

شیخ علی حزین ؛

تا دسترسم[1] بود زدم چاک گریبان
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

جب ڈاڑھی موچھ میں بال سفید آ گیے ، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے ؛ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ؛ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی ۔ مگر یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام ملا ، حافظ ، بساطی ، نیچہ بند ، دھوبی ، سقا ، بھٹیارہ ، منہ پر ڈاڑھی سر پر بال ۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا ۔''

الغرض مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہ ہوں یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا ۔

منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں: ''بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہوگیا یعنی منگل کے دن ۱۸ - ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی ، مر گئی ۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے ؛ تین پھوپھیاں ، اور تین چچا ، اور ایک باپ ، اور ایک دادی ، اور ایک دادا ؛ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے

۱۔ یہاں اس شعر کے لکھنے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب تک مجھے موقع ملا برابر ڈاڑھی کا حق ادا کرتا رہا - پس اس سے میں کسی طرح شرمندہ نہیں ہوں ۱۲ -

سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گیے۔''

ایک ایسی ہی تحریر میں نواب امین‌الدین خاں کو لکھتے ہیں ''آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخرالدولہ کی جگہ ہو، میں 'لم یلد و لم یولد' ہوں۔''

مرزا قربان علی بیگ سالک کو خط میں لکھتے ہیں: ''یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے؛ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا بڑا کافر مرا؛ ہم نے از راہ تعظیم (جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں) چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم‌الدولہ بہادر!!! ایک قرض‌دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے؛ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں؛ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو، بولے کیا بے حیا، بے عزت؟ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے، یہ بھی تو سونچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔''

فتح دھلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے، اس کی کیفیت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اس طرح لکھتے ہیں ''صاحب تم جانتے ہو کہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے؛ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات؛ نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا؛ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس کے محلے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا؛ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفۃ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں، ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گیے ہیں۔''

ایک خط میں نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں:
''کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے؛ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ

دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے ، وہ دلی نہیں ہے جس میں میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں ، وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں ؛ ایک کیمپ ہے ، جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود ، بادشاہ کے ذکور جو بقیۃالسیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں —— امرائے اہل اسلام میں اموات گنو تو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن‌دار ، مہینے کا روزینہ دار بن کر نا مرادانہ مر گیا ، میر ناصرالدین باپ کی طرف سے پیر زادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیر زادہ مظلوم مارا گیا ، آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہوچکا ہے ، بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا ، انجام کار مر گیا ، تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی ۔ احیا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا اس کے پاس ایک پیسہ نہیں ، ٹکے کی آمد نہیں ، مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے ۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر اور نوش جان کر کے بیک بینی و دوگوش بھرت پور چلے گئے ۔ ضیاءالدولہ کی پانسو روپیہ کرائے کی املاک و گزاشت ہو کر پھر قرق ہوگئی ، تباہ و خراب لاہور گیا ، وہاں پڑا ہوا ہے ، دیکھئے کیا ہوتا ہے ۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلبھ گڈھ فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں ، شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں ، ہنر مند آدمی یہاں کیوں پایا جائے ؟ جو حکما کا حال کل لکھا ہے ، وہ بیان واقع ہے ، صلحاء اور

زهاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے، اُس کو بھی سچ جانو۔''

بعض خطوں میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا بیان نہایت مؤثر طریقے میں کیا ہے جس سے اُن کے خیالات معلوم ہوتے ہیں مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں ''ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے، ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی؛ رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دور دراز درپیش ہے، زاد راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں، اگرنا پرسیدہ بخش دیا تو خیر اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقرہے اور ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایک اور خط منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں: ''تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بو علی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں، زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندؤں میں اگرچہ کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا، دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا، کچھ معاش ہو کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے۔ اے یار جانی، ہر چند وہ بھی وہم ہے، مگر میں ابھی اسی

پائے پر ہوں، شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالم بے رنگی میں گزر پاؤں، جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم، بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں، ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں، یہ دریا نہیں ہے سراب ہے، ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں، مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہو۔ اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا۔"

مرزا نے بعض اردو خطوں میں اور خاص کر اردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفات باردہ میں شمار کیا جاتا ہے خصوصاً اردو جو بہ مقام عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی مگر مرزا نے جس قسم کی مسجع عبارت اردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے اُس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اُس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لیے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بسبب لزوم مالا یلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے، دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اُسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خود سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں

غایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کرا[1] چکا ہو۔ یہاں اس کی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے، مرزا کے اُردو رقعات میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر یہ معلوم رہے کہ مقفیٰ عبارت مرزا خاص کر اُن خطوں میں لکھتے تھے جن سے ہنسی، ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزنت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادھی نثر عاری میں کرتے تھے مثلاً سید یوسف کو مرزا اُن کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں:

"یوسف مرزا کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر، یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی، دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ

۱۔ تھوڑا سا آگے چل کر یہی مولانا حالی انھیں مرزا غالب کی مسجع تقریظوں کے متعلق رقم طراز ہیں:—

"مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع و مقفیٰ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اردو خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے۔ خصوصاً سجع کی رعایت نے ان میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے"

ایک جگہ مرزا کی سجع نثر کی تعریف کی جاتی ہے اور دوسری جگہ اسے تصنع اور آورد کا نمونہ بتایا جاتا ہے۔ یہ تضاد بیانی نہیں تو اور کیا ہے؟ داؤدی

بے سرو پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جوان مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا ؛ نہ قید حیات رہی ، نہ قید فرنگ''۔

آنھیں کو بیٹے کی تعریت اس طرح لکھتے ہیں ''اے میری جان ! اے میری آنکھو !

ز ھجران طفلے کہ در خاک رفت
چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ وہاں رہ کر کیا کرتا ؟ ہرگز غم نہ کرو اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے ؛ اولاد بہت ، نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔ ہاں مظفر الدولہ کا غم من جملہ مواقعات کربلائے معلیٰ ہے۔ یہ داغ جیتے جی نہ مٹے گا''۔

مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع و مقفیٰ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اردو خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے خصوصاً سجع کی رعایت نے اُن میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن مرزا کو اس میں معذور

سمجھنا چاہئے[۱]؛ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمایش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفات باردہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے، اُس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

باایں ہمہ ان میں سے بعض نثریں مرزا کی روش خاص میں نہایت ممتاز ہیں خصوصاً وہ دیباچہ جو اُنھوں نے مفتی میر لال صاحب کی کتاب سراج المعرفۃ پر لکھا ہے۔ اس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلیٰ خیالات ظاہر کیے ہیں، اُس کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اُس کے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے نہیں لکھے۔

کتاب سراج المعرفۃ، جس پر مرزا نے یہ دیباچہ لکھا ہے، اُس میں مفتی میر لال نے مرحوم بہادر شاہ کے ایما سے تمام اشغال و اذکار جو آں حضرت کے زمانے کے اس وقت تک سینہ بسینہ یا سفینہ بسفینہ چلے آتے تھے، ایک جگہ جمع کئے تھے، مرزا نے اپنے دیباچے میں دکھایا ہے کہ ان اشغال واذکار کو معرفت الٰہی میں کیا دخل ہے اور کیوں کر ان کے ذریعے سے توحید وجود تک سالک کی رسائی ہوسکتی ہے۔ دیباچہ مذکور کا اول و آخر کا حصہ چھوڑ کر صرف وہ مقام جس میں مرزا نے

۱- ابھی پیچھے مولانا حالی ہی مرزا کی مسجع نثر کی بے حد تعریف کر چکے ہیں اور اسے ہر قسم کے عیب سے پاک بتا چکے ہیں۔ یہاں اس میں تصنع اور آورد کہاں سے آ گیا؟ داؤدی

مذکورۂ بالا مقصد کو بیان کیا ہے، یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مرزا لکھتے ہیں کہ "حق یوں ہے کہ حقیقت از روئے مثال ایک نامۂ درہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے لَا مُؤثر الّا اللہ، اور خط میں مندرج ہے، لَاموجود الّا اللہ اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں؛ آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی۔ انبیائے پیشیں صلوات اللہ علی نبینا و علیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے، خاتم الانبیاء کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری آٹھادیں اور حقیقت بے رنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھادیں۔ اب گنجینۂ معرفت خواص آمت محمدی کا سینہ ہے اور کلمۂ لَا الٰہ الّا اللہُ مفتاح باب گنجینہ ہے، زہے عامۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود جو اصل مقصود ہے آن کی نظر میں نہیں، مگر جب لَا الٰہ الّا اللہُ محمد الرسولُ اللہ کہیں گے، آسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدم گاہ پر آرہیں گے یعنی ہماری اس کلمے سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا؛ یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی اور یہی معنی ہیں رحمۃ اللعالمین ہونے کے اور اسی مقام سے ناشی ہے ندائے روح افزائے من قال لَا الٰہ الّا اللہُ دخَلَ الجنّۃ۔"

قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے لیکن وحدت حقیقی کا راز داں ہے۔ گفتگوئے توحید میں وہ لذت ہے کہ جی

چاھتا ھے کہ کوئی سو بار کہے اور سو بار سنے - نبی کی حقیقت ذو جہتین ھے ، ایک جہت خالق کہ جس سے اخذ فیض کرتا ھے اور ایک جہت خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ھے -

نبی را دو وجہ ست دلجوئے خلق
یکے سوئے خالق یکے سوئے خلق
بداں وجہ از حق بود مستفیض
بدیں وجہ برخلق باشد مفیض

یہ جو صوفیہ کا قول ھے کہ ''الولَایۃُ افضلُ من النبوّۃ'' معنی اس کے صاف اور از روئے انصاف یہ ھیں کہ ولایت نبی کی کہ وہ وجہ الی الحق ھے افضل ھے بنوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ھے ، نہ یہ کہ ولایت عام افضل ھے نبوت خاص سے، جس طرح نبی مستفیض ھے حضرت الوھیت سے اسی طرح ولی مستنیر ھے انوار نبوت سے - مستنیر کی تفضیل منیر پر اور مستفیض کو ترجیح مفیض پر ھرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں - اب وہ ولایت کہ خاصۂ نبی تھی نبوت کے ساتھ منقطع ھوگئی مگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ھے مشکواۃ نبوت سے ھنوز باقی ھے ؛ نقل و تحویل ھوتی چلی آتی ھے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ھے اور یہ سراج ایزدی تا صبح ظہور قیامت روشن رھے گا اور اب اسی کا نام ولایت اور یہی مشعل طریق ھدایت ھے - ولایت و ھدایت وھی حقیقت توحید ذاتی ھے کہ جو از روئے کلمۂ لا الہ الا اللہ مشہود عیون اعیان امت اور منظور نظر اکابر ملت ھوئی ھے - مگر وہ بات اب کہاں کہ ایک بار لا الہ الا اللہ کہے اور دل نور معرفت سے منور ھو جائے اور

وہ ضامن زہر دست کہاں کہ قائل لا الہ الا اللہ کو اگرچہ اُس کے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو ، قدم گاہ توحید پر قائم کردے یعنی رسول مقبول واجب التعظیم قائل انا احمد بلا میم علیہ تحیّۃ والتسلیم ۔ اب سعادت بقدر ارادت ہے اور راحت بعد جراحت ۔ سچ بھی تو ہے ، آدمی کیوں کر سمجھ سکے اور بطلان بدیہیات کے جواز پر اُس کو کیوں کر تسلی ہو ، یعنی اس مجموع موجودات کو کہ افلاک و انجم و بحار وجبال اسی میں ہیں ، نیست و نابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے :

اے کردۂ بہ آرائش گفتگار بسیچ
در زلف سخن کشودہ راہ خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش میدانی
ذاتیست بسیط منبسط دیگر ہیچ

جب اولیاء اللہ نے کہ وہ اطباء روحانی ہیں ، دیکھا کہ نقوش بشری پر وہم غالب ہے اور بسبب استیلاء وہم کے مشاہدۂ وحدت ذات سے محروم رہے جاتے ہیں ہر چند اُن کو سمجھائیں گے ، راہ پر نہ آئیں گے ، ناچار اشغال و اذکار وضع کئے تا قوت متخیلہ اُس میں اُلجھی رہے اور رفتہ رفتہ بے خودی طاری ہو جاوے ۔ وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو اور ہم اُس کو بجبر یا بہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں ۔ دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست ۔

وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے ۔ پس وہ وہم شغل و ذکر کی طرف مشغول ہو گیا ، بے شبہ اپنے کام سے یعنی

صورت گری اور پیکر تراشی سے معزول ہوگیا ، بے خبری چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بمجرد فہم حاصل ہوتی ہے ، اس شاغل کے نفس کو بے خودی میں آگئی ۔ ایک دریا میں جان کر کودا ، ایک کو کسی نے غافل کر کے دھکیل دیا ، انجام دونوں کا ایک ہے ؛ وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں ، یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں مگر ہاں کم ہیں اور مخفی ہیں اور کہیں کہیں ہیں اور ایسے نفوس کہ جو کسب حالت بے خودی کے واسطے محتاج اشغال و اذکار ہیں بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں ۔"

نظم و نثر فارسی

فارسی لٹریچر میں ایشیائی مذاق کے موافق جو دست گاہ مرزا نے بہم پہنچائی تھی اور فارسی نظم اور فارسی نثر دونوں میں جو بلند پایہ اُنھوں نے حاصل کیا تھا، اُس کو اس زمانے میں کما حقہ لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے جب کہ اُس زمانے میں جب بہت سخن سنج اور نکتہ پرور موجود تھے، مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدردانی کی شکایت کرتے تھے تو اب کیا امید ہو سکتی ہے کہ اُن کی قدر جتائی جا سکے۔ ہم سے اگر کچھ ہو سکتا ہے تو صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ ان کے ہر قسم کے کلام میں سے کچھ کچھ بطور نمونے کے پبلک کے سامنے پیش کر دیں اور چونکہ فارسی زبان سے ملک میں عموماً اجنبیت ہو گئی ہے، اس لیے جہاں جہاں ضرورت دیکھیں، مرزا کے کلام کی شرح بھی کرتے جائیں۔ اس سے شاید یہ فایدہ ہو کہ مرزا کی قوت متخیلہ میں جو غیر معمولی اُپج اور پرواز قدرت نے ودیعت کی تھی، سمجھ دار آدمی اُس کا کسی قدر اندازہ کر سکیں لیکن زبان اور بیان کی خوبی جو ایک وجدانی چیز ہے اور جس کے نقاد اور جوہری ملک میں کمیاب بلکہ نایاب ہیں، اُس کی نسبت صرف مرزا کا یہ فصیح و بلیغ شعر لکھ دینا کافی معلوم ہوتا ہے:

بیاورید گر ایں جا بود زبان دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

البتہ ایک مختصر گُر مرزا کے متعلق یہاں بتا دینا ضرور ہے جو اُن کا کلام دیکھتے وقت یاد رکھنا چاہئے۔ اگرچہ مرزا کو

فارسی زبان میں (خواہ نظم ہو خواہ نثر) ہر قسم کے مضامین بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشاق و ماہر و مسلم الثبوت اُستاد کو ہونی چاہئے لیکن جس طرح تمام ممتاز اور نامور شعرا میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت دیکھی گئی ہے اسی طرح مرزا بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہ تھے ؛ تصوف ؛ حب اہل بیت ، فخر ، شوخی و ظرافت و رندی و بے باکی ، بیان رنج و مصیبت و شکایت و زار نالی، اظہار محبت و ہمدردی ، حسن طلب ، یہ چند میدان ایسے تھے جن کا بیان مرزا کے تمام اصناف سخن میں اکثر نہایت لطیف و ملیح و مرقص واقع ہوا ہے ۔ بے شک یہ بات اُن کے عشقیہ مضامین و اخلاق و موعظت کے بیان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی کیوں کہ عشق و محبت اور تمام تعلقات و معاملات عاشق و معشوق کا بیان جیسا کہ ظاہر ہے ، محض نیچرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے جس کو مرزا نے جا بجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ، ابا کرتا ہے ۔ برخلاف اس کے مرزا اصناف کلام میں اپنی مصطلح شاعری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے (الاماشاءاللہ) ۔ اسی لیے اُن کے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال جزالت اور متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان اور غزل کا ایمان ہے ، عام طور پر نہیں پائی جاتی ۔ اخلاق و موعظت کا بیان بھی اسی لیے موثر اور دلاویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور صاف اور شاعرانہ تکلفات سے پاک نہ ہو ، دلوں میں گھر نہیں کر سکتا مگر اس سے مرزا کی اُستادی میں کچھ فرق نہیں آتا ۔ جب سعدی کی رزم کی

نسبت کہا جاتا تھا ''کہ ایں شیوۂ ختم ست بر دیگراں'' اور با ایں ہمہ سعدی کی اُستادی کو سب نے تسلیم کیا تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت ایسا کہنے سے مرزا کی اُستادی میں کیوں کر فرق آ سکتا ہے ۔ یہ میزان جو ہم نے مرزا کے کلام کی نسبت بتائی ہے اُس کو ان کے کلیات نظم و نثر میں جانچنا چاہیے نہ انتخابی اشعار میں جو اس کتاب میں درج کیے گیے ہیں ۔

مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشا پردازی کے متعلق یہ بات قابل غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے پچاس (۵۰) برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی تکمیل اور اُس میں ترقی کرنے پر مستعد و سرگرم رکھا جس کا زمانے میں کوئی قدر دان نہ تھا ۔ اُن کے ممدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان و اعیان تھے جو فارسی زبان اور خاص کر فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے یا بادشاہ اور سلاطین و امرا و رؤسا تھے جن کو مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت ۔ وہ شخص جس کا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے ، جس کی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لے جائے ، جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابوالفضل اورظہوری کی نثریں پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں اُس کو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس (۵۰) روپیہ ماہوار ملتا تھا اور وہ بھی چھ سات برس سے زیادہ نہیں ملا ۔ گورنمنٹ کے ارکان و اعیان کی مدح کے جلدو میں مرزا کو اُس خلعت کے سوا کبھی کچھ نہیں مرحمت ہوا جو فوراً فروخت ہو کر سرکاری چپراسیوں کے انعام میں

صرف ہو جاتا تھا۔

مرزا کے ماننے والے اور اُن کے فارسی کلام پر ایمان بالغیب رکھنے والے بلا شبہ ملک میں بے شمار تھے مگر ایسے خوش اعتقادوں کی کثرت اور اُن کی تحسین و آفرین سے شاعر کا دل ہرگز نہیں بڑھ سکتا؛ پس جب کہ ممدوحوں کی قدر دانی کا وہ حال ہو اور مادحین کی مدح سرائی کا یہ رنگ، تو پھر وہ کیا چیز تھی جس کو مرزا کی اصلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ شاعر کے دل میں اصلی ترقی کا ولولہ نہ سلاطین و امراء کی داد و دہش سے پیدا ہو سکتا ہے اور نہ خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے بلکہ اُس کا دل بڑھانے والی صرف دو چیزیں ہیں جو خواہی نخواہی اُس کو ترقی کرنے پر مجبور کرتی ہیں؛ اولاً سبق استعداد اور فطری قابلیت جس کا اقتضا یہ ہے کہ اگر تمام عالم میں ایک قدر دان یا مخاطب صحیح نہ ہو تو بھی وہ اپنے جوہر ظاہر کیے بغیر نہیں رہتی؛ جس طرح مور خواہ ویرانے میں ہو اور خواہ آبادی میں اُس کو مستی اور نشاط کے عالم میں ناچنے سے گریز نہیں اسی طرح وہ شاعر جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے، بغیر اس کے کہ ملک میں کوئی اُس کی قدر کرے یا اُس کے کمال کی داد دے، اپنے ہنر کی تکمیل میں ہاتھ پاؤں مارے بغیر نہیں رہ سکتا؛ دوسرے اُس فطری ملکہ کا تحریک دینے والا اور اُس آگ کا پتھر سے نکالنے والا اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ سوسائیٹی میں کچھ لوگ فی الحقیقت سخن فہم و سخن سنج موجود ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما

رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمر طبیعی اختتام کے قریب پہنچ گئی تھی مگر حسن اتفاق سے اس اخیر دور میں چند صاحبان فضل و کمال خاص دارالخلافہ دھلی میں ایسے پیدا ھو گئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعرو سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے۔ ان چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضل حق خیر آبادی ثم الدھلوی، مولانا مفتی محمد صدرالدین خاں متخلص بہ آزردہ، مولوی عبداللہ خاں علوہ، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، نواب مصطفیٰ خاں حسرتی، نواب ضیاءالدین احمد خاں نیّر، سید غلام علی خاں وحشت وغیرھم ھیں۔ در حقیقت ان لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ھونا اُن کی شاعری کے حق میں بعینہ ایسا تھا جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خان خانان، ابوالفتح، فیضی اور ابوالفضل کا اُن کے زمانے میں ھونا۔

اگرچہ ان بزرگواروں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو ظاھرا مرزا کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے؛ لیکن چوں کہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے اس لیے جس طرح قدردانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا اسی طرح نکتہ چینیوں کے خیال سے اُن کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا اور اُن کے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لیے اظہار کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور اس طرح قدردان اور نکتہ چین دونوں اُن کی ترقی کا باعث تھے۔

لطیفہ

مولانا فضل حق با ایں ھمہ علم و فضل مرزا کو جس

رتبے کا شاعر مانتے تھے اُس کا اندازہ حکایت ذیل سے ہو سکتا ہے۔ مولانا کے شاگردوں میں سے ایک شخص نے ناصرعلی سرہندی کے کسی شعر کے معنی مرزا صاحب سے جا کر پوچھے۔ اُنھوں نے کچھ معنی بیان کیے اُس نے وہاں سے آ کر مولانا سے کہا ''آپ مرزا صاحب کی سخن فہمی اور سخن سنجی کی اس قدر تعریف کیا کرتے ہیں؛ آج اُنھوں نے ایک شعر کے معنی بالکل غلط بیان کیے،، اور پھر وہ شعر پڑھا اور جو کچھ مرزا نے اُس کے معنی کہے تھے بیان کیے۔ مولانا نے فرمایا ''پھر ان معنوں میں کیا برائی ہے؟،، اُس نے کہا برائی تو کچھ ہو یا نہ ہو، مگر ناصرعلی کا یہ مقصود نہیں ہے۔ مولانا نے کہا اگر ناصرعلی نے وہ معنی مراد نہیں لیے جو مرزا نے سمجھے ہیں تو اُس نے سخت غلطی کی۔

مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے اور وہ مقطع یہ ہے۔

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب
گر ترقی نہ کنم شیخ علی را مانی

مومن خاں مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سنا اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔

لطیفہ

ایک صاحب نے جو مومن خاں مرحوم کی تعلیوں سے خوب واقف تھے، یہ حکایت سن کر کہا کہ مومن خاں نے یہ اس لیے کہا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے

برتر و بلند تر سمجھتے تھے ورنہ وہ ہر گز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ہمیشہ مرزا کو ظہوری و عرفی کا ہم پایہ کہا کرتے تھے اور صائب و کلیم وغیرہ سے اُن کو بمراتب برتر اور بالاتر سمجھتے تھے۔ نواب ضیاءالدین خاں کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین یعنی (امیر خسرو) سے ہوئی اور ایک ترک ایبک (یعنی مرزا غالب) پر اُس کا خاتمہ ہو گیا۔ سید غلام علی خاں وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربیہ کی طرف متوجہ ہو جاتا تو عربی شعر میں دوسرا متبنی یا ابو تمام ہوتا اور انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔

مولانا آزردہ بے شک مرزا کی طرز خاص کو جو اُنھوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی، ناپسند کرتے تھے اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے خاطر نشین ہو گیا تھا وہ اخیر تک اُن کے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا، چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے اُس میں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے کہ مولانا اُن کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائب و آلام و شکایت روزگار وغیرہ کا بیان ہے، اُس کے بعد مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں:

باچنیں آندہ کہ پُر گفتیم و دل خالی نشد
خواجہ گر آندہ گسار من نہ بودے۔ وائے من

آنکہ در یکتائی وے در فن فرزانگی
متفق گرویدہ رائے بو علی بارائے من

آنکہ چوں خواھد بنامش نامہ نامی ساختن
بر نگار و عقل فعالش "کرم فرمائے من"

دل بدیں وصفم نیاساید سخن کوتہ کنید
آنکہ ننگ اوست بودن درسخن ھمتائے من

یعنی بوعلی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاق رائے کرنا اور عقل فعال کا اس کو "کرم فرمائے من" لکھنا، یہ سب باتیں اُس کی مدح کے لیے کافی نہیں ھیں۔ مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ھے کہ شعر میں مجھ جیسے شخص کا ھم سر و ھمتا ھونا بھی اُس کے واسطے موجب ننگ و عار ھے۔ اس میں قطع نظر اس کے کہ ممدوح کی اور اُس سے بھی زیادہ اپنی تعریف، ایک نہایت لطیف پیرائے میں بیان کی ھے، اس بات کا بھی اشارہ ھے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

مرزا کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ھے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر جب کہ راقم بھی موجود تھا، آزردہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے، کھانے میں دیر تھی، فارسی دیوان غالب کے کچھ اوراق پڑے ھوئے مرزا کی نظر پڑ گئے، اُن میں ایک غزل تھی جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا اور جس کا مطلع یہ ھے:

نشاط معنویاں از شراب خانۂ تست
فسون بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

مرزا نے وہ اوراق اٹھا لیے اور مولانا آزردہ سے مزاح کے طور کہا "دیکھئے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے۔" کہہ کر غزل پڑھنی شروع کی ؛ اول کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی ، مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر جیسی کہ اُن کی عادت تھی کہنے لگے "کلام مربوط ہے ، مگر نوآموز کا کلام معلوم ہوتا ہے۔" سب حاضرین ہنس پڑے ، جب مقطعے کی نوبت آئی ، مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کر کے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا :

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

اُس وقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرما کر خاموش ہو رہے۔

صہبائی اور علوی بھی چونکہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا غالب نے اُس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا تھا اس لیے وہ مرزا کو اور مرزا اُن کو کم مانتے تھے لیکن چونکہ یہ تمام گروہ سخن فہموں اور سخن سنجوں کا تھا اور شاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مڈ بھیڑ ہوتی رہتی تھی ، مرزا کو اپنے خیالات کی اصلاح اور اپنے اشعار کی تہذیب و تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور یہی اُن کی اصلی ترقی کی بنیاد تھی۔

غزل

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے فارسی غزل بھی اول

مرزا بیدل وغیرہ کی طرز میں کہنی شروع کی تھی چنانچہ اس قسم کی بہت سی غزلیں اُن کے دیوان میں اب تک موجود ہیں ، مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخرکار عرفی ، ظہوری ، نظیری اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا ۔ وہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے ''اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی ، لیکن آزردہ روی کے سبب زیادہ تر اُن لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے ۔ آخر جب اُن لوگوں نے جو اس راہ میں پیش‌رو تھے ، دیکھا کہ میں باوجودیکہ اُن کے همراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں، اُن کو میرے حال پر رحم آیا اور اُنھوں نے مجھ پر ''مربیانہ'' نگاہ ڈالی ؛ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی ، طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اُس کو فنا کر دیا ، ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زاد راہ باندھا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا ۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار ، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا ۔''

مرزا کے اس بیان سے پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں خاص نظیری کی روش پر چلتے تھے مگر اُن کی غزلیات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی غزل میں نہ صرف نظیری بلکہ عرفی ، ظہوری ، طالب آملی ، جلال اسیر اور

اُن کے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے ؛ البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے ، اُن کی غزل بلا شبہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے لیکن طرز بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی ۔

ناظم ہروی کی چند بیتیں مشہور ہیں جن میں عنصری سے لے کر جامی تک ہر زمانے میں جو شاعر سر بر آوردہ ہوا ہے اُس کا نام لیا ہے ۔ اُن کے آخر میں مرزا نے ایک بیت اپنی طرف سے اضافہ کی ہے ؛ چونکہ اصل مثنوی اور اُس پر مرزا کا اضافہ فائدے اور لطف سے خالی نہیں ہے اس لیے ہم اُس کو یہاں نقل کرتے ہیں ۔ ناظم کہتا ہے :

”شنیدم کہ در دور گاہ کہن
شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی
بہ فردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن
بہ خاقانی آمد بساط سخن
چو خاقانی از دار فانی گذشت
نظامی بہ ملک سخن شاہ گشت
نظامی چو جام اجل در کشید
سر چتر دانش بہ سعدی رسید
چو اورنگ سعدی فرو شد زکار
سخن گشت بر فرق خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید
ز جامی سخن را تمامی رسید“

اس کے بعد جو کمی ناظم کے بیان میں رہ گئی تھی اُس کو مرزا نے یوں پورا کیا ھے :

''ز جامی بہ عرفی و طالب رسید
ز عرفی و طالب بہ غالب رسید''

اگرچہ مرزا نے بیدل اور اُن کے متبعین کی زبان اور اُن کے انداز بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا اور اس خصوص میں وہ اھل زبان کے طریقے سے سرِمُو تجاوز نہیں کرتے تھے مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رھی۔ لیکن آخرکار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ھو گئی تھی - ھم اس مقام پر اُن کی غزلیات میں سے زیادہ تر صاف صاف اور کسی قدر وہ اشعار بھی نقل کریں گے جن کے بغیر مرزا کی طرز تخیل اور اُن کے شعر کی خصوصیت ظاھر نہیں ھو سکتی -

انتخاب غزلیات فارسی

توحید

شاھد حسن ترا در روش دلبری
طرۂ پُرخم صفات موی میان ما سوا

یعنی اگر تیرے حسن کو مثل شاھدان مجازی کے ایک شاھد قرار دیا جائے تو اس کا طرۂ پُرخم کیا ھو گا ؟ صفات الٰہی اور اُس کا 'موی میان' کیا قرار پائے گا ؟ ما سویٰ اللہ۔ شعرائے متصوفین صفات الٰہی کو اکثر زلف و گیسو اور طرہ و کاکل کے ساتھ تعبیر کرتے ھیں اور چونکہ ماسویٰ اللہ کو صوفیہ معدوم محض جانتے ھیں اور معشوق کی کمر کو

عشاق معدوم قرار دیتے ہیں اس لیے شاہد حسن حقیقی کی کمر ماسویٰ کو قرار دیا ہے ۔

توحید

آب نہ بخشی بزور خون سکندر ہدر
جان نہ پریری بہیچ نقد خضر نار دا

ہدر یعنی حلال مشہور ہے کہ سکندر آب حیواں کی تلاش میں گیا تھا، مگر ناکام رہا ۔ کہتا ہے کہ تو زور حکومت سے کسی کو پانی نہیں دیتا پس اگر سکندر آب حیواں کے نہ ملنے کے سبب ہلاک ہو جائے تو ہو ۔ دوسرے مصرعے میں خدا کی بے نیازی کا بیان ہے یعنی جان جیسی عزیز چیز مفت نذر کرتا ہے، مگر تو اس کو قبول نہیں کرتا اور اس لیے اس کو کسی طرح موت نہیں آتی ۔

توحید

بزم ترا شمع و گل خستگے بوتراب
ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

یعنی تیرے ہاں وہی سب سے زیادہ مقرب اور برگزیدہ ہیں جو سب سے زیادہ نشانۂ حوادث و مصائب و آلام ہیں ۔

توحید

سادہ ز علم و عمل مہر تو ورزیدہ ام
مستی ما پائیدار بادۂ ما ناشتا

''ناشتا'' نہار منہ رہنا، نہ کھانا نہ پینا ۔ دوسرے مصرعے کے یہ معنی ہیں کہ گو میں نے شراب کا ایک قطرہ نہیں پیا، مگر نشے میں ہر وقت رہتا ہوں یعنی گو علم و عمل کچھ نہیں رکھتا

مگر تیری محبت میں سرشار رہتا ہوں ۔

قطعہ

نعت

اے خاک درت قبلۂ جان و دل غالب
کز فیض تو پیرایۂ هستی ست جہاں را
تا نام تو شیرینئی جاں دادہ بہ گفتن
در خویش فرو بردہ دل از مہر زباں را

یعنی آں حضرت کا نام مبارک لینے سے ایسی شیرینی اور حلاوت پیدا ہوئی کہ دل نے پیار سے اس کو اپنے اندر آتار لیا ۔

فخریہ

ماہمائے گرم پروازیم فیض از ما مجوی
سایہ ہم چوں دود بالا میرود از بال ما

یعنی ہماری پرواز میں اس قدر گرمی ہے کہ جس طرح دھواں آگ کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے اسی طرح ہمارے پروں کا سایہ نیچے نہیں پڑتا بلکہ دھوئیں کی طرح پروں کے اوپر ہی اوپر جاتا ہے ۔

شوخی

حال ما از غیر می پرسی و منت می بریم
آگہی بارے کہ آگہ نیستی از حال ما

یعنی تو جو ہمارا حال غیر سے پوچھتا ہے ہم اسی بات کے شکر گزار ہیں؛ غنیمت ہے کہ تو اس بات سے تو آگاہ ہے کہ تجھ کو ہمارے حال کی خبر نہیں ۔

اُمید

دل مایوس را تسکین بمردن مے تواں دادن
چه امیدست آخر خضر و ادریس و مسیحا را

تصوف

خطے بر هستی عالم کشیدیم از مژه بستن
ز خود رفتیم و هم با خویشتن بر دیم و دنیا را

عاشقانه

وقف تاراج غم تست چه پیدا چه نهاں
هم چو رنگ از رخ ما رفت دل از سینۂ ما

عاشقانه

جوئے از بادۂ و جوۓ ز عسل دارد خلد
لب لعل تو هم این ست و هم آنست مرا

فخریه

خارها از اثر گرمیے رفتارم سوخت
منتے بر قدم راه رواں ست مرا

یعنی راہ کے تمام خار و خس میری گرفتاری سے جل گئے هیں پس رهگیروں کے قدم پر میرا احسان هے که اُن کے لیے میں نے رسته صاف کر دیا هے ۔ یه تمام مضمون استعارے میں بیان هوا هے ، مطلب یه هے که نازک خیال کے طریقے میں جو اُلجھاؤ تھے وہ سب میں نے اس طریقے پر چل کر دور کر دئے هیں اور آینده آنے والوں کے لیے راه صاف کر دی هے ۔

تمثیل حالات خود

رہرو تفتۂ ور رفتہ بہ آبم غالب
توشۂ بر لب جو ماندہ نشانست مرا

یعنی میری مثال اُس مسافر کی سی ہے جو گرمی اور لُو سے جلا بھنا پانی کو دیکھ کر بے اختیاز اس میں کود پڑے اور ڈوب جائے اور ندی کے کنارے پر اُس کا زاد راہ پڑا رہ جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہاں کوئی مسافر ڈوبا ہے۔ اس شعر میں مرزا نے اپنی خاص حالت کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے، گویا یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں لوگوں نے مجھ کو محض اٹکل اور قرائن سے پہچانا ہے ورنہ میں جیسا کہ میں ہوں سب کی نظروں سے مخفی رہا ہوں۔

دنیا

سایۂ و چشمہ بصحرا دم عیشی دارد
اگر اندیشۂ منزل نبود رہزن ما

یہ دنیا کی مثال ہے یعنی اگر آخرت کا کھٹکا نہ لگا ہوا ہو تو دنیا خاصی آرام کی جگہ ہے۔ مگر چونکہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہے اس لیے یہاں آرام کے ساتھ دم نہیں لیا جا سکتا۔

زار نالی

ے پرد مور مگر جان بہ سلامت ببرد
تاچہ برق ست کہ شد نامزد خرمن ما

یعنی معلوم نہیں کہ ہماری خرمن پر کون سی بجلی گرنے والی ہے کہ چیونٹے جان بچانے کے لیے پہلے ہی سے اُڑے

جاتے ہیں، تمثیل کے پیرائے میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ دوست اور رفیق کوئی ہمارے رنج میں شریک نہیں ہوتا۔

فخریہ

سخن ما ز لطافت نه پذیرد تحریر
نه شود گرد نمایاں ز رم توسن ما

یعنی ہمارے خیالات اس قدر لطیف ہیں کہ تحریر میں نہیں آسکتے۔ گویا ہمارے گھوڑے کی دوڑ میں گرد و غبار بالکل نہیں اٹھتا۔

فخریہ

ما نه بودیم بدیں مرتبه راضی غالب
شعر خود خواهش آں کرد که گردد فن ما

یہ ملکۂ فطری کی طرف اشارہ ہے، یعنی ہم نے شاعری خود نہیں اختیار کی، بلکہ ملکۂ شاعری نے خود ہم کو مجبور کیا کہ ہم اس کو اپنا فن قرار دیں۔

شکایت

یابنده خود ایں همه سختی نه می کنند
خود را بزور بر تو، مگر بسته ایم ما

یہ خطاب خداوند حقیقی کی طرف ہے، یعنی کیا ہم زبردستی سے تیرے سر ہو گئے ہیں کہ ہم پر ایسی سختی کی جاتی ہے۔

فخریہ

بر روئے حاسداں در دوزخ کشوده رشک
از بهر خویش جنت در بسته ایم ما

یعنی هم اپنا کمال دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے ہیں گویا ہم اپنے لیے جنت در بستہ ہیں ۔ پس چونکہ ہماری جنت کی کیفیت سے اور جو اس میں لذت و راحت ہے اس سے ، حاسد لوگ بے خبر ہیں اس لیے رشک سے ان کی یہ حالت ہے کہ گویا ان پر دوزخ کا دروازہ کھلا ہوا ہے ۔

تصوف

سوز ترا روان همه در خویشتن گرفت
از داغ تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما

یعنی تیرے سوز اور تیری آگ کو جان نے بالکل اپنے اندر لے لیا ہے اور ذرہ برابر کسی کے لیے اس میں سے حصہ نہیں چھوڑا ۔ پس ہم جو اپنے جگر کو داغ دار قرار دیتے ہیں در حقیقت اس پر تہمت رکھتے ہیں ۔

عاشقانہ

با چوں توئے معاملہ برخویش منت است
از شکوۂ تو شکر گزار خودیم ما

زار نالی

روئے سیاہ خویش ز خود هم نهفته ایم
شمع خموش کلبۂ تار خودیم ما

رندانہ

کدوئے چوں ز مے یابم بر خویشتن بالم
کہ پندارم سر آمد روزگار بے نوائی ها

یعنی ایک شراب کا بھرا ہوا تونبا مجھ کو مل جاتا ہے

تو میں پھولا نہیں سماتا اور یہ سمجھتا ہوں کہ بس اب بے سر و سامانی کا زمانہ ختم ہوا ۔

رندانہ

سخن کوتہ ۔ مرا ہم دل بتقویٰ مائل است اما
ز ننگ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائی ہا

یعنی زاہد کے ساتھ ہم پیشہ ہونے سے عار آتا ہے اس لیے میری کفار کی سی حالت ہے ورنہ تقویٰ کی طرف مجھے بالطبع میلان تھا ۔

اخلاق

در مشرب حریفاں منعست خود نمائی
بنگر کہ چوں سکندر آئینہ نیست جم را

''حریفاں،،کا لفظ فارسی میں ایسا ہے جیسا اردو میں یار لوگوں کا لفظ اور لفظی معنی اس کے ہم‌پیشہ ہیں، جب شراب خوار کسی کو حریف یا حریفاں کہتا ہے تو اس سے مراد شراب خور ہوتی ہے ۔ کہتا ہے کہ ہم شراب خواروں کے مشرب میں خود نمائی منع ہے ؛ دیکھو جمشید جو بادہ نوشی میں ضرب‌المثل ہے ، اس کے ہاں آلۂ خود نمائی ، یعنی آئینہ جیسا کہ سکندر کے ہاں تھا ، نہ تھا ۔

شوخی

ز ما گسستی و با دیگراں گرد بستی
بیا کہ عہد وفا نیست استوار بیا

یعنی اگر تو نے ہم سے توڑ کر غیروں کے ساتھ پیماں باندھا ہے تو اس کا خیال نہ کر اور بے تکلف ہمارے پاس

چلا آ کیونکہ عہد وفا ٹوٹنے ہی کے لیے باندھا جاتا ہے، وہ کبھی استوار نہیں ہوتا جیسا کہ ہمارے ساتھ بندھ کر ٹوٹ گیا۔

عاشقانہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

یعنی وداع میں اور لطف ہے اور وصل میں اور لذت ہے۔ پس ہزار بار جا اور لاکھ بار آ۔ صد ہزار کے لفظ نے شعر کو زیادہ بلیغ کر دیا ہے، کیوں کہ شاعر باوجود یکہ لذت میں وداع اور وصل دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے مگر پھر بھی اپنے مطلب کی بات کو نہیں بھولا اور جانے کے لیے ہزار بار اور آنے کے لیے صد ہزار بار کا لفظ استعمال کیا ہے۔

متصوفانہ

رواج صومعہ ہستی ست زینہار مرو
متاع میکدہ مستی ست ہوشیار بیا

یعنی صومعہ میں ہستی و پندار وغرور کا رواج ہے وہاں ہرگز نہ جا اور میکدے کی جو کچھ پونجی ہے وہ مستی ہے؛ یہاں ذرا ہوشیار ہو کر یعنی ظرف عالی لے کر آنا چاہئے۔ مستی حاصل کرنے کے لیے ہوشیار ہو کر آنا، اس میں جو لطف ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

رشک

چوں بقا صد لبسپرم پیغام را
رشک نگذارد کہ گویم نام را

زارنالی

گشتہ در تاریکی روزم نہاں
کو چراغے تا بجویم شام را

یعنی میرا دن اس قدر تاریک تھا کہ شام کی تاریکی اور اُس کی تاریکی دونوں مل گئیں اور یہ نہ معلوم ہوا کہ شام کب ہوئی اور دن کب چھپا۔

خلوص

تانیفتد ہر کہ تن پرور بود
خوش بود گر دانہ نبود دام را

یہ وہی مضمون ہے جو مرزا نے اُردو میں اس طرح باندھا ہے:

طاعت میں تار ہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

رندانہ

دلستاں در خشم و غالب بوسہ جو
شوق نشناسد ہمے ہنگام را

عاشقانہ

در ہجر طرب بیش کند تات و تبم را
مہتاب کف مار سیاہست شبم را

یعنی جدائی کے زمانے میں جو سامان عیش و طرب مہیا ہوتا ہے، اُس سے میری بے قراری اور تپش زیادہ بڑھتی ہے۔ پس چاندنی جو کہ عیش و طرب کی محرک ہے وہ میری

رات کے حق میں مار سیاہ کے پھن کا حکم رکھتی ہے۔

غیرت

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جان دہم
گر بموج افتد گمان چین پیشانی مرا

کہتا ہے کہ میں کیسا ہی پیاسا ہوں لیکن اگر دریا کی موج پر مجھ کو یہ شبہ بھی گذرے کہ دریا نے مجھے دیکھ کر پیشانی پر بل ڈالا ہے تو میں غیرت کے مارے ساحل دریا پر جان دے دوں گا، مگر حلق تر نہ کروں گا۔

عاشقانہ

بپایان محبت یاد می آرم زمانے را
کہ دل عہد وفا نابستہ دادم دلستانے را

اس شعر میں اپنی نادانی اور حماقت ظاہر کرتا ہے کہ اب انتہائے محبت میں جب کہ معشوق کی طرف سے ظلم و ستم و بیوفائی کی کچھ حد نہیں رہی، مجھے یہ خیال آتا ہے کہ افسوس ہے جب میں نے دل اس کو دیا تھا، اس وقت وفاداری کا عہد نہ لے لیا۔ حالانکہ دل کا دینا کوئی اختیاری بات نہیں ہے۔ کہ جس طرح بیع و شرا اور لین دین کے وقت شرطیں کر لیتے ہیں، اسی طرح دل دیتے وقت بھی کوئی شرط کر لی جاتی۔

رندانہ

آوازۂ شرع از سر منصور بلند است
از شب روی ماست شکوۂ عسس ما

''شب روی'' چوری کے لیے راتوں کو پھرنا۔ کہتا ہے

کہ اگر مجرموں کو تعزیر نہ دی جائے تو شریعت کی شان و شوکت اور حکومت کی شکوہ ظاہر نہیں ہوتی۔ پس ہم جو مرتکب جرائم ہوتے ہیں گویا شریعت اور حکومت کی شان بڑھاتے ہیں۔

زارنالی

وقتست کہ خوں جگر از درد بہ جوشد
چنداں کہ چکد از مژہ داد رس ما

کہتا ہے کہ میری مظلومی اب اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ خون جگر درد سے اس قدر ابلے کہ حاکم دادرس کی پلکوں سے جا ٹپکے۔

آزادی

در دھر فرو رفتۂ لذت نتواں بود
بر قند۔ نہ بر شہد نشیند مگس ما

یعنی ہم دنیا کی لذتوں سے متمتع ہوتے ہیں مگر آن میں پھنستے نہیں جیسے وہ مکھی جو قند پر بیٹھتی ہے کہ جب چاہا اڑ گئی نہ وہ مکھی جو شہد پر بیٹھتی ہے کہ پھر ابھر نہیں سکتی۔

رندانہ

بادۂ مشکبوئی ما۔ بید و کنار کشت ما
کوثر و سلسبیل ما۔ طوبیٰ ما۔ بہشت ما

عاشقانہ

حسرت وصل از چہ رو۔ چوں بخیال سر خوشیم
ابر اگر بایستد۔ بر لب جُوست کشت ما

یعنی جب ہم خیال دوست ہی میں مست و سرشار ہیں تو وصل کی حسرت کیوں کریں ؛ اگر ابر نہیں برستا تو نہ برسے ہماری کھیتی خود ندی کے کنارے پر ہے ۔

رندانہ

بردہ صدر العین بسر بر سر صد ہزار خُم
گر بنہی در آفتاب بادہ چکد ز خشت ما
بادہ اگر بود حرام ۔ بذلہ خلاف شرع نیست
دل نہ نہی بہ خوب ما ۔ طعنہ مزن بزشت ما

زہاد کی طرف خطاب ہے جو شراب خواری اور رندانہ بذلہ سنجی دونوں کو برا سمجھتے ہیں ۔ کہتا ہے کہ اگر شراب حرام ہے تو بذلہ سنجی تو خلاف شرع نہیں ہے ؛ اگر تو شراب کو جو ہماری نفیس چیز ہے ، پسند نہیں کرتا تو بذلہ سنجی جو ہماری ادنٰی درجے کی چیز ہے ، اس پر تو طعن مت کر ۔

تضمین مصرع طرح

گفت بحکم حسرتی غالب خستہ ایں غزل
شاد بہیچ می شود طبع وفا سرشت ما

یہ غزل غالباً اس زمانے کی لکھی ہوئی ہے جب کہ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم متخلص بہ حسرتی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا اور علوی ، شہبائی ، آزردہ ، مومن اور نیر وغیرہم سب اس میں شریک ہوتے تھے ۔ اس مقطع میں مرزا نے مصرع طرح کو تضمین کیا ہے ، اب اس کے یہ معنی ہو گیے کہ ہم سے جو اس طرح پر غزل لکھنے کی فرمائش کی گئی ہماری طبع وفا سرشت دوست کے

اتنے ھی التفات سے شاد شاد ہو جاتی ہے۔

عاشقانہ

مردم ز فرط ذوق و تسلی نمے شوم
یا رب کجا برم لب خنجر ستائے را

کہتا ہے کہ دوست کے خنجر نے وہ مزا دیا ہے کہ اُس کی تعریف کرتا کرتا مر گیا اور پھر بھی تسلی نہ ہوئی؛ الٰہی اس لب خنجر ستا کو کہاں لے جاؤں کہ جہاں جا کر تسلی ہو۔

رندانہ

شبم تاریک و منزل دور و نقش جادہ نا پیدا
ہلاکم جلوۂ برق شراب گہ گاہے را

پہلے مصرع میں اپنی مشکلات کو شب تاریک وغیرہ کی تمثیل میں بیان کیا ہے، دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ میں ہلاک یعنی قربان ہوں برق شراب پر جو کبھی کبھی چمک جاتی ہے اور اُس اندھیرے میں کچھ روشنی نظر آ جاتی ہے؛ مطلب یہ کہ شراب جو کبھی کبھی مل جاتی ہے صرف اُس کی بدولت میرا غم غلط ہوتا ہے۔

رندانہ

مے باندازہ حرام آمدہ ساقی بر خیز
شیشۂ خود بشکن بر سر پیمانۂ ما

بر خلاف عقل و شرع کے کہتا ہے کہ اے ساقی شراب اعتدال کے ساتھ پینی حرام ہے، تو اُٹھ اور اپنا شیشہ یعنی بوتل یا صراحی ھمارے گلاس پر دے مار۔ اس شعر میں افراط شوق

کی تصویر کھینچی ہے خواہ کسی چیز کا شوق ہو۔ جب کسی چیز کی طلب اور خواہش حد سے گزر جاتی ہے تو اس بات کی حس نہیں رہتی کہ اپنے ظرف کے موافق اُس کی خواہش کی جائے، جب پانی کی پیاس نہایت شدت سے ہوتی ہے تو پیاسا دریا کو دیکھ کر یہ چاہتا ہے کہ سارے دریا کو پی جاؤں۔ پس گو کہ مضمون شعر شراب کی تمثیل میں بیان کیا گیا ہے لیکن اُس کا مصداق ہر چیز کا مشتاق قرار پا سکتا ہے۔

زارنالی

مو بر آید ز کف دست اگر دهقان را
نیست ممکن که کشد ریشه سر از دانهٔ ما

ظاہر ہے کہ انسان کی ہتیلی میں بال پیدا ہونے کی قابلیت نہیں رکھی گئی؛ کہتا ہے کہ اگر کاشت کار کی ہتیلی میں بال بھی نکل آئیں تو بھی یہ ممکن نہیں کہ ہمارا دانہ پھوٹ کر اُس میں سے ریشہ نکل آئے یعنی ہماری کوششوں کا مشکور ہونا محال ہے۔

تصوف

خرابیم و رضایش در خرابیهای ما باشد
ز چشم بد نگهدارد خدا ما دوست کامان را

''خراب''۔ مست، ویراں اور تباہ تینوں معنوں میں آتا ہے۔ ''دوست کام'' وہ شخص جس کی حالت دوستوں کی خواہش کے موافق ہو یعنی عمدہ حالت ہو۔ کہتا ہے کہ ہم خود بھی خراب ہیں اور دوست کی خوشی بھی یہی ہے کہ خراب حال رہیں پس ہم دوست کاموں کو جن کی حالت

دوست کی مرضی کے موافق ہے، خدا تعالیٰ نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔

مناجات

بسا آفتادہ۔ سرمست وبسا افتادہ در طاعت
تو دانی تابہ لطف از خاک برداری کداماں را

تصوف

عالم آئینہ رازست چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب

یعنی اگر سوچ نہیں سکتا تو نگاہ ھی سے عالم کو دیکھ کہ اس کا ظاہر و باطن سب مظہر اسرار الٰہی ہے۔

تصوف

فرصت ازکف مدہ و وقت غنیمت پندار
نیست گر صبح بہاری شب ماہے دریاب

شوخی

گرپس از جور بہ انصاف گراید چہ عجب
ازحیا روئے بما گر ننماید چہ عجب

کہتا ہے کہ ظلم و ستم کے بعد اگر وہ انصاف کی طرف مائل ہوجائے تو کچھ عجب نہیں یعنی اپنے پچھلے ظلم یاد کرکے حیا سے ہم کو منہ نہ دکھلائے تو کچھ تعجب نہیں، مطلب یہ کہ انصاف بھی کرے گا تو اس طرح کرے گا کہ ہم اس کے دیکھنے سے محروم رہیں۔

شوخی

بودش از شکوه خطر ورنہ سری داشت بمن
بمزارم اگر از مہر بیاید چہ عجب

خیالی پلاؤ پکاتا ہے تاکہ اسی طرح اپنے دل کو تسکین دے۔

معذرت

باچنیں شرم کہ از ہستی خویشش باشد
غالب از رخ بُرہ دوست نساید چہ عجب

یعنی اس شرم سے کہ اپنے تئیں غلطی سے موجود سمجھ رہا ہے اگر غالب خدا کے آگے سجدہ نہ کرے تو کچھ تعجب نہیں۔

غزل نعتیہ

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمد است
آرے کلام حق بزبان محمد است

آئینہ دار پرتو مہر ست ماہتاب
شان حق آشکار زشان محمد است
تیر قضاہر آئینہ در ترکش حق است
امّا کشاد آں زکہان محمد است
دانی اگر بمعنی لولاک وارسی
خود ہر چہ ازحق است ازان محمد است
ہر کس قسم بداں چہ عزیز است می خورد
سو گند کردگار بجان محمد است

واعظ ! حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گزار
کاینجا سخن ز سرور دان محمد است
بنگر دونیمہ گشتن ماہ تمام را
کاں نیمہ جنبشی ز بنان محمد است
ور خود ز نقش مہر نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشان محمد است
غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

یہ غزل مرزا نے اپنی عام طرز کے خلاف نہایت صاف اور بلیغ لکھی ہے - راقم نے مرزا کی زندگی ھی میں اس غزل کی تخمیس کی تھی اور مرزا صاحب کو بھی دکھائی تھی ، چونکہ وہ تخمیس اب تک شائع نہیں ہوئی اس لیے مقتضائے مقام یہ ہے کہ اس کو بھی اس غزل کے ساتھ نقل کردیا جائے -

اعجاز از خواص لسان محمد است
عین الحیوۃ گم بہ دھان محمد است
نور دگر ھدے کہ ازان محمد است
حق جلوہ گر ز طرز بیان محمد است
آرے کلام حق بزبان محمد است

دانی ز پیش چشم تو بر خیز دار حجاب
کز نور شمع پردۂ فانوس راست تاب
باشد ظہور روشنی عارض از نقاب
ئنہ دار پرتو مہر ماھتاب
شان حق آشکار ز شان محمد است

لطف خدا ست گر بسر کس نهاد دوست
قهرخدا ست چون از سر کین بحمله جست
داند کسے که شد ز مے مارمیت مست
تیر قضا هر آئینه در ترکش حق است
اما کشاد آں ز کمان محمد است

گوئی اگر بعالم ادراک دارسی
بینی اگر بدیدهٔ دراک دارسی
سنجی اگر بمرتبهٔ خاک دارسی
دانی اگر بمعنی لولاک دارسی
خود هرچه از حق است ازان محمد است

شاهد بقتل عاشق و عاشق بخال و خد
مجنوں بپائے لیلیٰ و لیلیٰ بفرق خود
مومن به آل احمد و آلش بروح جد
هر کس قسم بداں چه عزیز است می خورد
سوگند کردگار بجان محمد است

اے خامه وصف قامت معشوق کم نگار
اے دل سخن ز راست قداں درمیان میار
قمری ! ز ذکر سرد نفس را نگاه دار
واعظ ! حدیث سایهٔ طوبیٰ فرو گزار
کاینجا سخن ز سرد روان محمد است

حکمش بمهر و ماه روانست چوں قضا
دیدی که باز گشتن خورشید بر قفا
بوده است بر اشارهٔ ابروئی مصطفیٰ
بنگر دو نیمه گشتن ماه تمام را
کاں نیمه جنبشے ز نبان محمد است

آں جا کہ از مناقب عترت سخن رود
وز آل و از صحابہ و امت سخن رود
داں کایں ہمہ ز ختم رسالت سخن رود
در خود ز نقش مہر نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشان محمد است

ہمت بمدح شہ من و حالی گما شتیم
گفتیم و از نگاشتنی ہا نگاشتیم
چوں کام و لب فرا خورد صفش نداشتیم
غالب ثنائی خواجہ بیزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ داں محمد است

شوخی

بے خود بوقت ذبح تپیدن گناہ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

شوخی

یاد از عدو نیارم و ایں ہم ز دور بینی ست
کاندر دلم گزشتن ما دوست ہمنیشی ست

کہتا ہے کہ میں جو رقیب کا خیال دل میں نہیں لاتا ، یہ دور بینی کی بات ہے کیونکہ میرے دل میں ہر وقت دوست رہتا ہے ، اگر رقیب کا خیال دل میں آئے گا تو گویا رقیب دوست کے ساتھ ہم نشیں ہو جائے گا۔

شوخی

من سوئی او بہ بینم داند ز بے حیائی ست
او سوئی من نہ بیند دانم شرم گینی ست

عاشقانہ

چہ فتنہ ھا کہ در اندازۂ گمان تو نیست
قیامت است۔ دل دیر مہربان تو نیست

عاشقانہ

رواں فدائی تو ! نام کہ بردہ ناصح ؟
زہے لطافت ذوق کہ در بیان تو نیست

چونکہ ناصح ترک عشق کی نصیحت کرتا ہے اس لیے معشوق کا نام عاشق کے سامنے اچھی طرح نہیں لیتا ۔ شاعر ناصح کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے کہ میری جان تجھ پر قربان ہو ! تو نے کس کا نام لیا ؟ وہ کیسی لطافت اور لذت ہوگی جو کہ تیرے بیان میں نہیں ہے ؟ یعنی جس طرح اس کا نام لینا چاہئے تھا اگر اس طرح تو بھی وہ نام لیتا تو کیسی لطافت اور لذت تیرے بیان میں ہوتی ، مگر چونکہ ناصح نے بری طرح سے اس کا نام لیا تھا اس لیے کہتا ہے کہ وہ کیسی لطافت ہوگی جو تیرے بیان میں نہیں ہے ۔

عاشقانہ

دل از خموشی بعلت امیدوار چراست
چہ گفتۂ بزبان کہ در دہان تو نیست

معشوق نے منہ سے کچھ نہیں کہا مگر اس کی نگاہ یا تبسم یا کسی اور ادا سے اس کے التفات یا وصل کی امید بندھی ہے، پس کہتا ہے کہ تیرے لعل لب کی خاموشی سے میرا دل اس قدر کیوں امیدوار ہے؟ تو نے اس زبان سے جو تیرے منہ میں نہیں ہے، کیا کہہ دیا ہے جس سے اس کو امید بندھی ہے ۔

عاشقانہ

گمان زیست بود بر منت ز بے دردی
بد است مرگ ولے بد تر از گمان تو نیست

اخلاق

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست

دوسرے مصرعے میں عرفی کے مضمون کو الٹا ہے ؛ اس نے اس لحاظ سے کہ دریا کے اوپر کی سطح سے راحت حاصل ہوتی ہے اور دریا کی تہ میں پہنچنے سے وہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے جو آگ میں جل جانے سے ہوتا ہے ، یوں کہا تھا ''روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش ست ۔'' مرزا کہتے ہیں کہ بلا کا خوف خود بلا سے زیادہ سخت ہوتا ہے ؛ چنانچہ دریا میں انسان جب ہی تک بے چین رہتا ہے جب تک ڈوب جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ، جب ڈوب گیا پھر کچھ بھی بے چینی باقی نہیں رہتی ۔ پس یوں کہنا چاہئے کہ ''قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست ۔''

شوخی

پاک خور امروز و زنہاز از پے فردا منہ
در شریعت بادۂ امروز آب و فردا آتش ست

جو لوگ شراب طہور کی امید پر دنیا میں نہیں پیتے وہ لوگ گویا جو شراب آج نہیں پیتے اس کو کل کے لیے رکھ

چھوڑتے ھیں - پس اُن سے کہتا ھے کہ ”پاک خور مروز“ یعنی سب آج ھی نبیڑ دے اور کل کے لیے مت رکھ - کیونکہ شریعت میں شراب آج تو پانی ھے اور کل وھی آگ ھو جاوے گی -

تصوف

ز وھم - نقش خیالی کشیدہ ورنہ
وجود خلق چو عنقا بدھر نایاب است

قوی فتادہ چو نسبت - ادب مجو غالب
ندیدہ کہ سوئی قبلہ پشت محراب است

یعنی جب تعلق اور نسبت قوی ھو جائے تو پھر آداب ظاھری کی توقع نہ رکھنی چاھئے - دیکھو ! قبلہ کی طرف پشت کرنا ھر ایک کے لیے خلاف ادب ھے ؛ مگر محراب مسجد جس کو قبلہ سے نہایت مضبوط تعلق ھے ، اُس کی پشت ھمیشہ قبلہ ھی کی طرف رھتی ھے -

شوخی

ھرچہ فلک نخواستہ است ھیچ کس از فلک نخواست
ظرف فقیہ مے نہ جست بادۂ ما گزک نخواست

تصوف

بحث و جدل بجائی ماں - مے کدہ جوئی کاندراں
کس نفس از جمل نزد کس سخن از فدک نخواست

”بجائے ماں“ بمعنی بجائے دار یعنی بحث و جدال کو یونہی رھنے دے اور مے خانے میں جا کہ وھاں نہ ’جمل‘ کا جھگڑا ھے نہ ’فدک‘ کا قصہ ھے - جمل سے مراد جنگ جمل ھے

ہے جس میں حضرت عائیشہ جمل یعنی اونٹ پر سوار ہو کر، حضرت امیر سے لڑنے گئی تھیں۔ فدک ایک کھجوروں کا باغ تھا جس پر حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہراء نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت میں وراثت کا دعویٰ کیا تھا؛ یہ دونوں جھگڑے من جملہ آن بے شمار نزاعوں کے ہیں جن پر سنی شیعوں میں ہمیشہ سر پھٹول رہتی ہے۔

فخریہ

دل جلوہ میدہد ہنر خود در انجمن
رحمے مگر بجاں حسودش نماندہ است

یعنی جب تک میں اپنے تیئں چھپاتا تھا، حاسدوں کو کچھ آزار نہیں پہنچتا تھا؛ اب علی الاعلان اپنے ہنر ظاہر کرنے لگا ہوں؛ گویا اب حاسد کی جان پر رحم باقی نہیں رہا۔

بے دماغی

غالب زباں بریدہ و آگندہ گوش نیست
امّا دماغ گفت و شنودش نماندہ است

عاشقانہ

بلبل دلت بنالۂ خونیں بہ بند نیست
آسودہ زی کہ یار تو مشکل پسند نیست

یعنی اے بلبل! تو اپنے نالۂ خونیں کے سبب ضیق میں نہیں ہے، جب چاہتی ہے نالہ کرتی ہے۔ پس تو آرام سے زندگی بسر کر کہ تیرا یار یعنی گل مشکل پسند نہیں ہے۔ بخلاف ہمارے کہ ہم کو رونے اور فریاد کرنے کی بندی ہے حالانکہ نالۂ خونیں سے دل بھرا ہوا ہے۔

تصوف

بے خود بزیر سایہ طوبےٰ غنودہ اند
شبگیر راهروان تمنا بلند نیست

یعنی جو لوگ امانی و آمال کے پھندے میں گرفتار ھیں، اُن کا سفر کچھ لمبا چوڑا نہیں ھے، اُن کا منتہائے مقصود طوبےٰ کے سایہ میں آرام کرنا ھے۔

شکایت سخن

اختری خوشتر از نیم به جهاں می بایست
خرد پیر مرا بخت جواں می بایست

قیمت سخن

تا تنک مایہ بدر یوزہ خود آرا نشود
نرخ پیرایہ گفتار گراں می بایست

فخریہ

گفتم بروزگار سخنور چو من بسی ست
گفتند اندریں که تو گفتی سخن بسی ست

مشکیں غزالہا که نه بینی بہیچ دشت
در مرغزارهائے خطا و ختن بسی ست

در صفحہ نه بود همه آں چه در دل ست
در بزم کم تر ست گل و در چمن بسی ست

دراز دستی من چاکے ارفگند چه عیب
ز پیش دلق ورع با هزار پیوند است

رندانہ

نہ گفتۂ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر
برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پند است

یہ خطاب ناصح کی طرف ہے۔

عاشقانہ

اگر نہ بہر من - از بہر خود عزیزم دار
کہ بندہ - خوبی او خوبی خداوند ست

تصوف

در گرم روی سایۂ و سرچشمہ بخوئیم
با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

یعنی ہم کو آگے جانے کی جلدی ہے، ہم سایہ و سرچشمہ یعنی طوبیٰ اور کوثر پر آرام نہیں لے سکتے۔

تصوف

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

شوخی

کاری عجب افتاد بدیں شیفتہ ما را
مومن نہ بود غالب و کافر نتواں گفت

رندانہ

گفتم ز کہ پرسم اثر عمر گزشتہ
ساقی بقدح بادۂ دہ سالہ فرو ریخت

شوخی

در قالب ملّا اثرش پردہ کشا شد
خاکے کہ قضا در تن کو سالہ فرو ریخت

دوستی

گر منافق - وصل ناخوش - در موافق - ہجر تلخ
دیدہ داغم کرد روئے دوستاں دیدن نداشت

یعنی دوستوں کا منہ دیکھنا اور ان سے تعارف پیدا کرنا نہیں چاہئے تھا کیونکہ جو منافق ہیں، اُن کا ملنا ناگوار ہے اور جو موافق ہیں ان کی جدائی تلخ ہے۔

انسان

برد آدم از امانت ہر چہ گردوں بر نتافت
ریخت مے بر خاک چوں در جام گنجیدن نداشت

یعنی بار امانت میں سے جو کچھ آسماں سے نہ اُٹھ سکا وہ انسان نے اُٹھا لیا، گویا جب شراب جام میں نہ سما سکی تو خاک پر گر پڑی۔ خاک کا لفظ انسان کے لیے اور جام آسماں کے لیے کس قدر مناسب واقع ہوا ہے اور بار امانت جو انسان پر ڈالا گیا اُس کی تشبیہ اُس شراب سے جو پیالہ چھلکنے سے زمین پر گر پڑے کیسی لطیف و پاکیزہ تشبیہ ہے!

تصوف

قفس و دام را گناہے نیست
ریختن در نہاد بال و پر است

"نہاد" جبلت کو کہتے ہیں ، قفس اور دام دونوں جانور کے لیے تکلیف اور اذیت کے مقام ہیں جہاں اکثر جانور تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے اور اس کے بال و پر گر جاتے ہیں ، یہاں قفس اور دام سے دنیا اور اس کی تکلیفات مراد ہیں ۔ کہتا ہے کہ قفس اور دام پر کچھ الزام نہیں ہے ، بال و پر گرنے ہی کے لیے بنے ہیں اور جاندار مرنے ہی کے لیے پیدا ہوا ہے ۔

تصوف

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند
هم خزاں هم بہار در گذر است

یعنی خزاں اور بہار دونوں رفتنی ہیں ، آس میں پتے جھڑتے ہیں تو اس میں پھول جھڑتے ہیں ۔

عاشقانہ

بے تو گر زیستہ‌ام سختی ایں درد بسنج
بگذر از مرگ کہ وابستہ ہنگامی هست

یعنی موت کے لیے تو ایک وقت معین ہے ، اس سے قطع نظر کر اوریہ خیال مت کر کہ اب تک مرا کیوں نہیں بلکہ یہ دیکھ کہ اب تک زندہ کیونکر رہا اور کیونکر جدائی کے رنج اور تکلیف کو برداشت کیا ۔

رندانہ

کیست در کعبہ کہ رطلے ز نبیذم بخشد
در گردگاں طلبد جامۂ احرامے هست

"رطل" پیمانہ شراب "نبیذ" شراب ۔ "گردگاں" وہ شے جس

کو گرد رکھیں ''جامہ احرام'' وہ بن سلا کپڑا جو مناسک حج کے ختم ہونے تک حاجی پہنے رہتے ہیں -

عاشقانہ

نہ بدر جستہ شرار و نہ بجا ماندہ رماد
سوختم - لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

''رماد'' راکھ، پہلا 'سوختم' لازمی، دوسرا 'سوختم' متعدی- کہتا ہے میں جل تو ضرور گیا مگر معلوم نہیں اس نے کس طرح مجھے جلا دیا ، نہ کوئی پتنگا اڑا اور نہ راکھ باقی رہی -

عاشقانہ

با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام
داند کہ حور و کوثر و دارالسلام چیست

دوست کو حور سے - بادہ کو کوثر سے اور خلوت کو دارالسلام یعنی جنت سے تشبیہ دی ہے -

رندانہ

دل خستہ غمیم و بود مے دوائے ما
با خستگاں حدیث حلال و حرام چیست

شوخی رندانہ

از کاسہ کرام نصیب است خاک را
تا از فلک نصیبہ کاس کرام چیست

شوخی

نیکی ز تست از تو نخواہیم مُزد کار
ور خود بدیم کار تو ایم انتقام چیست

یعنی اگر ہم نے نیکی کی ہے تو وہ تیری ہی طرف سے ہے، اس کی اجرت ہم نہیں چاہتے اور اگر ہم بد ہیں تو تیرا فعل یعنی تیرے بنائے ہوئے ہیں پھر سزا کس لیے ہے۔

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت
پرسد چرا کہ نرخ مے لعل فام چیست

یعنی غالب کے گھر میں صرف ایک پرانا خرقہ اور ایک مصحف تھا اور کچھ نہ تھا، پس اس نے ان کو اگر بیچ نہیں دیا تو شراب کا بھاؤ کیوں پوچھتا پھرتا ہے۔ "بہم فروخت" کے لفظ میں یہ شوخی رکھی ہے کہ اگر دونوں کو ایک ساتھ نہ فروخت کیا ہوگا تو شراب کی قیمت نہ ادا ہو سکے گی۔

عاشقانہ

لطف خدائے ذوق نشاطش نمیدھد
کافر دلے کہ با ستم دوست خو گرفت

یعنی کافر دل جو معشوق کے ظلم سہنے کا عادی ہو، اس کو خدا کی مہربانی میں بھی مزا نہیں آتا۔ بظاہر یہ ایک شاعرانہ شوخی معلوم ہوتی ہے مگر در حقیقت یہ ایک فیکٹ ہے جو ہوا و ہوس کے کوچے میں ہمیشہ گزرتا رہتا ہے۔ بوالہوس لوگ سب ذلتیں گوارا کرتے ہیں؛ جدائی کے صدمے، رشک کی جلن، ذلت و بے آبروئی، معاشیق کی بے التفاتی و بے اعتنائی وغیرہ سب کچھ سہتے ہیں مگر ہوا و ہوس سے باز نہیں آتے اور پارسائی و عفت کا طریقہ جو باعث خوشنودیٔ خدا ہے، اس کو اختیار نہیں کر سکتے۔

شوخی

رضواں چو شہد و بغالب حوالہ کرد
بے چارہ باز داد و مئے مشک بو گرفت

شوخی

رموز دیں نشناسم درست و معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربی است

یعنی میں پیدا تو عجم میں ہوا ہوں اور میرا مذہب عربی ہے پس اگر اصول مذہب سے واقف نہ ہوں تو مجھ کو معذور سمجھنا چاہئے۔

ترک فضول

نشاط جم طلب از آسماں نہ شوکت جم
قدح مباش ز یاقوت بادہ گر عنبی ست

دوسرا مصرع مثال ہے پہلے مصرع کے مضمون کی یعنی انگوری شراب چاہئے جس سے جمشید کا سا عیش حاصل ہو، یاقوت کا پیالہ جس سے جمشید کی سی شاہانہ شوکت ظاہر ہو اگر نہ میسر ہو تو نہ سہی۔

فخریہ

ہر آں چہ در نگری جز بہ جنس مائل نیست
عیار بے کسی من شرافت نسبی ست

یعنی جس کو دیکھئے اپنی جنس کی طرف مائل ہے؛ چونکہ شرافت نسب میں کوئی میری مثل نہیں ہے اس لیے میری طرف کوئی مائل نہیں اور یہی میری بے کسی کی وجہ ہے۔

تصوف

نشاط معنویاں از شراب خانۂ تست
فسون بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

اس تمام غزل میں معشوق کی طرف خطاب ہے ۔

تصوف

بجام و آئنہ حرف جم و سکندر چیست
کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

یعنی یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ جام جہاں نُما جمشید کے عہد میں تھا اور آئینہ سکندر کے عہد میں ؟ کیوں کہ جو کچھ جس زمانے میں گزرا وہ تیرے ہی زمانے میں تھا ۔

تصوف

ہم از احاطۂ تست ایں کہ در جہاں ما را
قدم بہ بت کدۂ و سر بر آستانۂ تست

یعنی تو جو تمام عالم پر محیط ہے اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم ہیں تو بت کدہ میں مگر ہمارا سر تیرے آستانے پر ہے ۔

تصوف

سپہر را تو بتاراج ما گماشتۂ
نہ ہر چہ دزد ز ما برد در خزانہ تست

یعنی کیا یہ بات نہیں کہ جو کچھ لٹیرا ہم سے لوٹ کر لے گیا ہے ، وہ تیرے خزانے میں موجود ہے ؟

تصوف

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسماں پیما ست
نہ تیزگامئی توسن تازیانۂ تست

اس شعر میں ضمناً اپنے خیال کی بلند پروازی کا اظہار ہے اور اصل مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ تیری ہی طرف سے ہے یعنی اگر میرا خیال اپنی حد سے تجاوز کر کے عالم بالا کے اسرار و غوامض میں دخل دیتا ہے تو میرا کیا قصور ہے ؟ تیرے تازیانے نے گھوڑے کو تیز رفتار کر دیا ہے ۔

شوخی

شباب و زھد! ! چہ ناقدردانی ھستی ست
بلا بجان جوانان پارسا ریزد

تصوف

آخر منزل نخست خوئے تو راہ میزند
اول منزل دگر بوئی تو زاد میدھد

یعنی سالک جب تیری راہ میں قدم رکھتا ہے اور پہلی منزل قریب ختم ہونے کے ہوتی ہے ، تو سخت مشکلات اور امتحانات کا سامنا ہوتا ہے ؛ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے اور دوسری منزل شروع ہوتی ہے تو لذت قرب حاصل ہونے لگتی ہے جو مثل زاد راہ کے آگے بڑھنے کی ہمت بندھواتی ہے ۔

تصوف

اے کہ بدیدہ نم ز تست وَیکہ بسینہ غم ز تست
نازش غم کہ ہم ز تست خاطر شاد میدھد

تصوف

مست عطای خود کند ساقی ما نه مست مے
داده زیاد مے برد بس کہ زیاد میدھد

یعنی ہمارا ساقی شراب سے مست نہیں کرتا بلکہ اپنی عطا و بخشش سے مست کرتا ہے ؛ چونکہ وہ ہر دفعہ پہلے سے زیادہ دیتا ہے اس لیے پہلا دیا ہوا بھول جاتے ہیں اُس کے احسان کے نشے پر شراب کا نشہ غالب نہیں آنے پاتا ۔

اخلاق

دل اسباب طرب گم کردہ در بند غم ناں شد
زراعت گاہ دھقان میشود چوں باغ ویراں شد

یہ مضمون مرزا کے حسب حال ہے اور عموماً مسلمانوں کی حالت پر صادق آتا ہے ؛ اول عیش و عشرت اور پھر لون تیل لکڑی کی فکر ، زراعت اور باغ کی مثال کس قدر ممثل لہ کے مطابق واقع ہوئی ہے ۔

زما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شور ہستی را
قیامت می دمداز پردۂ خاکے کہ انساں شد

یعنی جو کچھ دنیا میں فتنے اور فساد اور جنگ و جدال اور شور و غوغا ہے وہ انسان ہی کے دم سے ہے ، اگر حضرت انسان نہ ہوتے تو تمام عالم میں سناٹا ہوتا ۔

قضا از ذوق معنی شیرۂ مے ریخت در جانہا
نمے از لالے پالایش چکید و آب حیواں شد

”لالے پالا“ صافی کو کہتے ہیں ، باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں ۔

جلوہ اے داغ کہ ذوقم ز نمک مے خیزد
مژدہ اے درد کہ ننگم ز دوا مے آید

یعنی اے داغ ! اب تیرے ظاہر ہونے کا وقت آ گیا کیونکہ نمک جو تیرے طول پکڑنے اور ترقی پانے کا باعث ہے، مجھے اس میں مزا آنے لگا ہے اور اے درد ! تیری بن آئی ہے کیونکہ مجھے دوا سے ننگ آنے لگا ہے۔

تصوف

ہم چو رازے کہ بہ مستی ز دل آید بیرون
در بہاراں ہمہ بویت ز صبا مے آید

اس شعر میں معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے اور اس حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ فی ایّامِ دَھرِکُم نَفَخَاتٍ اَلَا فَتَعَرَّضُوْا لَھَا۔

آزادی

خوش است آں کہ با خویش جز غم ندارد
دلے خوش تر است آں کہ ایں ہم ندارد

عشق

سَرَابے کہ رخشد بویرانہ خوش تر
ز چشمے کہ پیرایۂ نم ندارد

یعنی وہ سراب جو صحرا میں چمکے، اس آنکھ سے بہتر ہے جو تر نہیں ہے۔

شوخی

سخن نیست در لطف این قطعه غالب
بهشتے بود هند کادم ندارد

قطعه سے مراد قطۂ زمین ہے -

تصوف

مژدهٔ صبح دریں تیره شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

تصوف

رخ کشودند و لب هرزه سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

فخریه

سوخت آتش کده ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بت خانه ز ناقوس فغانم دادند

گهر از رایت شاهان عجم بر چیدند
بعوض خامهٔ گنجینه فشانم دادند

افسر از تارک ترکان پشنگی بردند
به سخن ناصیهٔ فرّ کیانم دادند

گوهر از تاج گسستند و بدانش بستند
هر چه بردند به پیدا به نهانم دادند

رندانه

هر چه در جزیه ز گبران مئی ناب آوردند
بشب جمعهٔ ماه رمضانم دادند

زار نالی

هر چہ از دست گہ پارس بہ یغما بردند
تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

اخیر کے چھ شعروں میں اس بات کا بیان ہے کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کی فتوحات کے وقت عجم سے چھینا، اس کے عوض میں مجھ کو کہ میں بھی عجمی الاصل ہوں کچھ نہ کچھ دیا؛ جب آتش کدہ جل کر راکھ ہوگیا تو مجھے آتش کی جگہ نفس یعنی زبان دی، اور جب بت خانہ گر گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دی، شاہان عجم کے جھنڈوں کے موتی اتار لیے اور اس کے عوض میں مجھے خامۂ گنجینہ فشاں عنایت کیا، اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج لوٹ لیا اور مجھ کو شاعری میں اقبال کیانی مرحمت فرمایا۔ پھر کہتا ہے کہ موتی تاج میں سے تو توڑ لیے اور علم و دانش میں جڑ دیئے یعنی جو کچھ علی الاعلان لوٹا تھا، وہ مجھے چپکے سے دے دیا اور آتش پرستوں سے جو شراب جزیئے میں لی، وہ ماہ رمضان کی شب جمعہ کو مجھے پلائی، خلاصہ یہ کہ پارس کی جو کچھ پونجی لوٹی تھی، اس میں سے زبان مجھ کو فریاد کرنے کے لیے دے دی۔

عاشقانہ

خوباں نہ آں کنند کہ کس را زیاں رسد
دل برد۔ تا دگرچہ ازاں دلستاں رسد

یعنی دل لیا ہے تو ضرور اس کے عوض کچھ اس سے وصول ہوگا کیوں کہ اچھے لوگ ایسا کام نہیں کرتے کہ کسی

کو نقصان پہنچے۔

تصوف

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست
ہرجا کنیم سجدہ۔ بداں آستاں رسد
گم شد نشان من چو رسیدم بہ کنج دیر
مانند آں صدا کہ بگوش گراں رسد

شعرائے متصوفین دیر و خرابات و میکدے سے اکثر خانقاہ یا وہ مقام جہاں فقر و فنا کی تعلیم ہوتی ہے مراد لیتے ہیں، اپنا نشان دیر میں پہنچ کر گم ہوجانے سے مراد فنا ہے، اس کی تشبیہ اُس صدا سے جو بہرے آدمی کے کان تک پہنچ کر گم ہوجاتی ہے، کس قدر بلیغ تشبیہ ہے۔

اعزاز نفس

در دام بہر دانہ نیفتم مگر قفس
چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسد

اپنے اعزاز نفس کا اظہار ہے، یعنی اگر عزت کے ساتھ قید کرو تو مجھے قید ہونے سے کچھ انکار نہیں ہے، پس یہ اُمید نہ رکھو کہ میں دانے کے لالچ سے جال میں آ پھنسوں گا؛ بلکہ قفس کو اتنا اونچا کرو کہ میرے گھونسلے تک پہنچ جائے، میں قفس میں فوراً چلا آؤں گا۔

عاشقانہ

تیر نخست را غلط انداز گفتہ ام
اے وائے گر نہ تیر دگر بر فشاں رسد

غلط انداز اس تیر کو کہتے ہیں جو خطا کرکے غیر مقصود

جگہ جا لگے ؛ چونکہ عشاق معشوق کے تیر کے مشتاق ہوتے ہیں اس لیے کہتا ہے کہ ایک تیر تو اُس کا آ کر لگا ہے مگر میں اُس کو اپنی نحوست طالع کے خیال سے غلط انداز سمجھتا ہوں ، اب اگر دوسرا تیر بھی اُسی جگہ آ کر لگا تو میں سمجھوں گا کہ پہلا بھی ارادے سے لگایا گیا تھا ورنہ میرا خیال جو پہلے تیر کی نسبت تھا صحیح ہوجائے گا اور اُمید بالکل باقی نہ رہے گی ۔

رندانہ

امید غلبہ نیست بہ کیش مغاں آے
مے گر بہ جزیہ دست نداد ارمغاں رسد

یعنی اگر پارسیوں پر غلبہ او حکومت حاصل ہونے کی امید نہیں ہے تو اُن کا مذہب اختیار کرلے کیوں کہ اس صورت میں اگر شراب جزیہ میں نہ آوے گی تو ہدیہ اور سوغات میں ضرور آوے گی ۔ اس شعر میں گویا یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آتش پرستوں پر غلبہ و استیلا حاصل کرنے کی علت غائی یہی ہے کہ جزیے میں شراب آیا کرے پس جب غلبہ کی امید نہ ہو تو لاچار کیش مغاں اختیار کرنا چاہیئے تاکہ اگر جزیے میں نہیں تو ہدیہ و ارمغاں ہی میں شراب وصول ہوا کرے :

عاشقانہ

جاں بر سر مکتوب تو از شوق فشاندن
از عہدۂ تحریر جوابم بدر آورد

زارنالی

آں کشتی بشکستہ موجم کہ تباہی
افگند در آتش گر از آبم بدر آورد

جب کشتی موج کے تھپیڑوں سے ٹوٹ جاتی ہے تو اس کے تختوں کو پانی سے نکال کر آگ میں ایندھن کی جگہ جلاتے ہیں ، اپنے تئیں کہتا ہے کہ میری مثال بھی اسی کشتی کی سی ہے کہ ڈوبنے سے بچا تو آگ میں جھونکا گیا :

تصوف

گر جلوۂ رخ تو بہ ساغر ندیدہ ایم
چندیں بہ ذوق بادہ دل از جا چہ میرود

زار نالی

ہفت آسیا بگردش و ما درمیاں او
غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ میرود

دنیا

محو آسودگی گر مرد راہی کاندریں وادی
چو خار از پر برآمد پا ز داماں بر نمی‌آید

یعنی کسی حالت میں آدمی دنیا کے مخمصوں سے نجات نہیں پا سکتا ، اگر کانٹا پاؤں سے نکل گیا تو پاؤں دامن میں الجھے گا ۔

ترک بحث و جدل

بر آرا ز بزم بحث اے جذبۂ توفیق غالب را
کہ تُرک سادۂ ما بافقیهاں بر نمی آید

"ترک سادۂ ما" یعنی غالب جو کہ ایک بھولا بھالا ترک ہے، یہ ایسی ترکیب ہے جیسے موسائے من اور فرہاد من، یعنی مولویوں کی دلیلوں اور حجتوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ "بر کسے بر نیامدن" کے معنی ہیں اس سے سر بر اور عہدہ برآ نہ ہونا۔

تصوف

چشم و دل باختہ ام داد ہنر خواہد داد
آں کہ چوں من ہمہ‌داں ہمہ‌بیں تو شود

یعنی چونکہ میرے دل نے تجھ کو جانا ہے اور میری آنکھ نے تجھ کو دیکھا ہے جیسا کہ تو ہے، اس لیے دل اور آنکھ دونوں کو کھو بیٹھا ہوں۔ پس میرے اس کام کی داد وہی دے گا جو میری طرح تیرا ہمہ داں اور ہمہ بیں ہوگا۔

تصوف

کفر و دیں چیست جز آلایش پندار وجود
پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

عاشقانہ

رفتہ بودی دگر از جابۂ سخن سازی غیر
منت از بخت کہ خاموشی ما یاد آمد

یعنی تو نے رقیب کی سخن سازی سے پھر دھوکا کھایا تھا، مگر شکر ہے کہ اس کی سخن سازی دیکھ کر ہماری خاموشی تجھ کو یاد آگئی جس سے تجھ کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ سچے عاشق منہ سے کچھ نہیں کہا کرتے۔

عاشقانہ

دوش کز گردش بختم گلہ بر روئ تو بود
چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

یعنی نصیب کی گردش کا شکوہ کرتے وقت آنکھ آسمان کی طرف تھی اور باتیں تجھ سے کر رہا تھا ، ایک خاص حالت کی تصویر بہت عمدہ لفظوں میں کھینچی ہے ۔

عاشقانہ

دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند
کایں ہما نیست کہ پیوستہ در ابروی تو بود

تصوف

گر چنیں ناز تو آمادۂ نعیما ماند
بہ سکندر نرسد ہرچہ ز دارا مالد

معشوق حقیقی کی طرف خطاب ہے ، سکندر سے مراد پادشاہ فاتح اور دارا سے پادشاہ مفتوح ۔

تصوف

ہم بسودائے تو خورشید پرستم ۔ آرے
دل ز مجنوں برد آہو کہ بہ لیلا ماند

یعنی اگر میں آفتاب کی پرستش کروں تو وہ بھی در حقیقت تیری ہی پرستش ہے جیسے مجنوں ہرنوں پر اس لیے فریفتہ تھا کہ اُن کی آنکھیں لیلیٰ سے مشابہ تھیں ۔

عاشقانہ

شکوہ دوست ز دشمن نتوانم پوشید
گر غم ہجر چنیں حوصلہ فرسا ماند

یعنی اگر جدائی کا غم اسی طرح بے صبر کرنے والا رہا تو دوست کا شکوہ ضبط نہ کیا جا سکے گا یہاں تک کہ اُس کو دشمنوں سے بھی نہ چھپا سکوں گا۔

مصیبت

در بغل دشنہ نہاں ساختہ غالب امروز
مگذارید کہ ماتم زدہ تنہا ماند

تصوف

بستند رہ جرعۂ آبے بسکندر
دریوزہ‌گر میکدہ صہبا یکدو برد

یعنی سکندر کو ایک بے حقیقت پانی کے گھونٹ سے محروم رکھا اور میکدے کا فقیر شراب جیسی نایاب چیز کا تونبا کر لے گیا، مطلب یہ کہ پادشاہوں کو وہ دولت نصیب نہیں جو میکدے، یعنی خانقاہ کے ادنٰی گداؤں کو نصیب ہے۔

تصوف

یک گریہ پس از ضبط دو صد گریہ رضادہ
تا تلخی آں زہر توانم بہ گلو بُرد

یعنی جب دو سو دفعہ رونے کو ضبط کروں تو ایک دفعہ تو رونے کی اجازت دے تاکہ اُس ضبط کے زہر کی کڑواہٹ ایک دفعہ رو کر حلق سے دور کروں۔

عاشقانہ

ز جوش شکوۂ بے داد دوست می ترسم
مباد مُہر سکوت از دہن فرو ریزد

ایک معقول بات کو محسوسات کے لباس میں ظاہر کرتا ہے۔ مطلب تو یہ ہے کہ اُس کے شکوے سے اس قدر بھرا ہوا ہوں کہ شاید اُس کو ضبط نہ کر سکوں ، مگر اس کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اُس کی بے داد کا شکوہ دل سے اس جوش کے ساتھ اُبلا ہے کہ منہ پر جو مہر سکوت لگی ہوئی ہے ، کہیں اُس کے ریلے میں بہہ نہ جائے۔

جفاکشی

بریدہ ام رہ دوری کہ گر بیفشانم
بجائے گرد رواں از بدن فرو ریزد

یعنی میں نے ایسی راہ دراز طے کی ہے کہ اگر بدن کو جھاڑوں تو گرد کی جگہ جان بدن سے جھڑ جائے۔ یہ تمثیل ہے اُس محنت و مشقت کی جو فکر شعر اور تکمیل فن سخن میں قائل نے کی ہے۔

عاشقانہ

مکن بپرسشم از شکوہ منع کایں خونیست
کہ خود ز زخم دمِ دوختن فرو ریزد

عجیب و غریب تشبیہ اور نہایت عمدہ خیال ہے اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے ؛ قاعدہ ہے کہ جب معشوق مہربان ہو کر عاشق کی پرسش حال کرتا ہے تو اُس وقت عاشق مہجور کا دل بھر آتا ہے اور وہ شکایت کرنی شروع کرتا ہے۔ پس کہتا ہے کہ تو میری پرسش حال کے وقت شکایت سے مجھ کو منع نہ کر کیوں کہ تو جو پرسش حال کرتا ہے تو گویا میرے زخم میں ٹانکے لگاتا ہے اور ٹانکے

لگاتے وقت کسی قدر خون کا ٹپکنا ضروری ہے۔ پس یہ شکایت وہ خون ہے جو زخم کے سیتے وقت ٹپکا کرتا ہے:

سفر

اگر بدل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

یعنی عمر کا سفر میں گزرنا نہایت عمدہ ہے بشرطیکہ سفر میں جو کچھ نظر سے گزرے اس پر انسان فریفتہ نہ ہو جایا کرے۔

عاشقانہ

بوصل لطف باندازۂ تحمل کن
کہ مرگ تشنہ بود آب چوں ز سر گزرد

کہتا ہے کہ وصل کی حالت میں مہربانی اس قدر زیادہ نہ کر کہ میں اس کی خوشی کا تحمل نہ کر سکوں اور خوشی کے مارے مر جاؤں کیوں کہ پیاسے کے لیے وہ پانی موت ہے جو سر سے گزر جائے۔

تصوف

ہر کجا دشنۂ شوق تو جراحت بارد
جز خراشے بہ جگر گوشۂ ادہم نرسد
طوبیٰ فیض تو ہر جا گل و بار افشاند
جز نسیمے بہ پرستش کہ مریم نرسد

"جگر گوشۂ ادہم" یعنی ابراہیم بن ادہم کو ان زخموں میں سے جو تیرے شوق کی چھری برساتی ہے، ایک خراش سے زیادہ نہیں پہنچی اور جو پھول اور پھل تیرے فیض کے

طوبےؑ سے جھڑے ہیں ، ان میں سے صرف ایک ہوا کا جھوکا محراب مریم تک پہنچا ہے ۔

شوخی

مے بزہّاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب
پیش ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد

خواجہ فردوس بہ میراث تمنا دارد
وائے گر در روش نسل بہ آدم نرسد

خواجہ کا لفظ فارسی میں اکثر ایسے مقام پر بولتے ہیں جیسے طنز کے موقع پر اردو میں تیسرے شخص کے لیے آپ یا حضرت بولتے ہیں ۔ کہتا ہے کہ آپ آدم کی میراث میں فردوس کے طلب گار ہیں ۔ بڑا مزا ہو اگر آپ کا سلسلۂ نسب آدم تک نہ پہنچے ، مطلب یہ ہے کہ آپ کے اخلاق و عادات انسانیت سے اس قدر بعید ہیں کہ ممکن ہے آدم کی نسل سے نہ ہوں ۔

تصوف

جان در غمت فشاندن مرگ از قفا ندارد
تن در بلا فگندن بیم بلا ندارد

عاشقانہ

چون لعل تست غنچہ امّا سخن نداند
چون چشم تست نرگس امّا حیا ندارد

نایابی دوا

فارغ کسے که دل را با در دوا گزارد
کشت جہاں سراسر دارد گیا ندارد

شوخی

باید ز مے ہر آئینہ پرہیز ۔ گفته اند
آرے دروغ مصلحت آمیز گفته اند

تصوف

کو فنا تا ہمه آلایش پندار بَرَد
از صُوَر جلوهٔ و از آئینه زنگار بَرَد

ستم لطف نما

عشوهٔ مرحمت چرخ مخر کایں عیار
یوسف از چاه بر آرد که ببازار بڑد

''عشوه خریدن'' دھوکا کھانا اور فریب میں آ جانا ۔ یعنی آسمان کی مہربانی کے دھوکے میں نه آنا که یه عیار یوسف کو چاه سے اس لیے نکالتا ہے که بازار میں لے جا کر بکوائے۔

تصوف

ہر شمیمے را مشامے درخورست
بوئے پیراہن به کنعاں مے رود

زار نالی

جوہر طبعم درخشانست لیک
روزم اندر ابر پنہاں مے رود

زارنالی

نومیدی ما گردش ایام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

بیقراری شوق

بلبل بچمن بنگرد پروانہ بہ محفل
شوق است کہ در وصل ہم آرام ندارد

یعنی شوق کو وصل میں بھی آرام نصیب نہیں اسی لیے نہ بلبل کو چمن میں آرام ہے اور نہ پروانے کو شمع کی موجودگی میں قرار ہے۔

سخن پردرد

چہ خیزد از سخنے کز درون جاں نبود
بریدہ باد زبانے کہ خونچکاں نبود

کہتا ہے کہ جو بات دل سے نہیں نکلتی وہ کچھ اثر نہیں کرتی، پس کٹیو وہ زبان جو خونچکاں یعنی درد دل سے بھری ہوئی نہ ہو۔

قسمت

حکیم ساقی و مے تند و من ز بدخوئی
ز رطل بادہ بخشم آیم ار گراں نبود

''حکیم'' سے مراد خدا ہے؛ کہتا ہے کہ ساقی تو اندازے سے زیادہ نہیں دیتا اور شراب یعنی دولت دنیا نہایت تند ہے مگر میں اپنی بدخوئی اور زیادہ طلبی سے اگر شراب کا پیالہ ھلکا پاتا ہوں تو غصے ہوتا ہوں۔

تصوف

ز خویش رفته ام و فرصتے طمع دارم
کہ باز گردم و جز دوست ارمغان نبود

قاعدہ ہے کہ جب آدمی کہیں سفر کو جاتا ہے تو وہاں سے کچھ سوغات و ہدیہ و ارمغاں لے کر وطن میں واپس آتا ہے؛ کہتا ہے کہ میں اپنے آپ سے تو جا چکا ہوں، اب یہ چاہتا ہوں کہ واپس پھر کر اپنے آپ میں آؤں تو دوست یعنی حق کے سوا کوئی سوغات لے کر نہ آؤں۔

تصرف شوق

زمام ناقہ بدست تصرف شوق است
بسوئے قیس گرایش ز ساربان نبود

یعنی لیلیٰ کا ناقہ جو قیس کی طرف چلا ہے، یہ ساربان کی طرف سے نہیں ہے بلکہ اُس وقت اُس کی باگ تصرف شوق قیس کے ہاتھ میں ہے، وہ جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے۔

عاشقانہ

بتان شہر ستم پیشہ شہر یارانند
کہ در ستم روش آموزگار انند

بُرند دل بادائے کہ کس گماں نبرد
فغاں ز پردہ نشنیاں کہ پردہ دارانند

نہ زرع و کشت شناسند نے حدیقہ و باغ
ز بہر بادہ ہوا خواہ باد و بارانند

یعنی ہوا اور مینہ کچھ اس لیے نہیں چاہتے کہ اُس سے کھیتیاں اور باغ سرسبز و شاداب ہوں گے، بلکہ صرف اس

لیے کہ شراب پینے کا لطف بغیر باد و باراں کے نہیں آئے گا۔

یہ مضمون مرزا کو کہیں سے تلاش کرنا نہیں پڑا بلکہ یہ خاص اُن کی طبیعت کا اقتضا تھا ۔ جس مکان میں مرزا رہتے تھے اُس کے دروازے پر ایک کمرہ تھا اور کمرے کے آگے ایک برآمدہ تھا جس کے نیچے رستہ چلتا تھا ؛ یہ برآمدہ گزر گاہ سے تقریباً چار گز اونچا ہوگا ۔ ایک روز مینہ برس رہا تھا اور مرزا صاحب برآمدے میں بیٹھے ہوئے ابر و باراں کی مدارات میں مصروف تھے ۔ اُس وقت عالم سرخوشی میں فرمانے لگے کہ جی چاہتا ہے ایسا برسے کہ گلی کی رو کا پانی برآمدے تک آ جائے اور میں یہیں بیٹھا بیٹھا گلاس بھر بھر کر پانی پیوں ۔ کسی نے کہا حضرت ! برآمدے تک پانی آ گیا تو شہر پہلے ڈوب جائے گا ۔ مرزا ہنس کر چپکے ہو رہے ۔

لذت سعی

چہ لطف رہروی، آنرا کہ خار خاری نیست
مرد بکعبہ اگر راہ ایمنی دارد

''خار'' خلجان ۔ کہتا ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہ ہو سفر میں کچھ لطف نہیں ، پس اگر کعبے کی راہ پر امن ہے تو کعبے جانا نہیں چاہیے ؛ فی الحقیقۃ جو لوگ نہایت کٹھن منزلیں طے کر کے مقام مقصود تک پہنچتے تھے، جو خوشی اُن کو منزل پر پہنچنے سے ہوتی ہوگی اُس کا سواں (۱۰۰) حصہ بھی اُن لوگوں کو حاصل نہیں ہوتی جو ریل اور اسٹیمر میں آج کل سفر کرتے ہیں ۔

ناشناسی ابنائے زماں

بیاورید گر ایں جا بود زباندانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

حد سے زیادہ بلیغ شعر ہے۔ اگرچہ مضمون عام ہے مگر خود شاعر کے حال پر خوب چسپاں ہوتا ہے اور اس نے یقیناً اپنی ہی نسبت کہا ہے۔ جب کوئی غیر ملک کا مسافر شہر میں وارد ہوتا ہے اور اس کی زبان کوئی نہیں سمجھتا تو ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر کچھ تو اس لیے کہ کسی کو اپنا قدردان اور پایا شناس نہیں پاتا اور کچھ اس لیے کہ اپنے نازک اور باریک خیالات کا سمجھنے والا کسی کو نہیں دیکھتا، اپنے تئیں غریب شہر، یعنی شہر میں بالکل اجنبی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی ترجمان کو بلاؤ کہ اجنبی مسافر کچھ باتیں جو کہنے کے لائق ہیں کہنی چاہتا ہے۔

عاشقانہ

پیشم ازاں بپرس کہ پرسی و اہل کوئے
گویند خستہ زحمت خود زیں دیار برد

نازم فریب صلح کہ غالب ز کوئے تو
ناکام رفت و خاطر امیدوار برد

رندانہ

ہر کرا رخت نمازے نبود از نم مے
جائے در حلقۂ رندان قدح نوش مباد

جامہ یا رخت کا نمازی ہونا اُس کے آلودہ ہونے کو کہتے ہیں ، باقی شعر کے معنی صاف ہیں ۔

رندانہ

مفتیاں ! بادہ عزیز ست ، مریزید بخاک
جوشد از پردہ دگر خون سیاؤش ، مباد

دوسرے مصرع کی تقدیر عبارت یوں ہے ''مبادا خون سیاؤش ، دیگر از پردہ بجوشد'' ۔ سیاؤش کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بےگناہ اپنے سسرے افراسیاب کے ہاتھ سے مارا گیا تھا اور اُس کے خون کے وبال میں تمام ملک کشت و خون میں مبتلا رہا ۔ کہتا ہے کہ اے مفتیو! شراب بھی بڑی عزیز چیز ہے ، اُس کو زمین پر مت گراؤ ایسا نہ ہو کہ خون سیاؤش پھر جوش مارے ۔

شکایت چرخ

از رشک کرد آنچہ بمن روزگار کرد
در خستگی نشاط مرا دید ۔ خوار کرد

یہ غزل غالباً اُس زمانے میں لکھی گئی ہے جب مرزا عدالت کے مواخذے میں پھنس گئے تھے ۔ یعنی زمانے نے جب مجھ کو دیکھا کہ خستگی اور تکلیف میں بھی خوش ہے تو مجھے ذلیل و خوار کردیا کہ اب تو خوش نہ رہے گا ۔

شکوہ چرخ

در دل ہمی ز بینش من کینہ داشت چرخ
چوں دید کاں نماند نہاں ۔ آشکار کرد

یعنی میری دانش و بینش کے سبب مجھ سے آسمان پوشیدہ کینہ تو رکھتا ھی تھا ، اب جو دیکھا کہ وہ کینہ لوگوں پر ظاھر ھوگیا ھے تو آسمان کھل کھیلا اور اعلانیہ دشمنی کرنے لگا ۔

تقدیر

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج
دانا خورد دریغ کہ ناداں چہ کار کرد

یعنی جو کچھ ھوا وہ میری نادانی سے نہیں بلکہ قضا و قدر کے حکم سے ھوا ۔

شوخی

نومیدی از تو کفر و تو راضی نۂ بکفر
نومیدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

ما حصل شعر کا یہ ھے کہ درحقیقت میں ھوں تو ناآمید مگر چونکہ تجھ سے نا امید ھونا کفر ھے اور تو کفر سے راضی نہیں اس لیے مجبور اپنے تئیں امیدوار بنایا ھے ۔

تصوف

بشرع آویز و حق میجو ۔ زمجنوں کم نۂ بارے
دلش با محمل است امّا زباں با سارباں دارد

یعنی شرع سے بھی تعلق رکھ اور خدا کو بھی ڈھونڈھ ؛ آخر تو مجنوں سے کم نہیں ھے کہ اُس کا دل تو محمل میں اٹکا ھوا ھے ، مگر زبان کو ساربان سے سروکار ھے یعنی ساربان سے باتیں کر رھا ھے اور دل لیلیٰ سے لگا ھوا ھے ۔

شرع کو ساربان سے اور حق کو محمل سے تمثیل دی ہے اور یہ نہایت بلیغ تمثیل ہے اور شعر نوادر افکار سے ہے -

عاشقانہ

خدا را وقت پرسش نیست - گفتم - بگزر از غالب
که هم جان برلب و هم داستان ها بر زبان دارد

''گفتم'' - یعنی میں نے کہدیا ہے یا میں کہے دیتا ہوں کہ یہ پرسش کا خیال چھوڑدے کیوں کہ اُس کی جان لبوں پر ہے اور داستان زبان پر ؛ مبادا وہ اپنی درد انگیز داستان بیان کرے اور داستان کے ساتھ ہی اُس کی جان بھی نکل جائے -

گویند صنعاں توبه کرد از کفر - ناداں بندۂ
کز خود فرو شیهائے دیں بخشش ز یزداں خوش نکرد

صنعاں کا قصہ مشہور ہے جو پہلے عابد تھا پھر فسق و فجور میں مبتلا ہوگیا یہاں تک کہ کفر تک نوبت پہنچ گئی ، پھر متنبہ ہوا اور کفر سے توبہ کی - کہ صنعان کا کفر سے توبہ کرنا مشہور ہے ؛ وہ عجب نادان بندہ ہے جس نے دین کی خود فروشی کے سبب خدا کی بخشش کو پسند نہ کیا یعنی خدا کی خالص بخشش تو وہ تھی کہ وہ توبہ نہ کرتا اور کفر ہی پر مرتا اور پھر خدا اُس کو بخش دیتا اور اب جو بخشا جائے گا تو یہ بخشش دین کی قیمت ہوگی پس گویا اُس نے دین کی خود فروسی کے بھروسے پر خدا کی خالص بخشش کو پسند نہ کیا - ''خوش کردن'' کے معنی ہیں پسند کرنا -

عاشقانہ

آں خود بہ بازی می‌برد ۔ دیں را دو جو می‌نشمرد
بنمودمش دیں خندہ زد۔ آورد مش جاں خوش نکرد

شوخی

بامن میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب‌نظر دین بزرگاں خوش نکرد

"میاویز" یعنی مجھ سے جھگڑا مت کر "فرزند آذر" ابراھیم علیہ‌السلام ۔ باقی شعر کے معنی ظاہر ھیں ، یہ نرا مضمون ھی نہیں ھے بلکہ مرزا کے حسب حال بھی ھے ، کیوں کہ جہاں تک ھم کو معلوم ھے مرزا کے والد سنی‌المذھب اور خود مرزا اثنا عشری تھے ۔

شوخی

در ستم حق ناشناسش گفتن از انصاف نیست
آں کہ چندیں تکیہ بر حلم خداوندش بود

کہتا ھے کہ اُس ظالم کو حق ناشناس کہنا انصاف نہیں ھے جس کو خدا کے حلم پر اس قدر بھروسا ھے کہ اُس کے بھروسے پر ظلم کیے چلا جاتا ھے اور اُس کے مواخذے سے نہیں ڈرتا ۔

اخلاق

با خرد گفتم نشان اہل معنی باز گوے
گفت گفتارے کہ با کردار پیوندش بود

بہر خواری بسکہ سرگرم تلاشم کردہ اند
پارۂ نزدیک در ہر دور باشم کردہ اند

''دور باش'' ہٹو بچو کی آواز کو کہتے ہیں جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے نقیب پکارتے چلتے ہیں۔ کہتا ہے کہ مجھ کو جو قضا و قدر نے سرگرم تلاش کیا ہے، اس سے مقصود میرا خوار و ذلیل کرنا ہے۔ پس راہ تلاش میں جو دھتکار مجھ پر پڑتی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ میری ذلت و خواری زیادہ ہوتی ہے اور اس طرح جو امر میرے سرگرم تلاش کرنے سے مقصود ہے وہ حاصل ہوتا ہے۔ پس گویا ہر 'دور باش' پر میں کسی قدر مقصود کے نزدیک ہوتا جاتا ہوں۔

زارنالی

چرخ ہر روزم غم فردا بخوردن می دید
تا قیامت فارغ از فکر معاشم کردہ اند

منقبت

از چہ غالب خواجگیہای جہاں ننگ منست
گر نہ با سلماں و بوذر خواجہ تاشم کردہ اند

عاشقانہ

بخشم ناسزا می‌گوید و از لطف گفتارش
گماں دارم کہ حرف دلنشینی بعد ازیں گوید

''لطف گفتار'' کی تعریف اس سے بہتر کسی پیرائے میں نہیں ہو سکتی۔ کہتا ہے کہ معشوق غصے میں برابر مجھ کو برا بھلا کہتا ہے، مگر اس کے لطف کلام سے میں ہمیشہ اسی امید میں رہتا ہوں کہ اب کوئی اچھی بات کہتا ہے، اب کوئی مہربانی کا کلمہ اس کی زبان سے نکلتا ہے۔

فخریہ

دل از پہلو بروں آرم جمش جام خود انگارد
دگر لختے بر افشانم سلیمانش نگیں گوید

اپنے دل پر فخر کرتا ہے کہ اگر اس کو پہلو سے نکال کر دکھاؤں تو جمشید اس کو اپنا جام جہاں بیں سمجھے اور اگر اس کا ایک لختہ نکال کر ڈال دوں تو سلیمان اس کو خاتم سلیمانی کا نگیں بنائے ۔

عاشقانہ

من بہ وفا مردم ورقیب بدر زد
نیمہ لبش انگبیں و نیمہ بتر زد

''بدر زد'' یعنی نکل بھاگا ''بتر زد'' مصری ۔ کہتا ہے کہ میں تو نباہ کرتا کرتا مر گیا اور رقیب نکل بھاگا، گویا معشوق کا آدھا لب شہد تھا کہ میں اس میں پھنس کر رہ گیا اور آدھا مصری تھا کہ رقیب اس پر سے اڑ گیا ۔

عاشقانہ

دعویٰ او را بود دلیل بدیہی
خندۂ دنداں نما بحسن گہر زد

کتنے بڑے خیال کو کن مختصر لفظوں میں اور پھر کس صفائی اور خوبی سے ادا کیا ہے ۔ کہتا ہے کہ معشوق موتی پر اس طرح ہنسا کہ اس کے دانت نظر آنے لگے ۔ پس اس کا خندہ گویا اس بات کا دعویٰ ہے کہ موتی کی کچھ حقیقت میرے دانتوں کے سامنے نہیں اور اس دعوے کی دلیل اس کا خندۂ دنداں نما ہے کیوں کہ اس کے دانتوں کا سب پر ظاہر ہو جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ موتی

اُس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے - پس اُس کے دعوے کی دلیل نہایت بدیہی اور ظاہر ہے -

شکوہ چرخ

نہم جبیں بدرش آستاں بگرداند
نشیمنش بہ سر رہ عناں بگرداند

آستاں بہ‌گرداند ، یعنی چوکھٹ کے پتھر کو اُلٹ کر اوپر کا رخ نیچے اور نیچے کا رخ اوپر کر دیتا ہے -

امتحان الٰہی

تو نالی از خلۂ خار و ننگری کہ سپہر
سر حسین علی بر سنان بگرداند

قطعہ

برو - بشادی و اندوہ دل منہ کہ قضا
چو قرعہ برنمط امتحاں بگرداند
یزید را بہ بساط خلیفہ بنشاند
کلیم را بہ لباس شباں بگرداند

تصوف

تیغت ز فرق تا بہ گلویم رسیدہ باد
شوخی زحد گذشت زبانم بریدہ باد

اول یہ آرزو کرتا ہے کہ تیری تلوار میرے سر پر پڑے اور حلق تک اُتر جائے - پھر یہ سمجھ کر کہ یہ مرتبہ

ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتا ، کہتا ہے کہ گستاخی حد سے گزر گئی میری زبان قلم ہوجیو -

عاشقانہ

گر رفتہ ام ز کوئے تو آسان نرفتہ ام
ایں قصہ از زبان عزیزاں شنیدہ باد
ذوقیست ہمدمی بفغاں بگذرم ز رشک
خار رہت بپائے عزیزاں خلیدہ باد

یعنی اگرچہ تیرے عشق میں دوسرے کی شرکت گوارا نہیں مگر چوں کہ کئی آدمیوں کے مل کر نالہ و فریاد کرنے میں عجب لطف ہے اس لیے میں رشک سے قطع نظر کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ”خار رہت بپائے عزیزاں خلیدہ باد -“

عاشقانہ

در تیغ زدن منت بسیار نہادند
بردند سر از دوش و سبکدوش نکردند

یعنی تلوار سے سر اتار کر بھی معشوق نے سبک دوش نہ کیا؛ پہلے سر کا بوجھ تھا اب اس احسان کا بوجھ ہے کہ اپنی تلوار سے یہ بے قدر سر اتارا ہے -

وصف مے و نے

روزیکہ بہ مے ز درد بہ نے شور نہفتند
اندیشہ بکار خرد و ہوش نکردند

یعنی شراب کا نشہ اور نَے کی آواز کا درد دونوں عقل و ہوش کے دشمن ہیں - پس جب کارکنان قضا و قدر نے شراب میں زور اور نَے میں شور ودیعت کیا تھا ، اس وقت

عقل و ہوش کے انجام کا کچھ خیال نہیں کیا ۔

تصوف

تاجر شوق در آں رہ بتجارت نرود
کہ رہ انجامد و سرمایہ بغارت نرود

یعنی شوق الہیٰ کا تاجر اس رستے نہیں چلتا کہ جو رستہ چلتے چلتے ختم ہوجائے اور اس رستے میں سرمایہ لوٹا نہ جائے ۔

تصوف

رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد
محرم آنست کہ رہ جز باشارت نرود

کہتا ہے کہ ہر نکتہ یعنی ہر چیز کی رمز کو سمجھناچاہئے کیوں کہ محرم راز وہی شخص ہے جو بغیر ادھر کے اشارے کے ایک قدم نہیں اٹھاتا ۔ یعنی جو کچھ نیچر سکھاتی ہے اس کے موافق عمل کرتا ہے ۔ کھانے میں ، پینے میں ، سونے میں ، جاگنے میں ؛ غرض کہ ہر کام اور ہر چیز میں نیچر کی ہدایت کے بغیر کچھ نہیں کرتا ۔

شوخی

زاہد از حور بہشتی بجز ایں نشناسد
کہ شود دست زد شوق و بکارت نرود

"دست زد شوق ہونا" یعنی شوق کے زیر مشق ہونا ۔ خلاصہ مطلب یہ کہ زاہد شریعت کے تمام الفاظ سے ان کے حقیقی معنی مراد لیتا ہے اور کسی بات کو تمثیل و استعارہ و کنایہ پر محمول نہیں کرتا ۔

عاشقانہ

بیا و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر
چو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر

کہتا ہے کہ آ اور دیدار کی تمنا جو میرے دل میں جوش مار رہی ، اُس کو دیکھ اور پلکوں کے رستے سے آنسو کی طرح میرا ٹپکنا ملاحظہ کر۔ جوشِ تمنائے دیدار کی تصویر اس سے بہتر غالباً کسی نے نہ کھینچی ہوگی کہ ''میں آنسو کی طرح پلکوں کے رستے سے ٹپکا جاتا ہو۔''

تصوف

ز من بجرمِ طپیدن کنارہ مے کردی
بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

عاشقانہ

دمید دانۂ و بالید و آشیاں گہ شد
در انتظارِ ہما دام چیدنم بنگر

کہتا ہے کہ ہما کے انتظار میں میرا جال بچھانا تو دیکھو ؛ جو دانہ جال کے نیچے ہما کے پھنسانے کے لیے ڈالا تھا وہ اُگا اور بڑھا اور یہاں تک بڑھا کہ اُس میں گھونسلے بن گئے مگر ہما ہی دام میں نہ آیا۔

غزل مسلسل عاشقانہ

اے ذوقِ نوا سنجی بازم بخروش آور
غوغائے شبیخونے بر بتگہِ ہوش آور

رندانه

گر خود نجهد از سر - از دیده فرو بارم
دل خوں کن و آں خوں را در سینه بجوش آور
هاں همدم فرزانه دانی ره ویرانه
شمعے که نه خواهد شد از باد خموش آور

ویرانه ، یعنی غریب خانه جو شمع که هوا سے نه بجھے گی ، یعنی شراب :

شورابۂ ایں وادی تلخست اگر داری
از شهر بسوئے من سر چشمۂ نوش آور

کہتا ہے کہ میں جس وادی میں ہوں یہاں کا پانی تو تلخ ہے ، اے همدم فرزانه اگر تو فیاض ہے تو شہر سے میرے لیے ''سرچشمۂ نوش'' یعنی شراب لا :

دانم که زرے داری هر جا گزرے داری
مے گر ندهد سلطاں از باده فروش آور
گر مغ به کدو ریزد بر کف نه و راهی شو
ور شه بسبو بخشد بردار و بدوش آور

کہتا ہے کہ تیرے پاس دام بھی ہیں اور تو سب جگہ آتا جاتا بھی ہے ، اگر بادشاہ عطا کرے تو فبہا ورنہ باده فروش سے لا ۔ اگر ''مغ'' (آتش پرست) یعنی باده فروش تونبے میں ڈال دے تو تونبا ہاتھ پر رکھ اور چل دے اور جو بادشاہ گھڑا بھر کر عنایت کرے تو کندھے پر اٹھا اور لے آ :

ریحاں دمد از مینا رامش چکد از قلقل
آں در ره چشم افگن ایں از پے گوش آور

''رامش'' راگ۔ ''آن'' سے مراد ریحان اور ''این'' سے مراد قلقل :

گاہے بسبکے دستی از بادہ ز خویشم بر
گاہے بسیہ مستی از نغمہ بہوش آور

''گاہے بسبک دستی'' یعنی کبھی جلدی سے مجھ کو شراب پلا کر مدھوش کر دے اور پھر جب میں بد مست ہوجاؤں تو مجھ کو گانا سنا کر ہوشیار کر :

غالب کہ بقایش باد۔ ہم پائے تو گر ناید
بارے غزلے، فردے، زاں موئنہ پوش آور

''ہم پائے تو'' یعنی ہمراہ تو ''موئنہ پوش'' اونی کپڑے پہننے والا ۔ مرزا جاڑے میں روئی دار کپڑا نہیں پہنتے تھے ، اکثر اونی یا پشمینے کا چغہ کوٹ اور ٹوپی وغیرہ پہنتے تھے ۔

عاشقانہ

یقین عشق کن و از سر گماں برخیز
بآشتی بہ نشین یا بہ امتحاں برخیز

تصوف

چرا بہ سنگ و گیا پیچی اے زبانۂ طور
ز راہ دیدہ بدل در رود ز جاں بر خیز

''زبانہ'' شعلہ ، وہ تجلی جو سنگ و گیاہ ، یعنی کوہ طور اور نخل ایمن پر ظاہر ہوئی تھی ، اس کی طرف خطاب کرتا ہے کہ اے شعلۂ طور ، پتھر اور درخت سے جو کہ تیرے قابل نہیں ہیں ، کیوں لپٹتا ہے؟ ہماری آنکھ کی راہ سے دل میں آتر اور جان سے بھڑک اٹھ ۔

عاشقانہ

عیادت است نہ پرخاش تند خوئی چیست
بیاؤ ، غم زدہ بنشین ، و لب گزاں برخیز

معشوق عیادت کو آیا ہے اور عاشق کا حال نہایت سقیم دیکھ کر بے لطف ہوا ہے ، اُس سے کہتا ہے کہ تو عیادت کے لیے آیا ہے ، لڑائی کے لیے نہیں آیا ، پھر یہ تند خوئی اور بد مزاجی کیسی ہے؟ یہاں آ کر بے لطفی کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ پس آ اور مغموم بیٹھ اور ہونٹ کاٹتا ہوا اٹھ -

اخلاق

نفس چوں زبوں گردد دیو را بفرماں گیر
محرم سلیمانم نقش خاتم از من پرس

کہتا ہے کہ جب نفس مغلوب ہو گیا پھر جن کو محکوم کر لینا آسان ہے ، میں سلیماں کا محرم راز ہوں ، اُس کی انگوٹھی پر یہی نگین کندہ تھا جس سے تمام جن اُس کے محکوم تھے -

رندانہ

بوسہ از لبانم دہ ، عمر خضر از من خواہ
جام مے بہ پیشم نہ، عشرت جم از من پرس

منقبت

ورد من بود غالب یا علی بو طالب
نیست بخل باطالب اسم اعظم از من پرس

کہتا ہے میرا وظیفہ ”یا علی ابن ابی طالب“ ہے ، مجھ کو

طالب صادق سے کچھ بخل نہیں ہے ۔ اسم اعظم مجھ سے پوچھ لے کہ یہی ''یا علی'' اسم اعظم ہے ۔

عاشقانہ

لطفے بتحت ہر نگہ خشمگیں شناس
آرایشِ جبین شگرفاں ز چیں شناس

اخلاق

بے غم نہاد مرد گرامی نمے شود
زنہار قدر خاطر اندوھگیں شناس

''زنہار'' کے معنی یہاں ضرور بالضرور کے ھیں ۔ یہ لفظ جب نہی پر آتا ہے تو ھرگز کے معنی ھوتے ھیں اور جب امر پر آتا ہے تو ضرور کے معنی دیتا ہے ۔

تصوف

دود سودائے تتق بست ، آسماں نامیدمش
دیدہ بر خواب پریشاں زد جہاں نامیدمش

دنیا وما فیہا کا ھیچ ھونا بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک خیالی دھواں اٹھ کر شامیانہ سا بن گیا ، ھم نے اس کا نام آسمان رکھ لیا اور آنکھ کو ایک پریشان خواب نظر آیا ، اس کو جہان سمجھ گئے ۔ اسی طرح اس کے بعد کے کئی شعروں میں اسی مضمون کی تفصیل ہے مثلاً :

تصوف

دھم ۔ خاکے ریخت در چشمم بیاباں دیدمش
قطرۂ بگداخت ۔ بحر بیکراں نامیدمش

باد دامن زد بر آتش نو بہاراں خواندمش
داغ گشت آں شعلہ از مستی خزاں نامیدمش

چونکہ نو بہار میں تمام جذبات نفسانی جوش میں آتے ہیں اور عشق و ہوس کی تحریک ہوتی ہے اس لیے بہار کو آگ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا نے آگ کو دامن سے سلگایا، میں نے اس کو بہار قرار دے دیا اور جب وہ شعلہ جل بجھا تو میں نے اس کا خزاں نام رکھ دیا۔

تعریض بر اہل وطن

غربتم ناساز گار آمد۔ وطن فہمیدمش
کرد تنگی حلقۂ دام۔ آشیاں نامیدمش

کہتا ہے کہ جب پردیس میں مجھے تکلیفیں پہنچنے لگیں تو میں اس کو وطن سمجھا، گویا جب دام کے حلقہ نے تنگی کی تو میں اس کو اپنا آشیانہ سمجھ گیا۔ مطلب یہ کہ وطن میں اس قدر بے مہری اور مغائرت لوگوں سے دیکھی تھی کہ جب پردیس مجھ کو راس نہ آیا تو میں نے اس کو بھی وطن ہی تصور کر لیا۔

عاشقانہ

بود در پہلو بہ تمکینے کہ دل مے گفتمش
رفت از شوخی بآئینے کہ جاں نامیدمش

یہاں "بود" کی ضمیر معشوق کی طرف راجع ہے۔ کہتا ہے کہ وہ میرے پہلو میں ایسی تمکین کے ساتھ بیٹھا تھا جس طرح پہلو میں دل رہتا ہے اور شوخی سے اٹھ کر اس طرح چلا گیا کہ میں اس کو جان کہہ اٹھا یعنی جو جان کے جانے سے

کیفیت ہوتی ہے ، وہی اُس کے جانے سے ہوئی ۔

عاشقانہ

دل زبان را راز دان آشنائے ها نخواست
گاہ ہہاں[1] گفتمش گاہے فلاں نامیدمش
در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتم
کعبہ دیدم ۔ نقش پائے رہروان نامیدمش

دل در غمش بسوز ! کہ جاں میدہد عوض
در جاں دہی غمے بہ ازاں میدہد عوض
نبود سخن سرائی ما رائگاں کہ دوست
دل می برد زما و زباں میدہد عوض

کہتا ہے کہ یہ "سخن سرائی" ہم کو مفت نہیں ملی ہے بلکہ دوست جب دل لے لیتا ہے تو اُس کے عوض زبان عنایت کرتا ہے ۔ زبان کو دل کا عوض قرار دینے میں شاعر نے لطافت یہ رکھی ہے کہ فی الحقیقت جب تک انسان کہیں دل نہیں دیتا اور عاشق نہیں ہوتا تب تک زبان میں گرمی اور شعلہ بیانی پیدا نہیں ہو سکتی ، خواہ عشق مجازی ہو خواہ عشق حقیقی ۔

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ
ترا کہ ہست دنیا شامی از بہار چہ حظ
خوش است کوثر و پاکست بادہ کہ در دست
ازاں رحیق مقدس دریں خمار چہ حظ

۱۔ ہماں اور فلاں دونوں مترادف یک دگر ہیں ۔ جب کسی کا نام صراحۃً نہیں لینا ہوتا تو وہاں یہ الفاظ بولے جاتے ہیں ۔ اُردو میں ایسے موقع پر وہ یا وہ شخص یا امکا ڈھمکا بولتے ہیں ۔ ۱۲

تصوف

چمن پر از گل و نسرین و دلربائی نیست
بدشت فتنه ازیں گرد بے سوار چه حظ

"چمن پر از گل و نسرین" سے مراد دنیا ہے اور "دلربا" سے مراد وہ ذات ہے جو دید و دریافت سے باہر ہے۔ کہتا ہے کہ اس فتنہ خیز دشت یعنی دنیا میں جہاں قدم قدم پر راہزن اور قزاق گھات میں لگے ہوئے ہیں؛ اس گرد بے سوار سے کیا مدد پہنچ سکتی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب راہ میں مسافر کو خطرہ ہوتا ہے اور اس کی کمک کے لیے کوئی سوار آتا ہے تو اول گرد نظر آتی ہے پھر سوار نمودار ہوتا ہے مگر اس دشت میں گرد یعنی آثار و علامات تو سب موجود ہیں مگر سوار کا کہیں پتہ نہیں۔

تصوف

چنیں کہ نخل بلند است و سنگ ناپیدا
ز میوہ تا نہ فتد خود ز شاخسار چه حظ

یعنی جب کہ نخل اس قدر بلند ہے اور پھل جھاڑنے کے لیے پتھر ناپید ہیں تو جب تک میوہ خود درخت سے نہ گرے یعنی جب تک جاذبۂ عنایت ہم کو خود اپنی طرف نہ کھینچے اور شاہد حقیقی خود اپنی جھلکی نہ دکھائے، ہم کو کیا فائدہ؟

شکایت فکر عقبہ

نہ مرا دولت دنیا۔ نہ مرا اجر جمیل
نہ چو نمرود توانا۔ نہ شکیبا چو خلیل

بنۂ وبار بہ شبگیر در افگندہ براہ
آنکہ دانست سراسیمگی صبح رحیل

''بنۂ وبار'' ساز وسامان ۔ ''شبگیر'' پچھلی رات ۔ یعنی جو شخص یہ جانتا ھے کہ کوچ کی صبح کو کیسی گھبراھٹ اور کھلبلی پڑتی ھے ، وہ رات ھی سے تمام ساز و سامان باندھ جوڑ کر رستے کے سرے پر ڈال دیتا ھے ۔

رندانہ

نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را
اے بہ ترسا بچگان کردہ مئے ناب سبیل

یہ خطاب ھے خدا کی طرف ، معنی ظاھر ھیں ۔

نا قدر دانی

غالب سوختہ جاں را چہ بگفتگار آری
بدیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

''ندانند نظیری ز قتیل'' یعنی نظیری اور قتیل میں فرق نہیں کرتے ۔

فخریہ

شعلہ چکد غم کرا ۔ گل شگفد مزد کو ؟
شمع شبستانیم ۔ باد سحرگاھیم

اپنی مصیبت اور اپنی فیض رسانی اور اس پر لوگوں کی بیدردی اور ناقدردانی ظاھر کرتا ھے ۔ کہتا ھے کہ میں گویا ''شمع شبستانی'' ھوں کہ اس میں سے شعلے جھڑتے ھیں مگر کسی کو اس کے ساتھ ھمدردی نہیں اور گویا میں باد سحرگاھی ھوں جو پھول کھلاتی ھے مگر اس کی اجرت

کوئی ادا نہیں کرتا ۔

شوخی

از صف طفلان و سنگ رہ شدہ بر خلق تنگ
زود کو نگزرد کوکبۂ شاہیم

یعنی میری شاہانہ سواری کوچے سے جلد نہیں گزرتی کیوں کہ لڑکوں کے ھجوم اور پتھروں کے ستھراؤ سے راہ تنگ ھوجاتی ہے ۔

تصوف

جذب تو باید قوی کاں ببرد باک نیست
گر نتواند رسید بخت بہمراہیم

کہتا ہے کہ تیرا جذبہ قوی چاہیے جو مجھ کو منزل تک لے جائے ۔ پس نصیب اگر میرے ساتھ نہ چل سکے تو کچھ حرج نہیں ۔

فخریہ

غالب نام آورم نام نشانم مپرس
ہم اسداللہم وہم اسداللہیم

رندانہ

برلب یا علی سرائے ۔ بادہ روانہ کردہ ایم
مشرب حق گزیدۂ ایم عیش مغانہ کردہ ایم

''روانہ کردہ ایم'' یعنی جاری کردہ ایم ۔ کہتا ہے چونکہ لب پر یا علی جاری ہے اس لحاظ سے تو ھم نے مذھب حق اختیار کیا ہے اور چونکہ اس پر شراب جاری ہے اس لحاظ سے ''مغوں'' یعنی آتش پرستوں کا سا عیش کرتے ھیں

یعنی دنیا و دین دونوں ہم کو حاصل ہیں ۔

ندامت

بادہ بوام خوردہ و زر بقمار باختہ
وہ کہ زہر چہ نا سزاست ہم بسزا نکردہ ایم

یعنی شراب پینا اور روپیہ ضائع کرنا تو برا تھا ہی، ہم نے ان برائیوں کو بھی خوبی کے ساتھ نہ کیا، شراب پی تو قرض کی اور روپیہ کھویا تو جوئے میں ۔

کتمان عشق

نالہ بہ بلب شکستہ ایم ۔ داغ بدل نہفتہ ایم
دولتیان ممسکیم زر بخزانہ کردہ ایم

''نالہ بلب شکستہ ایم'' یعنی اس کو منہ سے نہیں نکلنے دیتے اور ضبط کرتے ہیں اور داغ کو دل میں چھپائے رکھتے ہیں ؛ ہم دولت مند تو ہیں مگر خسیس ہیں، اپنی دولت کو خزانے میں رکھتے ہیں ۔

تصوف

گر فراموشی بفریادم رس ۔ وقتست وقت
رفتہ ام از خویشتن چندانکہ در یاد خودم

کہتا ہے کہ میں اپنے آپ سے تو گزرگیا ہوں مگر ابھی آپ کو بھولا نہیں ہوں، اگر فراموشی اس وقت میری فریاد کو پہنچے اور آپ کو بھلا بھی دے تو بہت مناسب ہے ۔

تصوف

هر قدم لختے ز خود رفتن بود در بار من
همچو شمع بزم در راه فنا زاد خودم

کہتا ہے کہ ''راہ فنا'' میں جو کچھ کہ میرے ''بار'' یعنی خورجی یا زنبیل میں ہے وہ صرف یہی ہے کہ ہر قدم پر تھوڑا تھوڑا اپنے آپ سے دور ہوتا جاتا ہوں گویا جس طرح کہ شمع راہ فنا میں آپ ہی اپنا زاد راہ ہے کہ برابر پگھلتی جاتی ہے اور زاد راہ کی طرح نبڑتی جاتی ہے۔ اسی طرح میں بھی آپ اپنا زاد راہ ہوں۔

عاشقانہ

یاد باد آں روزگاراں کاعتباری داشتم
آہ آتش‌ناکے و چشم اشک‌بارے داشتم

جوانی کے زمانے کو یاد کرتا ہے جب کہ بوالہوسی یا عشق و محبت زور شور پر تھا، آہ آتش ناک تھی اور آنکھ اشک بار۔

بے خودی

دیگر از خویشم خبر نبود ۔ تکلف برطرف
ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

عاشقانہ

ایں چہ شورست کہ از شوق تو در سر دارم
دل پروانۂ و تمکین سمندر دارم

تصوف

آں چرا درطرب و ایں زچہ رو درتعب است
خندہ بر غفلت درویش و تونگر دارم

کہتا ہے کہ میں درویش اور توانگر دونوں کی غفلت پر ہنستا ہوں جب کہ دنیا کا طرب اور تعب دونوں ہیچ ہیں تو ایک خوش کیوں ہے ؟ اور دوسرا رنجیدہ کس لیے ہے ؟

مناجات

راز دار تو ؤ بدنام کن گردش چرخ
ہم سپاس از تو ؤ ہم شکوہ ز اختر دارم

خدا سے کہتا ہے کہ جو تجھ سے تکلیف پہنچتی ہے اس کی مصلحت کو خوب سمجھتا ہوں مگر آسمان کو بدنام کرتا ہوں ؛ پس در حقیقت تیرا احسان مند ہوں مگر بظاہر ستارے کا شکوہ گزار ۔

عاشقانہ

خوشنودم از تو ؤ ز پے دور باش خلق
آوازۂ جفائے تو در عالم افگنم

کہتا ہے کہ میں نے تجھ کو جفا کار اس لیے مشہور کر رکھا ہے کہ اور کوئی تیری طرف رغبت نہ کرے ورنہ میں درحقیقت تجھ سے ہر طرح راضی اور خوشنود ہوں ۔

فخریہ

دو زند گر بفرض زمین را بہ آسمان
حاشا کزیں فشار در ابر و خم افگنم

افسوس متضمن

هم بعالم ز اهل عالم بر کنار افتاده ام
چوں امام سجه بیروں از شمار افتاده ام

عاشقانه

ز من حذر نکنی گر لباس دیں دارم
نهفته کافرم و بت در آستیں دارم

اس شعر کے مصداق وہ مکار اور ریا کار لوگ ہیں جن کو متشرع اور مقدس سمجھ کر اُن کے آگے کوئی بات ہنسی یا بے تہذیبی یا رند مشربی کی کہتے ہوئے شرم آتی ہے مگر اُن کو ذرا ٹٹول کر دیکھئے تو وہ ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنے والے نکلتے ہیں۔ اس میں خطاب معشوق کی طرف ہے جو نو عمر ہونے کے سبب مقدس آدمیوں کی صحبت سے بھاگتا ہے۔

شکایت

نشسته ام بگدائی بشاهراه و هنوز
هزار دزد بهر گوشه در کمیں دارم

'ہنوز' کا لفظ یہاں ایسا ہے جیسا اُردو میں 'تاہم' یا 'باوجود اس کے' بولتے ہیں۔ کہتا ہے کہ میں امیروں کی مدح سرائی کے لحاظ سے تو ایسا ہوں جیسے شاہراہ میں ایک گدا بیٹھا ہو مگر اس لحاظ سے کہ لوگ میرے مضون چراتے ہیں، میرا یہ حال ہے کہ ہزاروں چوٹے میری گھات میں لگے ہوئے ہیں۔

توقع

ز وعدہ دوزخیاں را فزوں نیازارند
توقعے عجب از آہ آتشیں دارم

کہتا ہے کہ اہل دوزخ کو ظاہر ہے کہ میعاد معین سے زیادہ دوزخ میں نہ رکھیں گے ؛ پس اس خیال سے میں اپنی آہ آتشیں سے ایک عجیب توقع رکھتا ہوں یعنی یہ کہ آہ آتشیں بھی ہمیشہ نہ رہے گی۔ اس توقع کو عجیب اس لیے کہا ہے کہ اُس کو بھی دوزخ پر قیاس کر کے اُس سے آخرکار نجات کا امیدوار ہے۔

جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب
خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

دوسرا مصرع نظیری کا ہے جس کا پہلا اصل مصرع یہ ہے "مرا بہ سادہ دلیہائے من تواں بخشید" نظیری کا یہ شعر بڑے رتبے کا ہے مگر حق یہ ہے کہ مرزا نے یہ مصرع تضمین کیا کیا ہے گویا اُس کو چھین لیا ہے۔ مرزا کے مقطع کا مطلب اب یہ ہو گیا کہ نظیری کی غزل پر غزل لکھنی تھی تو خطا مگر میں نے اُس پر ایسی غزل لکھی ہے کہ اپنی اس خطا پر آفرین کا امیدوار ہوں۔

غزل مسلسل عاشقانہ

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردش رطل گراں بگردانیم

معشوق سے کہتا ہے کہ تو آ تا کہ آسمان کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا ، ہم تم دونوں مل کر پلٹ دیں اور حکم قضا کو 'رطل گراں' یعنی جام شراب کی

گردش سے پھیر دیں -

بگوشۂ بنشینیم و در فراز کنیم
بکوچه بر سر راه پاسباں بگردانیم

"در فراز کنیم" یعنی دروازہ بند کر دیں اور چوکیدار کو حکم دیں کہ کوچے میں پھرتا رہے اور کسی کو نہ آنے دے -

اگر ز شحنه بود گیر و دار نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغان بگردانیم
اگر کلیم شود ہم زبان سخن نہ کنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
گل افگنیم و گلابے برہگزر پاشیم
مے آوریم و قدح درمیان بگردانیم
ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم
بکار و بار زنے کارداں بگردانیم
گہے بہ لابہ سخن با ادا بیامیزیم
گہے ببوسه زباں در دہاں بگردانیم

"لابہ" تملق و خوشامد، سخن کو ادا کے ساتھ ملانا، راؤ چاؤ اور را ز و نیاز کی باتیں کرنا -

نہیم شرم بیک سوؤ باہم آویزیم
بشوخیئے که رخ اختراں بگردانیم
ز جوش سینه سحر را نفس فرو بندیم
بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم

یعنی اختلاط کے موقع پر ہم دونوں ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کر دیں اور اس کو طلوع نہ ہونے

دیں اور دن کی گرمی کی بلا جہان سے ٹال دیں -

بوہم شب همه را در غلط بیندازیم
ز نیمه ره رمه را با شبان بگردانیم

یعنی سب کو رات کے دھوکے میں ڈال دیں یہاں تک کہ چرواھے کو ریوڑ سمیت آدھے رستے سے شہر کی طرف اُلٹا پھیر دیں -

بجنگ باج ستانان شاخساری را
تہی سبد زور گلستان بگردانیم

یعنی جو لوگ درختوں سے میوہ اور فواکہ کی ڈالی لینے کو آئیں اُن کو لڑ کر باغ کے باھر ھی سے خالی جھال کے ساتھ پھیر دیں -

به صلح بال فشانان صبح گاهی را
ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

یعنی جو پرندے صبح کو گھونسلوں سے درختوں پر آ کر کلیل کرتے ھیں ، اُن کو نرمی اور چمکار کے ساتھ گھونسلوں کی طرف لوٹا دیں -

ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

کہتا ہے ہم تو حیدری ھیں ؛ ہم سے تعجب نہیں کہ جس طرح بقول بعض حیدر کرار سے معجزۂ رد الشمس ظاھر ھوا تھا ، ہم بھی آفتاب کو مشرق کی طرف واپس پھیر دیں -

ندامت

رفت بر ما آنچه خود ما خواستیم
دایه از سلطان بغوغا خواستیم

قاعدہ ہے کہ جب فقیر بادشاہ سے بھیک مانگتے وقت شور و غل کرتا ہے تو اس کو مار کر ہٹا دیتے ہیں اور کچھ نہیں دیتے کہتا ہے کہ ہم پر سختی گزری وہ خود ہم نے ہی چاہی تھی کیونکہ پادشاہ سے بھیک مانگتے وقت غل شور بہت کیا اس لیے وہاں سے دھتکارے گئے اور کچھ نہ ملا ، سلطان سے مراد خدا تعالیٰ ہے ۔

فخریہ

دانش و گنجینہ پنداری یکے ست
حق نہاں داد آں چہ پیدا خواستیم

پنداری اور گوئی اور گویا کے ایک معنی ہیں ۔ کہتا ہے کہ علم اور خزانہ گویا ایک ہی چیز ہیں کیونکہ جو چیز ہم نے اعلانیہ مانگی یعنی دولت وہ خدا نے ہم کو پوشیدہ طور پر دی یعنی علم و ہنر ۔

تصوف

رفت و باز آمد ہما در دام ما
باز سر دادیم و عنقا خواستیم

کہتا ہے کہ ہما ہمارے دام میں پھنس کر نکل گیا تھا، پھر آن پھنسا، اب چاہئے تھا کہ اس کی زیادہ نگرانی کرتے اور اس کو نکلنے نہ دیتے مگر ہم نے اس کو خود چھوڑ دیا اور عنقا کی خواہش کی ۔ ہما سے مراد دولت دنیا اور عنقا سے مراد احدیت ذات ۔

آزادی

وحشتے در سفر از برگ سفر داشتہ ایم
توشۂ راہ - ولے بود کہ برداشتہ ایم

فخر متضمن

داغ احسان قبولی لئیمانش نیست
ناز بر خرّمی بخت ہنر داشتہ ایم

''قبولی'' اور قبول ایک معنی میں آتا ہے ، خرمی بخت ہنر ، یعنی سرسبزی بخت ہنر - کہتا ہے کہ ہم کو اپنے ہنر کی خوش نصیبی پر ناز ہے کیوں کہ اُس پر کمینوں کی قبولیت کے احسان کا داغ نہیں ہے -

شکوہ فخر متضمن شکایت

زخم جگرم بخیہ و مرہم نہ پسندم
موج گہرم - جنبش و رفتار ندانم

یعنی جس طرح زخم جگر تک بخیہ و مرہم کی رسائی نہیں ہے اور اب گہر موج میں جنبش و رفتار نہیں ہے ایسا ہی میرا حال ہے ، یعنی نہ کسی کو میرے درد کی خبر ہے نہ میرے کمال کی اطلاع ہے -

فخر

نقد خردم - سکۂ سلطان نہ پذیرم
جنس ہنرم گرمی بازار ندانم

شکو

غالب نبود کوتہی از دوست ہمانا
زاں ساں دہدم کام کہ بسیار ندانم

یعنی وہ اس طرح حاجت روائی کرتا ہے کہ اکثر مجھ کو شعور نہیں ہوتا کہ کیوں کر یہ کام بن گیا ۔

ذیل کی غزل نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں پڑھی گئی تھی ، چنانچہ دلی کے تمام نامور شعراء کا جو فارسی غزلیں لکھ کر لے جاتے تھے ، مرزا نے اس غزل میں ذکر کیا ہے اور غزل بھی نہایت فصیح ہے اس لیے بطور یادگار کے ساری غزل یہاں نقل کی جاتی ہے ۔

عاشقانہ

ها پری چہرہ غزالاں و ز مردم رم شاں[1]
دل مردم نجم طرۂ خم در خم شاں
کافرانند جہاں جوئے ۔ کہ ہرگز نبود
طرہ حور دلاویز تر از پرچم شاں
آشکا را کش ، بدنام و نکو نامی جوئے ؛
آہ ازیں طائفہ و آں کس کہ بود محرم شاں

صدق طلب

رشک بر تشنۂ تنہا رو وادی دارم
نہ بر آسودہ دلان حرم و زمزم شاں

اخلاق

بگزر از خستہ دلانے کہ ندانی ۔ ہش دار
خستگانند کہ دانند و نداری غم شاں

یعنی اُن مصیبت زدوں کو جانے دے جن کو تو نہیں جانتا ، مگر خبردار رہ کہ بہت سے ایسے آفت زدہ ہیں جن کو

۱- یعنی زہے پری چہرہ غزالاں ۱۲

تو جانتا ہے ، مگر اُن کا کچھ غم تجھ کو نہیں ۔

بیدردی

داغ خوں گرمی ایں چارہ گرانم ۔ گوئی
آتش ست آتش اگر پنبہ و گرہم شان

ذکر

اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایان عجم
چہ بما منت بسیار نہی از کم شان

معاصرین خود

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود[1]
باد در خلوت شان مشک فشاں از دم شان
مومن و نیر و صہبائی و علوی ۔ وانگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان
غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار
ہست در بزم سخن ہمنفس و ہمدم شان

مومن ، یعنی حکیم مومن خاں جن کے دیوان اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں موجود ہیں ۔ نیر ، یعنی نواب ضیاءالدین احمد خاں رئیس لوہارو جن کا کلام دونوں زبانوں میں معتد بہ موجود ہے ، مگر کوئی دیوان مرتب نہیں ہوا ۔ صہبائی ، یعنی مولانا امام بخش جن کی نظم و نثر فارسی اور دیگر رسائل اور شروح تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں ۔ علوی، مولانا عبداللہ خاں علوی اُستاد مولانا صہبائی جن کی نظم و نثر فارسی چھپ چکی ہے اور عربی میں بھی اُن کے قصائد موجود ہیں ۔ حسرتی، نواب

۱- یعنی خوش نفساں سخنورانند ۱۲

محمد مصطفیٰ خاں رئیس جہانگیر آباد جن کے دیوان اردو و فارسی زبانوں میں چھپ چکے ھیں اور اس کے سوا سفر نامۂ حج، تذکرہ گلشن بیخار اور رقعات فارسی بھی اُن کی تصانیف سے شائع ھو چکی ھیں - آزردہ، مولانا مفتی محمد صدرالدین خاں جن کا کلام اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں موجود تھا، مگر افسوس ھے کہ اُس میں سے بہت کچھ ضائع ھو گیا ھے، لیکن بعض مذھبی رسالے جو اُن سے یادگار رہ گئے ھیں، شائع ھو چکے ھیں -

فخریہ

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواھد شدن
ایں مے از قحط خریداری کہن خواھد شدن

فخریہ

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواھد شدن
مطرب از شعرم بہر بزمے کہ خواھد زد نوا
چاک ھا ایثار جیب پیرھن خواھد شدن
حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواھد گرفت
دستگاہ! ناز شیخ و برھمن خواھد شدن

کہتا ھے کہ میرا ایک ایک حرف مذاق فتنہ میں جگہ پائے گا - یعنی فتنہ کو پسند آئے گا جس کا نتیجہ یہ ھوگا کہ برھمن اُس کو اپنے مواقق سمجھے گا اور شیخ اپنے موافق خیال کرے گا اور دونوں اپنی اپنی جگہ اُس پر فخر کریں گے اور ایک دوسرے کو جھٹلائیں گے اورآ پس میں گل خپ ھوں گے -

انجام شاعری

ھے چه می گویم؟ اگر اینست وضع روزگار
دفتر اشعار باب سوختن خواهد شدن

اس سے پہلے بطور فخر کے کہا تھا که یوں ھوگا اور ووں ھوگا، پھر کہتا ھے که ھے ھے میں کیا کہتا ھوں؟ اگر زمانے کا حال ایسا ھی رھا تو دفتر شعر باب سوختن یعنی جلا دینے کے لائق ھو جائے گا۔

چشم کور آئینه دعوی بکف خواھد گرفت
دست شل مشاطهٔ زلف سخن خواھد شدن
شاھد مضمون که اینک شھری جان و دلست
روستا آوارهٔ کام و دھن خواھد شدن

یعنی آینده یه حال ھوگا که شاھد مضمون جو اب جان و دل کے شہر میں مقام رکھتا ھے وہ کام و دھن کے دیہات میں آواره ھوجائے گا یعنی جن اشعار اور خیالات میں اب نہایت دقیق اور گھری نگاہ سے غور کی جاتی ھے، وہ صرف لوگوں کی زبانوں پر رہ جائیں گے اور اُن کی ته کو کوئی نه پہنچے گا۔

زاغ راغ اندر ھوائے نغمه بال و پر زناں
ھم نوائے پرده سنجان چمن خواھد شدن

جنگلی کوے (یعنی تک بندی کرنے والے شاعر) نغمه سنجی کی ھوا میں پنکھ پسارے ھوئے چمن کے نغمه سنجوں

(یعنی عالی درجہ شاعروں) کی برابری کریں گے۔

انجام دنیا

شاد باش اے دل دریں محفل ۔ کہ ہرجا نغمہ ایست
شیون رنج فراق جان و تن خواہد شدن

اب کہتا ہے کہ دنیا میں ان باتوں کا فکر کرنا بے سود ہے، یہ سب نغمے موزوں ہوں یا ناموزوں ایک دن موت کے نوحے بن جائیں گے۔

ہم فروغ شمع ہستی تیرگی خواہد گزید
ہم بساط بزم مستی پر شکن خواہد شدن
گرد پندار وجود از رہگذر خواہد نشست
بحر توحید عیانی موجزن خواہد شدن

کہتا ہے کہ ہستی کے دھوکے کا غبار جو راہ میں اٹھا ہوا نظر آتا ہے یہ سب بیٹھ جائے گا یعنی سب فنا ہوجائیں گے اور توحید عیانی کا دریا موجزن ہوگا یعنی ذات واحد کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔

ترجیح کافر بر مسلماناں

دولت بغلط نبود از سعی پشیماں شو
کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

کہتا ہے کہ دولت یعنی سعادت کبھی غلطی نہیں کرتی اور اسی کے پاس جاتی ہے جو اس کے لائق ہوتا ہے پس تو اے مخاطب اپنی سعی سے پشیماں ہو۔ اور وہ دولت کیا ہے؟ کافر ہونا ۔ کہتا ہے کہ تو کافر

تو نہیں ہوسکتا لاچار مسلمانی پر قناعت کر ۔ غالباً مرزا نے کفر سے وہ کفر مراد لیا ہے جو صوفیۂ کرام کی اصطلاح کے موافق ایک بڑا مرتبہ مراتب فقر درویشی میں سے شمار کیا جاتا ہے ۔ لیکن قطع نظر ان معنوں کے اس شعر کے ایک اور معنی نہایت لطیف و پاکیزہ زمانے کے حسب حال بھی ہوسکتے ہیں جو شاید شعر کہتے وقت مرزا کے خیال میں نہ گزرے ہوں مگر ضرور ہے کہ انھیں کے نتائجِ افکار میں شمار کیے جائیں کیوں کہ بلغا اکثر کلام کی بنیاد ایسے جامع اور حاوی الفاظ پر رکھتے ہیں کہ گوقائل کا مقصود ایک خاص معنی سے زیادہ نہ ہو مگر کلام اپنی عمومیت کے سبب بہت سے محمل رکھتا ہو ۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا مسلمان ہونا جس کو سارا زمانہ مسلمان کہے اور مسلمان سمجھے ، یہ تو بہت آسان ہے مگر قوم کی بھلائی کی وہ تدبیریں کرنی کہ اُس کی بھلائی اُن کے بغیر دشوار معلوم ہو اور اُن تدبیروں کے اختیار کرنے میں لوگوں کے طعن و تشنیع سے نہ ڈرنا یہاں تک کہ بد مذہب اور کافر مشہور ہونا مگر قوم کی خیر اندیشی سے دست کش نہ ہونا نہایت دشوار بلکہ بعض حالتوں میں قریب نا ممکن کے ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ایسا ایک فرد دنیا کی عجائبات میں سمجھا جاتا ہے ۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسا کافر بننا تو بہت مشکل ہے ناچار مسلمانی پر اکتفا کر ۔ یہ معنی کسی کے ذہن نشین کرنے نہایت مشکل تھے مگر الحمدللہ کہ خود ہماری قوم میں حسن اتفاق سے اس وقت ایک شخص موجود ہے جس کی حالت پر نظر کرنے کے بعد

اس شعر کے کوئی دوسرے معنی ان معنوں سے زیادہ چسپاں نہیں معلوم ہوتے یعنی ڈاکٹر سر سید احمد خاں جس نے کافر ، ملحد ، نیچری ، دجال ، سب کچھ کہلوانا منظور کیا مگر قوم کی خیر خواہی سے دست بردار نہ ہوا ۔

خطاب بہ ناقصاں

از هرزه رواں گشتن قلزم نتواں گشتن
جوئی ! بہ خیاباں روسیلی ! بہ بیاباں شو

''هرزه'' یعنی برائے نام جاری ہو جانے سے قلزم نہیں ہوا جا سکتا ؛ اے مخاطب تو ایک نالی ہے باغ کی کیاریوں میں جا اور ایک رو ہے جنگل کی راہ لے ۔ یہ آن ناقص العیار لوگوں کی طرف خطاب ہے جو کسی فن میں تھوڑی سی شُد بُد حاصل کر کے اپنے تئیں کاملین میں شمار کرنے لگتے ہیں ۔

اطاعت

گر چرخ فلک گر دی سر بر خط فرماں نہ
ور گوئے زمیں باشی وقف خم چوگاں شو

یعنی تو کیسا ہی عالی رتبہ اور گراں مایہ ہو جائے اطاعت وفرماں برداری کرنی ضرور ہے ، چاہو اطاعت کو عام لو اور چاہو خاص خدا کی فرماں برداری مراد رکھو کیوں کہ جس طرح دین میں بغیر خدا اور رسول کی فرماں برداری کے کام نہیں چلتا اسی طرح دنیا میں سلاطین و ملوک اور ماں اور باپ اور افسر اور آقا وغیرہ کی اطاعت کے بغیر کچھ بن نہیں آتی ۔

صبر و شکیب

در بند شکیبائی مردم ز جگر خائی
اے حوصلہ تنگی کن اے غصہ فراواں شو

کہتا ہے کہ صبر کے شکنجے میں کلیجہ مسوستا مر گیا یعنی تھک گیا - اب سوا اس کے اور کسی طرح اس بلا سے چھٹکارا نہیں کہ حوصلہ تنگی کرنے لگے اور غم حد سے بڑھ جائے - پس کہتا ہے کہ اے حوصلے تو جیسا کہ اب تک فراخ اور وسیع رہا ہے اب برخلاف اس کے تنگ ہو جا اور اے غم تو زیادہ ہو جا تاکہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکے اور کھل کھیلوں اور اس جگر خواری کے عذاب سے نجات پاؤں -

شکایت

سرمایہ کرامت کن و انگاہ بغارت بر
بر خرمن ما برقے بر مزرعۂ باراں شو

اگرچہ ہوتا ہمیشہ یہی ہے کہ اول سرمایہ دیتے ہیں پھر جب چاہتے ہیں اس کو تباہ کر دیتے ہیں مگر شاعر بطور مبالغہ کے یہ جتاتا ہے کہ ہماری کھیتی پر مینہ تو کبھی نہیں برساتا مگر خرمن پر بجلی گراتا رہتا ہے ؛ یہ انسان کی ایک قدرتی خاصیت ہے کہ مصیبتوں کے وقت نعمتوں کو بالکل فراموش کر دیتا ہے ، اسی خاصیت پر شاعر نے شعر کی بنیاد رکھی ہے -

ذیل کی غزل مسلسل اور محض عاشقانہ ہے جس میں معشوق کی خصلتیں بیان کی ہیں اور اس کو بہادر شاہ کی تعریف اور شکایت ظریفانہ پر حکم کیا ہے - اس غزل میں صرف حسن بیان کا لطف ہے ، خیالات بلند نہیں ہیں -

غزل مسلسل عاشقانہ

بتے دارم از اهل دل رم گرفته
بشوخی دل از خویشتن هم گرفته

''دل گرفتن'' اُکتا جانا یعنی اس قدر شوخ اور نازک مزاج ہے کہ اپنے آپ سے بھی بگڑ جاتا ہے۔

ز سفاک گفتن چو گل برشگفته
دریں شیوه خود را مسلم گرفته

یعنی اگر کوئی اُسے سفاک کہتا ہے تو برا نہیں مانتا بلکہ خوش ہوتا ہے گویا اپنی سفاکی کو مسلم الثبوت مانے ہوئے ہے:

فسوں خوانده وکار عیسیٰ نموده
پری بوده و خاتم از جم گرفته

یعنی افسوں سے معجزے کا کام لیتا ہے اور پری ہوکر جمشید کی انگوٹھی چھین لیتا ہے:

دمش رخنه در زهد یوسف فگنده
غمش گندم از دست آدم گرفته

''دم سے'' مراد بات ہے دوسرے مصرعے کے یہ معنی ہیں کہ اُس کے غم میں آدم کو گندم جیسی عزیز چیز فراموش ہو جاتی ہے:

گہے طعنه برلحن مطرب سروده
گہے خرده بر نطق همدم گرفته
به بیداد صد کشته برهم نهاده
ببازیچه صد گونه ماتم گرفته

یعنی آپ ہی مارتا ہے اور آپ ہی بطور کھیل کے ماتم کرتا ہے۔

بـرویش ز گـرمی نـگه تـاب خورده
بـگـویش بـر فـتن صـبا دم گـرفته
نـیارد ز مـن هیچ گـه یـاد هرگز
مـگر خـوئے خـاقـان اعظـم گرفته
ظفرکـز دم اوسـت در نـکته سـنجی
کـه غـالب بـآوازه عـالم گـرفـته

یہاں ''دم'' کے معنی افسوں اور کرامت کے ہیں، تقدیر عبارت یوں ہے کہ غالب در نکته سنجی به آوازه عالم‌گرفته۔

غزل مسلسل در توحید

چوں زبان‌ها لال و جان‌ها پر ز غوغا کردهٔ
بایدت از خویش پرسید آنچه با ما کردهٔ

یہ تمام غزل توحید میں ہے؛ کہتا ہے جب کہ تو نے ہماری زبانیں گونگی کر دی ہیں اور باوجود اس کے جانوں کے اندر شورش بھر دی ہے، اب تو اپنے ہی سے پوچھ لے کہ تو نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔

گرنهٔ مشتاق عرض دستگاه حسن خویش
(جاں فدایت) دیده از بهر چه بینا کردهٔ
هفت دوزخ درنهاد شرمساری مضمر است
انتقام ست ایں کـه با مجرم مدارا کردهٔ

کہتا ہے کہ شرمندگی وہ عذاب ہے جس کی نہاد یعنی ذات میں ساتوں دوزخ چھپی ہوئی ہیں، پس اگر تو نے گنہ‌گار کے ساتھ مدارا یعنی رعایت کی اور اس کو بخش دیا تو یہ

عین انتقام ہے ؛ وہ اس شرمندگی سے کہ باوجود اس قدر گناہوں کے ہم کو کچھ سزا نہیں دی ، گویا سات دوزخوں میں جھونک دیا گیا ۔

صد کشاد آں را کہ ہم امروز رخ بنمودۂ
مژدہ باد آں را کہ محو ذوق فردا کردۂ
خستگاں را دل بپرسش ہائے پنہاں بردۂ
با درستاں گر نوازش ہائے پیدا کردۂ

''خستگاں'' زخمی اور شکستہ دل لوگ یعنی جن کی حالت زار بظاہر ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا اُن پر خدا کا غصہ ہے ، ''درست'' صحیح و سالم کو کہتے ہیں ''درستان'' اُس کی جمع ہے یعنی وہ لوگ جن کی حالت درست اور ہر ایک خستگی اور شکستگی سے محفوظ ہے گویا ان پر خدا کی عنایت و مہربانی سب سے زیادہ ہے ۔ کہتا ہے کہ اگر تو نے درستوں پر ظاہری عنایتیں مبذول فرمائی ہیں تو زخمی دلوں کو پوشیدہ مہربانیوں سے مفتوں کیا ہے ۔

چشمۂ نوش ست از زہر عتابت کام جاں
تلخئی مے در مذاق ما گوارا کردۂ

خدا تعالیٰ کے غصے اور عتاب کو چشمۂ نوش قرار دیتا ہے اور اُس کو شراب سے تشبیہ دی ہے کہ جس طرح شراب کا ذائقہ ہر شخص کو تلخ معلوم ہوتا ہے مگر شرابیوں کے مذاق میں اُس سے زیادہ کوئی شے خوش گوار نہیں ، اسی طرح تیرا عتاب گو بظاہر تلخ معلوم ہو مگر تیرے عشاق اُس کو چشمۂ نوش سمجھتے ہیں ۔

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است
خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردۂ

کہتا ہے کہ تو نے مخلوقات کو پیدا کر کے اس میں اپنے حسن کا آپ تماشا دیکھا ہے تو گویا جلوۂ حسن اور نظارۂ عشق در حقیقت ایک ہی جنس سے ہیں یعنی ناظر اور منظور ایک چیز ہیں۔

چارہ ور سنگ وگیاہ و رنج با جاں‌دار بود
پیش ازاں کیں در رسد آں را مہیا کردۂ

کہتا ہے کہ بیماری تو جان دار کے ساتھ مخصوص تھی اور بیماری کا علاج سنگ و گیاہ یعنی معدنیات اور نباتات میں تھا ؛ پس تو نے جان داروں کے پیدا کرنے سے پہلے سنگ و گیاہ کو مہیا کر دیا جیسا کہ علم جیولوجی میں پہاڑوں اور درختوں کا حیوان اور انسان سے پہلے پیدا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

دیدہ می‌گرید ، زباں می نالد ، و دل می تپد
عقدہ‌ھا از کار غالب سر بسر وا کردۂ

مقطع میں پھر اپنی عادت کے موافق شوخی کی ہے ؛ تمام نا ملائم حالتوں کو جو قائل پر گزر رہی ہیں اُن کو از راہ شوخی اور طنز کے عمدہ پیرائے میں ڈھالا ہے۔ کہتا ہے کہ آنکھ روتی ہے ، زبان فریاد کرتی ہے اور دل تڑپتا ہے گویا تمام عقدے تو نے حل کر دیئے ہیں۔ چونکہ آنکھ کا رونا ، زبان کا فریاد کرنا اور دل کا تڑپنا ، ان تینوں حالتوں میں ایک کشایش کی صورت محسوس ہوتی ہے اس لیے ان تمام حالتوں کو اپنے عقدوں کے حل کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر اس مضمون کو شوخی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ عشق کی معراج یہی ہے کہ آنکھ روئے ، زبان فریاد

کرے ، اور دل تڑپے ؛ پس غالب پر جو یہ حالتیں طاری ہیں گویا عشق کی راہ میں جتنے عقدے تھے وہ تو نے سب حل کر دیئے -

غزل مسلسل عاشقانہ

تابم ز دل برد کافر ادائے
بالا بلندے کوتہ قبائے
چوں مرگ ناگہ بسیار تلخے
چوں جان شیریں اندک وفائے
در کام بخشی ممسک امیرے
در دلستانی مبرم گدائے
گستاخ سازے پوزش پسندے
طاقت گدازے صبر آزمائے
از خوئے ناخوش دوزخ نہیبے
وز روئے دلکش مینو لقائے
زردشت کیشے آتش پرستے
برسم گزارے زمزم سرائے

''برسم'' جھاؤ یا انار وغیرہ کی بالشت بھر کی لکڑیاں کاٹ کر آتش پرست رکھ لیتے ہیں اور عبادت یا نہانے یا کھانے کے وقت اُن کو ھاتھ میں لے کر پڑھتے ھیں - ''برسم گزار'' اور زمزم''سرائے'' آتش پرست کو کہتے ھیں - زمزم اور زمزمہ وہ دعا ھے جو آتش پرست 'برسم' ھاتھ میں لے کر پڑھتے ھیں -

در کینہ ورزی تفسیدہ دشتے
در مہربانی بستاں سرائے

''تفسیده دست'' تپتا ہوا صحرا ، باقی شعر کے معنی صاف ہیں ۔

از زلف پر خم مشکیں نقابے
از تابش تن زریں ردائے

یعنی ''زلف پر خم'' اس کے چہرے پر ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سیاہ نقاب منہ پر پڑی ہوئی ہو اور جو کپڑا وہ بدن پر ڈالتا ہے ، وہ بدن کی چمک دمک سے سنہری معلوم ہوتا ہے ۔

در عرض دعوی لیلی نکوہے
بر رغم غالب مجنوں ستائے

یعنی جب دعوی حسن و جمال کرتا ہے تو لیلی کی ہجو کرتا ہے اور غالب کے چڑانے کو مجنوں کی تعریف کرتا ہے کہ وہ بڑا عاشق صادق تھا ۔

عاشقانہ

تو کے ز جور پشیماں شدی چہ میگوئی
دروغ راست نمائی کہ داشتی داری

یعنی تو جو یہ کہتا ہے کہ ''میں ظلم سے پشیماں ہوگیا ہوں'' تو کب پشیمان ہوا ہے ؟ کیونکہ وہ جھوٹ جو سچ معلوم ہو جیسا تو پہلے بولتا ہے ، پس تیرا یہ کہنا کہ میں ظلم سے پشیمان ہوں یہ بھی اسی ظلم میں داخل ہے ۔

عاشقانہ

بسینہ چوں دل و در دل چو جاں خزیدی و باز
نگاہ مہر فزائے کہ داشتی داری

کہتا ہے کہ تو سینے میں دل کی طرح اور دل میں جان کی طرح بیٹھ چکا ہے پھر بھی تیری نگاہ مہر فزا کا وہی حال ہے جو پہلے تھا کہ محبت کی آگ بھڑکا ــ‘‘ چلی جاتی ہے ۔

عاشقانہ

عتاب و مہر تو از ہم شناختن نتواں
خرد فریب ادائے کہ داشتی داری

شکایت روزگار

جہان ساں ز تو برگشتہ اند گر غالب
ترا چہ باک ؟ خدائے کہ داشتی داری

تصوف

بیہودہ نیست سعی صبا در دیار ما
اے بوئے گل پیام تمنائے کیستی

عاشقانہ

یادش بخیر تا چہ قدر سبز بودۂ
اے طرف جوئبار چمن جائے کیستی

’’جائے کسے سبز بودن‘‘ اس کی جگہ کا خالی رہنا اور سبز ہونے کے معنی سر سبز و شاداب ہونے کے بھی ہیں ، ’’طرف جوئبار‘‘ کنارۂ جوئبار ۔ چمن کی پٹڑی پر سبزہ دیکھ کر کہتا ہے کہ اے کنارۂ جوئبار چمن تو جو اس قدر سر سبز و شاداب ہے تو کس کی جگہ ہے؟ کیوں کہ وہاں معشوق کو نہیں پایا اس لیے بطور شگون نیک کے اول یادش بخیر کہہ کر پھر سوال کرتا ہے ۔

تصوف

نشنیدہ لذت تو فرو مے رود و بدل
اے حرف محو ! لعل شکر خائے کیستی

تصوف

از ھیچ نقش غیر نکوئی ندیدۂ
اے دیدۂ محو چہرۂ زیبائے کیستی
باھیچ کافر ایں ھمہ سختی نہ میرود
اے شب بمرگ من کہ تو فردائے کیستی

''بمرگ من'' یعنی اے شب تجھ کو میری موت کی قسم ؛ چونکہ اُس وقت اپنی موت سے زیادہ کسی چیز کو عزیز نہیں سمجھتا اس لیے رات کو اپنی موت کی قسم دے کر پوچھتا ھے کہ تو کس کی فردائے قیامت ھے ، یعنی جو سختی کہ تجھ میں میرے اوپر گزر رھی ھے کسی کافر کے ساتھ نہ گزرتی ھوگی - پھر تو کافر سے بھی بڑھ کر کون سے گنہ گار کی قیامت کا دن ھے ، بتا تو سہی -

غزل مسلسل عاشقانہ

اے کہ گفتم ندھی داد دل - آرے ندھی
تا چو من بہ مغاں شیوہ نگارے ندھی
چشمۂ نوش ھمانا نہ تراود ز دلے
کش نگیری و در اندیشہ فشارے ندھی

کہتا ھے کہ اُس دل سے یقیناً ''چشمۂ نوش'' نہیں ٹپک سکتا جس کو کہ تو بھینچ کر تصور میں فشار نہ دبوے ، یعنی جب تک کہ دل عشق مجازی کے صدمے نہیں جھیلتا

اور طرح طرح کی کوفت اس میں نہیں اٹھاتا ، اُس میں صفائی اور لطافت اور گھلاوٹ پیدا نہیں ہوتی ۔

ماہ و خورشید دریں دائرہ بے کار نیند
تو کہ باشی؟ کہ بخود زحمت کارے ندھی

اور وہ کام یہی ہے کہ عشق کے شکنجے میں دل کو فشار دیا جائے ۔

سر براہ دم شمشیر جوانی نہ نہی
تن بہ بند غم فتراک سوارے ندھی
خوں بذوق غم یزداں نشناسی نخوری
دیں بمہر حق الفت گذارے ندھی

''یزداں نشناس'' اور ''حق الفت مگذار'' دونوں مرکب صفتیں ھیں ، باقی شعر کے معنی ظاھر ھیں ۔

آخرکار نہ پیداست؟ کہ در تن فسرد
کف خونے کہ بداں زینت دارے ندھی

''فسرد'' فسردن کا مضارع ہے ، ٹھٹھر جانا خشک ھو جانا ، یعنی کیا یہ بات ظاھر نہیں ہے کہ وہ خون جس سے تو کسی صلیب کو رنگین نہ کرے گا مرنے کے بعد بدن میں خشک ھو کر رہ جائے گا :

حیف گر تن بسگاں سر کوئے نرسد
وائے گر جاں بسر راہ گزرے ندھی
رھزنان اجل از دست تو ناگہ برند
نقد ھر شے کہ بسودائے بہارے ندھی
بخم طرۂ حوران بہشت آویزند
ناز پروردہ دلے را کہ بیارے ندھی

گرتنزل نبود ۔ ابر بہاری غالب
کہ در افشانی و ز افشاندہ شمارے ندھی

یعنی اگر اس کہنے میں تیری کسر شان نہ ہو تو اے غالب تیری مثال ابر بہاری کی سی ھے کہ موتی برساتا ھے اور اُن کی گنتی نہیں بتاتا ، یعنی بے شمار موتی برساتا ھے ۔

تصوف

دریا ز حباب آبلہ پائے طلب تست
نور نظر اے گوھر نایاب کجائی
شوریست نوا ریزی تار نفس را
پیدا نۂ اے جنبش مضراب کجائی

یعنی میرے تار نفس سے جو نغمے نکل رھے ھیں انھوں نے ایک شور برپا کر رکھا ھے ، مگر اے جنبش مضراب کہ جس سے یہ تار بج رھا ھے ، تو کہاں ھے؟ تیرا کہیں پتا نہیں ۔

فخریہ

بنمائے بہ گو سالہ پرستاں ید بیضا
غالب بہ سخن صاحب فرتاب کجائی

''فرتاب'' کرامت اور معجزے کو کہتے ھیں ''گوسالہ پرستوں'' سے وہ لوگ مراد ھیں جو ناقص‌المعیار شاعروں کو مانتے ھیں ۔

تصوف

دیدہ ور ۔ آں کہ نہد دل بشمار دلبری
در دل سنگ بنگرد رقص بتان آذری

"دیدہ ور" یعنی صاحب نظر وہ شخص ہے کہ جب اس کو یہ خیال پیدا ہو کہ دنیا میں کون سی چیزیں دلکش و دل ربا ہیں تو وہ ان گھڑ پتھر کے اندر بتان آذری کو رقص کرتے ہوئے دیکھ لے ، یعنی مادے میں جو قابلیت اور استعداد خدا نے ودیعت کی ہے وہ پہلے اس سے کہ قوت سے فعل آئے اس پر ظاہر ہو جائے۔

تصوف

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز برہ تو روی نیست
در طلبت تواں گرفت بادیہ را برہبری

یہ خطاب ہے جناب احدیت کی طرف ۔ کہتا ہے کہ جس ذرے کو دیکھئے اس کا منہ تیرے ہی رستے کی طرف پھر ہوا ہے اور اس لیے تیری راہ طلب میں خود بادیہ یعنی صحرا کو اپنا رہبر بنایا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کا ہر ذرہ تیری رہنمائی کرتا ہے۔

تصوف

ہر کہ دلست در برش ۔ داغ تو رویدش ز دل
تا چو بدیگرے دھد ۔ باز بری بداوری

کہتا ہے کہ جس کے پہلو میں دل ہے اس کے دل سے تیرا داغ روئیدگی کی طرح اُگتا ہے اور یہ اس لیے کہ اگر وہ دل کسی اور سے لگا لے تو اس حجت سے کہ تیری نشانی اس پر موجود ہے وہاں سے اپنی چیز یعنی دل واپس لے لے ۔ داوری ۔ جھگڑا ۔ ٹنٹا اور حجت ۔

رشک ملک چہ و چرا؟ چوں بتو رہ نمی برد
بیہدہ در ہوائے تو مے پرد از سبک سری

یعنی ہم ملائکہ پر کیوں رشک کریں جب کہ وہ بھی بے فائدہ تیری تلاش میں پرواز کرتے پھرتے ہیں اور تجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔

تصوف

حیف کہ من بخوں تپم ۔ وز تو سخن رود کہ تو
اشک بدیدہ بشمری ، نالہ بسینہ بنگری

یعنی افسوس ہے کہ میں تو خون میں پڑا ہوا لوٹوں اور تیری نسبت یہ کہا جائے کہ تو آنسو آنکھ کے اندر گن لیتا ہے اور فریاد کو سینے کے اندر دیکھ لیتا ہے۔

زار نالی

کوثر اگر بمن رسد خاک خورم ز بے نمی
طوبیٰ اگر ز من شود ہیمہ کشم ز بے بری

یعنی میری شومئی بخت کا یہ حال ہے کہ اگر کوثر مجھ کو مل جائے تو اس میں نمی باقی نہ رہے اور مجھے اس سے خاک کے سوا کچھ حاصل نہ ہو اور طوبیٰ میری ملک ہو جائے تو وہ ایسا بے بر ہو جائے کہ اس کی لکڑی ایندھن کے کام آئے۔

حالت فکر شعر

بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دم سخن رہ بضمیر من بری

کہتا ہے اگر فکر شعر کے وقت تو میری حالت درونی کو ٹٹولے تو دل کے گداز سے ایک آگ کی رو بہتی ہوئی تجھ کو نظر آئے یہ اس جوش اور اس آگ کا بیان ہے جو اصلی

شاعروں کے دل میں شعر کہتے وقت بھڑکتی رہتی ہے۔

مرزا کی غزلیات جو مقدار میں چار ہزار بیت سے کچھ زیادہ ہیں اور جن میں منتخب اور برگزیدہ اشعار ایک چوتھائی سے کم نہ ہوں گے اُن میں سے کسی قدر اشعار جو سرسری نظر میں صاف اور عمدہ معلوم ہوئے بطور نمونے کے یہاں نقل کر دیے گئے ہیں، تاکہ جو لوگ فارسی شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہیں، مگر اتنا دماغ نہیں رکھتے کہ مرزا کے کلام کو اول سے آخر تک بہ نظر غور دیکھیں وہ مرزا کی غزل کا نمونہ دیکھ کر اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ مرزا کی غزل شعرائے ایران کے کون سے طبقے کی غزل سے مناسبت رکھتی ہے اور اُن کی اور مرزا کی غزل میں کیا نسبت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ اُن سب لوگوں کی غزل کے ساتھ کیا جاتا جن کی غزل پر مرزا نے اپنی غزل، بلکہ اپنی شاعری کی بنیاد رکھی ہے، یعنی نظیری، عرفی، ظہوری، طالب، وغیرہ، مگر چونکہ اس مختصر میں زیادہ گنجائش نہیں اور نیز عام طبائع کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دل بستگی بھی نہیں معلوم ہوتی، اس لیے یہاں مرزا کی صرف دو غزلوں کا نظیری اور ظہوری کی غزلوں سے کہ اس وقت ان دونوں کے دیوان ہمارے پاس موجود ہیں، کیا جاتا ہے۔

نظیری کی جو مشہور غزل ''پاخفتست'' اور ''بلاخفتست'' ہے مرزا صاحب نے بھی اس پر غزل لکھی ہے۔ نظیری کی غزل نو بیت کی ہے جس میں سے ایک شعر پڑھا نہیں گیا اور مرزا کی غزل بارہ بیت کی ہے، اس لیے مرزا کی غزل میں سے بھی اول صرف آٹھ بیتیں یہاں لی جائیں گی تاکہ ٹھیک ٹھیک

موازنہ ہو سکے اور بعد موازنے کے مرزا کے باقی اشعار نقل کر دیے جاویں گے۔

نظیری

نظر بظاہر و صیاد در خفا خفتست
اجل رسیدہ چہ داند بلا کجا خفتست

غالب

بہوادئی کہ دراں خضر را عصا خفتست
بہ سینۂ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

نظیری نے اس بات کو کہ عشق ایسے طور پر دفعۃً پیدا ہو جاتا ہے جس کا سان گمان تک نہیں ہوتا ، ایک معمولی حالت کے پیرائے میں جو ہمیشہ صید اور صیاد کے باہم گزرتی رہتی ہے بیان کیا ہے۔ نظیری کا بیان، جیسا کہ ظاہر ہے، بہت صاف اور نیچرل ہے اور گو یہ مطلع اُس کے اعلیٰ درجے کے اشعار میں محسوب نہیں ہو سکتا لیکن مرزا کے مطلع سے بہرحال بہتر ہے۔

مرزا نے گویا اپنی ناگوار زندگی کا دشوار گزار مرحلہ خوشی خوشی طے کرنے کو اس تمثیل میں بیان کیا ہے کہ جس خطرناک وادی میں حضرت خضر بھی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں ، میں وہاں سینے کے بل چلتا ہوں۔ مرزا کے اس مطلع پر اُن کی زندگی میں ''عصاخفتست'' کے لفظ پر اعتراض ہوا تھا ؛ مرزا نے جواب دیا کہ سعدی نے بھی تو کہا ہے ''ولے بجملۂ اول عصائے پیر بخفت'' مگر اس جواب کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا ، کیوں کہ شیخ کے ہاں اس قدر قرائن موجود ہیں کہ ''عصا خفتن'' سے جو معنی

اُس نے بطور استعارے کے مراد رکھے ہیں، اُن کے سوا دوسرے معنی کی طرف خیال ہی نہیں جاتا۔ بخلاف مرزا کے شعر کے کہ جب تک یہ نہ جتایا جاوے کہ سعدی نے "عصا خفتن" کے یہ معنی لیے ہیں تب تک اُس سے یہ معنی مفہوم نہیں ہو سکتے۔

نظیری

کجا ز عشوۂ آں چشم نیم باز رہیم
کہ فتنہ خاستہ از خواب و پائے ما خفتست

غالب

وگر ز ایمنی راہ و قرب کعبہ چہ حظ
مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

نظیری معشوق کی اُس حالت کو جب کہ وہ سوتے سے اُٹھا ہو اور آنکھیں کچھ کھلی اور کچھ مُندی ہوں اور اپنا جی اُس کے سامنے سے پرے ہٹنے کو چاہتا نہ ہو، اس طرح ادا کرتا ہے کہ فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور ہمارا پاؤں سو گیا ہے؛ پس اُس کی چشم نیم باز کے عشوے سے کیوں کر رہائی ہو گی۔

مرزا مسافر کی اُس حسرت ناک حالت کو جب کہ راہ بے خطر اور منزل مقصود قریب ہو، مگر نہ مسافر میں، نہ اُس کی سواری میں آگے قدم اُٹھانے کی طاقت ہو، اس طرح بیان کرتے ہیں "وگر ز ایمنی راہ" الخ۔ ان دونوں شعروں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر مطلقاً ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ جو عاشقانہ مضامین کو پسند کرتے ہیں وہ ضرور نظیری کے شعر کو پسند کریں گے، مگر اس لحاظ

سے کہ مرزا کا بیان عاشق اور غیر عاشق سب کے حالات پر حاوی ہے ، ہر شخص جس پر ایسی حالت گزرے اس کا مصداق ہو سکتا ہے ، یقیناً نظیری کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے۔

نظیری

کسے به قلب شبم ترکتاز می آرد
که برفراش قصب پائی درحنا خفتست

غالب

غمت بشہر شبیخوں زناں نه بنگه خلق
عسس به خانهٔ و شه در حرم سرا خفتست

نظیری کا شعر محض عاشقانه ہے اوراس لحاظ سے کہ یہ مضمون ول اس کو سوجھا ہے ، مرزا کے شعر پر ترجیح دینے کے قابل ہے ۔ کہتا ہے کہ میرے گھر پر آدھی رات گئے وہ شخص آ کر ڈاکا ڈالتا ہے جو ریشمی بچھونوں میں پاؤں کو مہندی لگائے پڑا سوتا ہے ۔ مطلب یہ کہ اس کا تصور اور اس کا خیال بغیر اس کے کہ اس کو اطلاع ہو ، رات کو آ کر چھاتی پر سوار ہو جاتا ہے اور راحت و آرام بالکل برباد کر دیتا ہے ۔

مرزا کہتے ہیں کہ تیرا غم شہر میں لوگوں کے گھروں پر شب خون مار رہا ہے اور کوتوال اپنے گھر میں اور بادشاہ محل سرا میں چین سے پڑے سوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مرزا کے دل میں یہ خیال نظیری کے شعر سے پیدا ہوا ہے ، مگر مرزا کی غیر معمولی اپچ اور بلند پروازی کے ثبوت کے لیے صرف یہی اقتباس کافی ہے کہ تھوڑے سے تصرف سے

نظیری کے مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ نیز مرزا کے بیان میں حقیقت و مجاز دونوں پہلو موجود ہیں اور نظیری کا بیان صرف مجازی معنی میں محدود ہے۔

نظیری

شمیم مہر ز باغ وفا نمی آید
بہر چمن کہ تو بشگفتۂ صبا خفتست

غالب

ببیں ز دور و مجو قرب شہ کہ منظر را
دریچہ باز و بدروازہ اژدہا خفتست

اگرچہ مآل دونوں شعروں کا واحد ہے، مگر دونوں کے بیان کا عالم الگ الگ ہے۔ نظیری اس طرح بیان کرتا ہے کہ وفائے حقیقی کے باغ سے مہر و التفات کی خوشبو نہیں آتی، گویا جس چمن میں وہ پھول (یعنی معشوق حقیقی) کھلا ہوا ہے، وہاں کی صبا پڑی سوتی ہے، یعنی اس کو اہتزاز مطلق نہیں ہے جس سے اس چمن کی خوشبو عالم میں پھیلے۔

مرزا یوں کہتے ہیں کہ آثار و افعال کے ذریعے سے اس کو دور ہی سے دیکھ لو اور ''قرب شاہ'' یعنی ذات بحت کی تلاش مت کرو، کیوں کہ اگرچہ جھروکے کے پٹ کھلے ہوئے ہیں (یعنی اس کے آثار و افعال سب پر ظاہر ہیں) مگر اندر کوئی نہیں جانے پاتا، کیوں کہ عین دروازے پر اژدہا سوتا ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ مآل دونوں کا یہ ہے کہ معرفت ذات محالات سے ہے، مگر ہمارے نزدیک مرزا کا بیان نظیری کے بیان سے زیادہ بلیغ

اور دل کش واقع ہوا ہے ۔

نظیری

طبیب عشق ببرد طمع ز بیمارے
کہ شب براحت ازیں درد بے دوا خفتست

غالب

بصبح حشر چنیں خستہ رو سیہ خیزد
کہ در شکایت درد و غم دوا خفتست

نظیری کہتا ہے کہ مرض عشق کا طبیب اُس بیمار کے علاج سے مایوس ہوجاتا ہے کہ جو کسی رات کو اس درد بے دوا ، یعنی عشق کی بے چینی سے آرام کے ساتھ سوگیا ہو ؛ گویا مریض عشق کی علامت محمود یہی ہے کہ اُس کو کبھی راحت نصیب نہ ہو ، مگر شعرائے متصوفین کے اصول کے موافق نظیری کے بیان میں یہ خلل تھا کہ وہ راحت کو ردی علامت بتاتا ہے ، حالانکہ عاشق صادق کی علامت یہی ہے کہ اُس کو دوست کی راہ میں درد اور تکلیف کبھی محسوس ہی نہ ہو ، بلکہ ہر ایک درد اور تکلیف عین راحت معلوم ہو ؛ پس نظیری کے بیان سے گویا یہ لازم آتا تھا کہ عاشق صادق وہی ہے جو ہمیشہ بے چینی اور بے قراری میں بسر کرے اور جب ایسا ہوگا تو کبھی نہ کبھی شکایت بھی اُس کی زبان سے نکلے گی ۔

مرزا نے اسی لیے اس مضمون کو اُلٹ دیا ہے ، وہ کہتے ہیں کہ وہ بیمار حشر کے دن رو سیاہ اُٹھے گا جو درد دل کی شکایت اور دوا کی تلاش کرتا ہوا سویا ہے ۔

نظیری

کس از معانقۂ روز وصل یابد ذوق
که چند شب ز هم آغوش خود جدا خفتست

غالب

درازی شب و بیداری من ایں همه نیست
ز بخت من خبر آرید تا کجا خفتست

نظیری کا شعر صاف ہے، ''کس'' آں کس کی جگہ لایا ہے۔ ''معانقۂ روز وصل'' وہ معانقہ جو وصل کے دن عاشق و معشوق میں واقع ہو۔ شعر کا مضمون معمولی ہے، مگر الفاظ نے جان ڈال دی ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ شب ہجر کی درازی اور میری بیداری کا خیال کرتے ہو، یہ تو کچھ بھی بات نہیں، ہاں یہ تلاش کرو کہ میرا نصیب کہاں پڑا سوتا ہے، کیوں کہ رات کی درازی اور میری بیداری اور ایسی ایسی اور سیکڑوں مصیبتیں سب اُسی کے سوجانے سے پیدا ہوئی ہیں۔ محاکمہ دونوں میں یہ ہے کہ نظیری کا شعر زیادہ نیچرل اور حالی ہے اور مرزا کے شعر میں شاعرانہ لطافت اور خوبی نظیری کے شعر سے زیادہ ہے اور کوئی بات اُس میں آن نیچرل بھی نہیں ہے۔

نظیری

شب امید به از روز عید می گزرد
که آشنا به تمنائے آشنا خفتست

غالب

بدیں نیاز کہ باتست ناز می رسدم
گدا بہ سایۂ دیوار پادشاہ خفتست

نظیری کا شعر اس کی تمام غزل میں بیت‌الغزل ہے، بلکہ اس کے سارے دیوان کے ان ۲ے نشتروں میں سے ایک نشتر ہے جو اساتذہ نے اس کی غزلیات میں سے انتخاب کیے ہیں۔

مرزا کا شعر گو نظیری کے شعر کی برابری نہیں کر سکتا، مگر ایسے بلند شعر پر یہ شعر نکالنا مرزا ہی کا کام تھا۔ تشبیہ نہایت بلیغ اور دل نشین واقع ہوئی ہے، یعنی مجھ جیسے ادنیٰ درجے کے آدمی کو جو تیری جناب میں نیاز ہے، اس پر مجھ کو ایسا ہی ناز ہے جیسا اس فقیر کو ہونا چاہیے جو بادشاہی محل کی دیوار کے سایے میں پڑا ہو۔

نظیری

فسانہ صرف نظیری مکن کہ خواب کند
شکستۂ کہ بصد درد مبتلا خفتست

غالب

بخواب چون خودم آسودہ دل بداں غالب
کہ خستہ غرقہ بخوں خفتہ است تا خفتست

نظیری کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ نظیری کو فسانہ اس غرض سے سنانا فضول ہے کہ ایک شکستہ و کوفتہ آدمی (نظیری) جو طرح طرح کی تکلیف میں مبتلا ہو کر پڑ رہا ہے، وہ سو رہے گا۔

مرزا کے شعر کا ماحصل یہ ہے کہ اگر میں سو بھی جاؤں تو اے غالب ! مجھ کو اپنی طرح آسودہ اور خوش حال نہ سمجھنا ، کیوں کہ بیمار (یعنی میں) جب سویا ہوں تو خون میں ڈوبا ہوا سویا ہوں ؛ پس ایسے شخص کو جاگتے یا سوتے کیا راحت نصیب ہو سکتی ہے ۔

یہاں تک دونوں غزلوں میں سے صرف آٹھ آٹھ شعر ہم نے نقل کیے ہیں اور مرزا کے آٹھ شعر وہ لکھے ہیں جو کسی نہ کسی قدر نظیری کے اشعار سے لفظی یا معنوی مناسبت رکھتے تھے ۔ اب مرزا کے باقی اشعار جو نظیری کی غزل سے تعداد میں زیادہ ہیں لکھتے ہیں :

خروش حلقۂ زنداں ز نازنین پسریست
کہ سر بزانوے زاهد بہ بوریا خفتست
هوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و نا خدا خفتست
دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد
کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتست
براہ خفتن من هر کہ بنگرد داند
کہ میر قافلہ در کارواں سرا خفتست

پہلا شعر محض رندانہ ہے اور زبان کی گرمی اور شوخی کے سوا اور کوئی معنوی لطافت نہیں رکھتا ۔ اس کے بعد کے تینوں شعر ہم ت کی ردیف کے انتخابی اشعار میں مع ہر ایک کی شرح کے لکھ آئے ہیں ۔ ان میں سے پہلا شعر ہمارے نزدیک مرزا کی تمام غزل میں بیت‌الغزل ہے اور پچھلے دونوں شعر بھی نظیری کی غزل کے عام اشعار سے کسی طرح رتبے

میں کم نہیں ہیں ۔ پس اگر نظیری کا بہت ادب کیا جائے تو ہم اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے کہ دونوں غزلوں کو مساوی درجے میں رکھیں، ور نہ انصاف یہ ہے کہ ہیئات مجموعی کے لحاظ سے مرزا کی غزل نظیری کی غزل سے یقیناً بڑھ گئی ہے، لیکن ایک آدھ غزل میں نظیری سے سبقت لے جانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کی غزل کو مطلقاً نظیری کی غزل پر ترجیح دی جائے ۔ نظیری وہ شخص ہے جس کی نسبت مرزا صائب کہتے ہیں :

صائب چہ مجال ست شوی ہمچو نظیری
عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

اور مرزا جلال اسیر کہتے ہیں :

ہم چشمی نظیری حد بشر نباشد

اور شیخ ابوالفضل آئین اکبری میں اُس کی نسبت لکھتے ہیں: ''درے از نزہت گہ معنی بروی کشودہ اند'' پس ہماری غرض مذکورۂ بالا غزلوں کے مقابلہ کرنے سے صرف اس قدر تھی کہ مرزا نے غزل میں نظیری کے تتبع کو جس درجے تک پہنچایا تھا اُس سے لوگ اچھی طرح مطلع ہو جائیں، ورنہ اس غزل کے سوا اور جس قدر غزلیں مرزا نے نظیری کی غزلوں پر لکھی ہیں اُن میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہوگی جس میں نظیری کی غزل کا پلہ مرزا کی غزل سے غالب نہ ہو، کیوں کہ اکثر پچھلے شعراء اگلوں کی اُنھیں غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں جو اُن کے سارے دیوان میں چیدہ و برگزیدہ اور منتخب ہوتی ہیں ۔ پس ایسی زمینوں میں اگلوں سے پچھلوں کا سبقت لے جانا کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے ۔

اب ہم مرزا کی ایک غزل کا موازنہ ظہوری کی ایک غزل کے ساتھ کرتے ہیں کہ یہ دونوں غزلیں شیخ سعدی کی اس غزل پر لکھی گئی ہیں :

شب فراق چہ داند کہ تا سحر چند ست
مگر کسے کہ بزندان عشق در بند ست

اگرچہ مرزا نے ظہوری کی غزلوں پر بہت کم غزلیں لکھی ہیں ، مگر چونکہ وہ اپنے تئیں ظہوری کا متبع ظاہر کرتے ہیں ، اس لیے اُس کی ایک غزل کے ساتھ بھی مرزا کی غزل کا موازنہ کرنا ضرور تھا ۔ ظہوری کا دیوان جو ہمارے پاس موجود ہے اُس میں یا تو کاتبوں کی تصحیف سے اور یا خود ظہوری کی پیچیدہ بیانی کے سبب ، اکثر اشعار کے معنی سمجھ میں نہیں آتے ۔ بہت مشکل سے صرف ایک غزل ایسی نکلی ہے جس کے ہر ایک شعر کے ساتھ کچھ نہ کچھ معنی اپنی سمجھ کے موافق لگا لیے گئے ہیں اور اس کے تمام اشعار کا مقابلہ بعض اصحاب کی معرفت دوسرے صحیح نسخے سے بھی کر لیا گیا ہے ، اس لیے وہی موازنے کے لیے انتخاب کی گئی ہے اور چونکہ وہ شیخ کی غزل پر لکھی گئی ہے اس واسطے یہ خیال کیا گیا ہے کہ ظہوری نے اُس پر اپنی پوری طاقت صرف کی ہوگی ۔ ایک اور وجہ اس غزل کی تخصیص کی یہ ہے کہ مرزا نے اپنی تمام غزل میں ایک شعر کے سوا تمام اشعار میں وہی قافیے باندھے ہیں جو ظہوری کے ہاں بندھے ہوئے تھے اور نیز دونوں غزلیں ابیات کی تعداد کے لحاظ سے بھی برابر ، یعنی دس دس بیت کی ہیں ۔

ظہوری

بعشق قابل دیوانگی خرد مند ست
ببر ز جملہ کہ آزاد ، مرد ایں بند ست

غالب

چو صبح من ز سیاہی بشام مانند ست
چگوئیم کہ ز شب چند رفت یا چند ست

ظہوری کہتا ہے کہ عشق میں جو شخص دیوانگی کی قابلیت رکھتا ہے اسی کو خردمند سمجھنا چاہئے - پس چاہئے تو سب سے قطع تعلق کر دے ، کیوں کہ جو شخص تعلقات سے آزاد ہے وہی بند عشق کا مرد (یعنی اس کے لائق) ہے -

مرزا کہتے ہیں کہ جب کہ میری صبح تاریکی کے سبب شام سے مشابہ ہے تو مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ رات کتنی گزری یا کتنی باقی ہے؟ مطلب یہ ہے کہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک میرے دن اور رات پر تاریکی ہی تاریکی چھائی رہتی ہے - پس مجھے کیا خبر ہے کہ کتنی رات گزری اور کتنی باقی ہے - ظہوری کے شعر میں اس کے سوا کچھ جدت نہیں ہے کہ اس نے اپنی عادت کے موافق اس میں بھی صنعت تضاد کا التزام کیا ہے (یعنی دیوانگی پر خرد مندی کا اطلاق ہے اور آزاد پر مقید کا) مرزا نے ایک معمولی خیال میں جدت پیدا کی ہے اور نہایت صفائی سے مطلب ادا کیا ہے -

ظہوری

به شکر دیدهٔ تر، تر زبانئی دارم
کـه زهر گریه طراوت ده شکر خند ست

غالب

نگاه مهر به دل سر نداده چشمهٔ نوش
هـنـوز عـیـشں بـانـدازهٔ شـکـر خند ست

ظہوری کہتا ھے کہ میں ''دیدهٔ تر'' کے شکر میں تر زبان اور رطب اللسان ہوں، کیوں کہ گریہ کا زہر معشوق کے شکر خند کو طراوت دیتا ھے (یعنی ہمارے رونے پر اس کو بے اختیار ہنسی آتی ھے) گویا ہمارے آنسو خندۂ معشوق کی جڑ کو تر و تازہ رکھتے ھیں - مرزا کے شعر کا مطلب یہ ھے کہ معشوق بظاہر گو ہم سے ہنسی خوشی کے ساتھ ملتا ھے، مگر کوئی دلی محبت کی بات اب تک ظہور میں نہیں آئی جس سے ہمارا دل باغ باغ ہو جائے - اس مطلب کو اس طرح ادا کیا ھے کہ ابھی تک اس کی نگاہ مہر و محبت نے لذت و حلاوت کی سوت ہمارے دل میں جاری نہیں کی، بلکہ ہم صرف اس کے ظاہری شکر خند پر فریفتہ ہو رہے ھیں -

ظہوری کے ہاں وہی لفظی مناسبتیں جیسے 'دیدۂ تر' اور 'تر زبانی' یا 'زہرگریہ' اور 'شکر خند' بہ نسبت مرزا کے زیادہ ھیں، مگر مرزا کا شعر اس سے زیادہ بلیغ، نیچرل اور عاشقانہ ھے -

ظہوری

مگر کہ رخصت بے طاقتی شود مرهم
که گوش دل شدگاں ریش گشتهٔ پندست

غالب

نہ گفتۂ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر
برو کہ بادۂ ما تلخ تر ازیں پندست

ظہوری کہتا ہے کہ 'دل شدگان' (یعنی ہم عاشقوں) کے کان ناصح کی نصیحتوں سے زخمی ہوگئے ہیں ؛ اُن کے اس زخم کا مرہم یہی ہو سکتا ہے کہ اُن کو بے طاقتی (یعنی بے حوصلگی اور عدم تحمل) کی اجازت دی جائے تاکہ وہ ناصح سے گلخپ ہو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں ۔

مرزا ناصح سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے ناصح !، تو نے یہی نہیں کہا کہ تلخی (یعنی ہماری نصیحت) سے موافقت کر لے اور ہمارا کہنا مان لے ؟ جا اپنا رستہ لے ہماری شراب اس نصیحت سے زیادہ تلخ ہے ، پس ہم کو تیری نصیحت کی تلخی سے آشتی کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ یہ قافیہ بھی جیسا کہ ظاہر ہے ، مرزا کے ہاں بہ نسبت ظہوری کے زیادہ گرم بندھا ہے ۔

ظہوری

چہ غم کہ عہد گسل داردت کشاکش ناز
کہ ہر گسیختنی صد ہزار پیوندست

غالب

دراز دستئی من چاکی از فگند ، چہ عیب ؟
ز پیش ، دلق ورع با ہزار پیوندست

ظہوری کہتا ہے کہ اگر ناز و غمزے کی کشاکش تجھ سے عہد شکنی کراتی رہتی ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں ،

کیوں کہ ہر گسیختنی (یعنی ہر عہد شکنی) لاکھ پیوند کا حکم رکھتی ہے ۔ مطلب یہ کہ جس قدر تو عہد توڑتا ہے اسی قدر پیوند عشق زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے ۔

مرزا کہتے ہیں کہ اگر میری دراز دستی اور بے باکی و رند مشربی نے دلق ورع و تقویٰ کو کسی قدر پھاڑ ڈالا ہے تو میرا چنداں قصور نہیں ہے ، کیوں کہ اس میں تو پہلے ہی سے ہزاروں پیوند لگے چلے آتے ہیں، یعنی خود اہل ورع و تقویٰ ہی اس کی دھجیاں اڑا چکے ہیں ، مگر ریاکاری سے پیوند لگا لگا کر اس کا عیب ڈھانکتے رہتے ہیں ۔ ظہوری کے شعر میں عشق و محبت کے ایک دقیق معاملے کی طرف اشارہ ہے جو عشاق پر ہمیشہ گزرتا ہے اور صنعت تضاد کا التزام بھی نہیں چھوڑا کہ گسیختن پر اس کے ضد حقیقی ، یعنی پیوند کا اطلاق کیا ہے ۔ باوجودے کہ ظہوری کے ہاں یہ قافیہ نہایت عمدگی سے بندھا تھا ، مرزا نے بھی اس قافیے کے باندھنے میں کچھ کم داد بلاغت نہیں دی ، یہاں تک کہ ظہوری کے شعر کو مشکل سے اس پر ترجیح دی جا سکتی ہے ۔

ظہوری

بگو حدیث وفا از تو باورست ، بگو
شوم فدائے دروغی کہ راست ماندست

غالب

ز بیم آں کہ مبادا بمیرم از شادی
نگوید ارچہ بمرگ من آرزو مند ست

مرزا نے مانند کا قافیہ مطلع کے سوا پھر کسی شعر میں نہیں باندھا اور ظہوری کے ہاں آرزومند کا قافیہ کہیں نہیں بندھا ،

اس لیے یہ دونوں مختلف القوافی بیتیں ایک جگہ لکھ دی گئی ہیں - معنی دونوں کے ظاہر ہیں - ظہوری کا شعر بہت صاف اور لطیف اور مرزا کے شعر سے زیادہ نیچرل ہے - مرزا نے مضمون میں جدت تو پیدا کی ہے، مگر یہ سن کر کہ معشوق ہمارے مرنے کا آرزو مند ہے، خوشی سے مر جانا واقع کے بالکل خلاف ہے -

ظہوری

ز اهل مهر و محبت نشان ندارم کس
به مهرخویش و به بےمهرئی تو سوگند ست

غالب

وجود او همه حسنست و هستیم همه عشق
به بخت دشمن و اقبال دوست سوگند ست

ظہوری کا شعر صاف ہے - اول دعویٰ کرتا ہے کہ مہرو محبت کا دنیا میں کہیں وجود نہیں اور اس دعوے پر اپنی محبت اور معشوق کی بے مہری کی قسم کھاتا ہے جس کی خوبی اور لطافت ظاہر ہے -

مرزا کا دعویٰ یہ ہے کہ معشوق کا وجود سراپا حسن و جمال ہے اور میری ہستی سراسر عشق و محبت ہے اور اس دعوے پر رقیب کے نصیب کی اور معشوق کے اقبال کی قسم کھاتا ہے جس میں ظہوری کی قسم سے زیادہ لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے - رقیب کے نصیب کی قسم اس لیے کھائی ہے کہ جو وجود سراپا حسن و جمال ہے وہ بالکل اسی کے حصے میں آگیا ہے اور معشوق کے اقبال کی قسم اس لیے کھائی ہے کہ مجھ جیسا شخص

اُس کے سودا میں عشق و محبت کا پتلا بن گیا ہے۔ اس کے سوا لفظی مناسبتیں جیسے حسن و عشق، وجود و ہستی، دشمن و دوست اور بخت و اقبال یا تمام شعر کا متناسب اجزا میں تقسیم ہونا، اس نے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔

ظہوری

ز رہروان تو منزل شمار را کہ شمرد
غم از کسے کہ نمیداند اندہش چند ست

غالب

شمار کج روی دوست در نظر دارم
دریں نورد ندانم کہ آسماں چند ست

ظہوری کہتا ہے کہ تیری راہ میں جو شخص منزلیں گنتا ہے اور یہ خیال رکھتا ہے کہ کتنا رستہ طے ہوا اور کتنا باقی ہے، اُس کو تیرے رہروؤں میں کون شمار کرتا ہے؟ پھر کہتا ہے کہ ''غم از کسے ست'' یعنی غم معشوق اُس شخص کا حصہ ہے جس کو اپنے غم کی کمی یا زیادتی کا مطلق شعور نہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ میرے خیال میں دوست کی کج روی کا تصور ایسا جما ہوا ہے کہ مجھے یہ خبر نہیں کہ اس نورد (یعنی کج روی) میں آسمان کی کس قدر شرکت ہے۔ مرزا کا بیان کسی قدر ظہوری کے بیان سے صاف ہے، مگر مضمون کے لحاظ سے دونوں شعروں میں کچھ لطافت یا خوبی معلوم نہیں ہوتی۔

ظہوری

شود گسستہ بایّام گرچہ زنجیر ست
اسیر آں کہ بتار نگاہ در بند ست

غالب

برنج از پئے راحت نگاہ داشتہ اند
زحکمت است کہ پائے شکستہ در بنداست

ظہوری کہتا ہے کہ ایک مدت کے بعد لوہے کی بیڑی بھی کٹ جاتی ہے اور قیدی رہا ہو جاتا ہے؛ پس درحقیقت قیدی وہی ہے جو تار نگاہ معشوق میں اُلجھا ہوا ہے؛ جس کواس قید سے کبھی رہائی نہیں۔

مرزا کہتے ہیں کہ یہاں تکلیف میں اس لیے رکھا جاتا ہے کہ راحت حاصل ہو اور اُس کی مثال یہ ہے کہ پا شکستہ آدمی کو چلنے پھرنے نہیں دیتے اور جب تک ہڈی جڑ نہ جائے مقید رکھتے ہیں۔ اس سے مطلب یہی ہوتا ہے کہ آخر کار اُس کو راحت حاصل ہو۔ ظہوری کے شعر میں کسی قدر جدت ہے، مگر شعر کی بندش سست اور ڈھیلی ہے۔ مرزا کے ہاں مضمون میں کچھ ایسی جدت نہیں ہے، مگر بیان نہایت چست اور ٹھیک ٹھاک ہے۔

ظہوری

ز بندگان نہ سزد آرزو، خدا نہ کند
ہمیں بس ست کہ ما بندہ او خداوند ست

غالب

اگر نہ بہر من، از بہر خود عزیزم دار
کہ بندہ، خوبیٔ او خوبیٔ خداوند ست

ظہوری کے شعر میں ''خدانکند'' یا تو محض حشو ہے ، اور یا اس کے بعد کچھ عبارت مقدر ہے یعنی ''خدا نکند که ما آرزو بکنیم'' باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں -

مرزا کا شعر ان کی غزل میں بیت الغزل ہے اور معناً اور لفظاً دونوں طرح سے ظہوری کے شعر پر ترجیح رکھتا ہے -

ظہوری

اسیر عشق ظہوری نشانهٔ دارد
نشانه ایں که به بیداد دوست خرسند ست

غالب

نه آن بود که وفا خواهد از جہاں غالب
بدیں که پرسد و گویند هست، خرسند ست

ظہوری کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اسیر عشق کی یہ پہچان ہے کہ وہ دوست کے ظلم سے خوش رہتا ہے - مرزا کے شعر کا یہ مطلب ہے کہ میرا مقصود وفا کی تلاش سے یہ نہیں ہے کہ میں اہل دنیا سے وفا کا طالب ہوں ، بلکہ میں اسی میں خوش ہوں کہ میں پوچھوں کہ دنیا میں وفا ہے ، اور لوگ اس کے جواب میں کہیں کہ ہاں ہے - دونوں مقطع ہموار ہیں ، مگر باوجود اس کے مرزا کا بیان بانکپن سے خالی نہیں -

ہم نے دونوں شاعروں کی غزلوں کی شرح بخوبی کر دی ہے ، مگر زیادہ نکتہ چینی کرنا غیر ضروری سمجھا ہے اور دونوں غزلوں میں محاکمہ کرنا بھی ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے - وہ خود ، بشرطیکہ فارسی شعر کا صحیح

مذاق رکھتے ہوں گے ، اس بات کا اندازہ کر لیں گے کہ دونوں غزلوں میں کیا نسبت ہے -

رباعیات

مرزا کی رباعیاں تعداد میں قریب سوا سو کے ہیں جن میں سے اکثر شوخی و بے باکی ، بادہ خواری ، فخر و مباہات اور شکایت و زارنالی کے مضامین پر مشتمل ہیں اور کسی قدر متصوفانہ اور چند خاص خاص مضامین پر ہیں - خمریات میں ظاہرا عمر خیام کا تتبع معلوم ہوتا ہے - مرزا کی رباعی میں بہ نسبت عام غزلیات کے زیادہ صفائی و شگفتگی اور گرمی پائی جاتی ہے ؛ چنانچہ اُن میں سے کسی قدر رباعیاں بطور نمونے کے یہاں نقل کی جاتی ہیں اور جہاں ضرورت ہوگی رباعی کے ساتھ اُس کی شرح بھی کر دی جائے گی -

فخریہ

۱ غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم
زاں رو بصفائی دم تیغ ست دمم
چوں رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر
شد تیر شکستہ نیاگاں قلمم

''گہر و گوہر'' اصل ، ''دودہ'' نسل و خاندان ، ''زادشم'' پشنگ کے باپ اور تورا بن فریدوں کے بیٹے کا نام ہے جس کی نسل میں مرزا اپنے تئیں بتاتے ہیں - ''دم تیغ'' تلوار کی دھار ، ''دمم'' یعنی میرا کلام ، ''سپہبدی'' سلطنت و سپہ سالاری ، ''نیا'' دادا ، نیاگاں جمع - کہتا ہے کہ جب سپہبدی ہماری قوم سے رخصت ہوگئی تو میں نے شعر

کہنا اختیار کر لیا ؛ گویا بزرگوں کا ٹوٹا ہوا تیر میرا قلم بن گیا ۔

تفضیل

۲ شرطست کہ بہر ضبط آداب و رسوم
خیزد بعد از نبی امام معصوم
ز اجماع چہ گوئی بہ علی باز گرائے
مہ جائے نشین مہر باشد ، نہ نجوم

یہ رباعی مرزا کے تفضیلی ہونے پر دلالت کرتی ہے نہ تشیع پر، کیوں کہ خلفائے ثلاثہ پر نجوم کا اطلاق حضرات شیعہ نہیں کر سکتے ۔

تصوف

۳ راہیست ز عبد تا حضور اللہ
خواہی تو دراز گیر و خواہی کوتاہ
ایں کوثر و طوبیٰ کہ نشان ہا دارد
سر چشمہ و سایہ ایست در نیمۂ راہ

کہتا ہے کہ بندے سے خدا کی حضور تک ایک راہ ہے؛ خواہ اس کو دراز سمجھو خواہ کوتاہ سمجھو ، اور یہ جو کوثر و طوبیٰ ہیں جن میں اس کی راہ کے کچھ کچھ نشان پائے جاتے ہیں ، یہ ایسے ہیں جیسے اثناء راہ میں چشمہ اور سایہ آ جاتا ہے ۔

شوخی

۴ آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود
از غصہ فراغتش ہمانا نبود

دارد بجہاں خانہ و زن نیست درو
نازم بخدا چرا توانا نبود

تیسرے مصرعے میں ''دارد'' کا فاعل خدا ہے جس کا نام چوتھے مصرعے میں لیا ہے۔ ''خانہ'' سے مراد خانۂ کعبہ ہے، باقی شعر کے معنی ظاہر ہیں۔

شوخی

۵ باد ست غم، آں باد کہ حاصل ببرد
آب رخ ہوشمند و غافل ببرد
بگزاشتہ ام خمے ز صہبا بہ پسر
کش آندہ مرگ پدر از دل ببرد

کہتا ہے کہ غم ایک ہوا ہے، ایسی ہوا کہ تمام خرمن کو اڑا لے جائے اور دانا اور نادان کی آبرو کو بہا لے جائے، اسی لیے میں بیٹے کے لیے ایک شراب کا مٹکا چھوڑ چلا ہوں، تاکہ باپ کے مرنے کا غم اس کے دل سے دھووے۔

شوخی

٦ اے آں کہ براہ کعبہ روئے داری
نازم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زیں گونہ کہ تند می خرامی، دانم
در خانہ زن ستیزہ خوئے داری

کعبے جانے والے سے کہتا ہے کہ تیرا ارادہ تو بہت عمدہ ہے، مگر تو جو ایسا بھاگا جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ تیرے گھر میں بد مزاج عورت ہے جس کے سبب سے کعبے جانے میں اس قدر جلدی ہے۔

فخریہ

۷ شاھا ھر چند وابہ جو آمدہ ام
دانی کہ چہ مایہ نغزگو آمدہ ام
رنگم کہ بہار را بہ رو آمدہ ام
آبم کہ محیط را بجو آمدہ

بے تعلقی

۸ زاں جا کہ دلم بہ وھم در بند نبود
با ھیچ علاقہ سخت پیوند نبود
مقصود من از کعبۂ و آھنگ سفر
جز ترک دیار زن و فرزند نبود

یعنی چونکہ میں وھم میں جو نیست کو ھست کی صورت میں دکھاتا ھے ، گرفتار نہ تھا ، اسی لیے کعبے کے عزم سفر سے میرا مقصد زن و فرزند کا ملک چھوڑ دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا ۔

عاشقانہ

۹ اے جام شراب شاد کامی زدۂ
در جور دم از بلند نامی زدۂ
یاد آر ز من چو بینی اندر راھے
تنہا رو خستہ حرامی زدۂ

''حرامی'' قزاق ''حرامی زدہ'' قزاقوں کا لوٹا ھوا ۔ اس شعر میں معشوق کی طرف خطاب کیا ھے اور اپنی حالت کو اس مسافر کے مشابہ بتایا ھے جو تنہا ھو ، مجروح ھو اور قزاقوں نے اسے لوٹ لیا ھو ۔

شوخی

۱۰ اے آں کہ ترا سعی بدرمان من ست
منعم مکن از بادہ کہ نقصان من ست
حیف ست کہ بعد من بمیراث رود
ایں یک دوسہ خم در شبستان من ست

طبیب کی طرف خطاب ہے کہ مجھے بیماری میں شراب سے کیوں منع کرتا ہے۔ اگر میں مر گیا تو غضب ہو جائے گا کہ یہ اکٹھے دو تین مٹکے میرے کام تو نہ آئیں گے، میرے وارثوں کو پہنچ جائیں گے۔

شکوہ روزگار

۱۱ آنم کہ بہ پیمانۂ من ساقیٔ دھر
ریزد ہمہ دُرد درد و تلخ آبۂ زھر
بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا
ناھید بہ غمزہ کشت و مریخ بقہر

"ناھید" یعنی زھرہ کو سعد اور مریخ کو نحس قرار دیا گیا ہے۔ کہتا ہے کہ سعادت و نحوست کے خیال کو جانے دو، میرے حق میں تو سعد و نحس دونوں قسم کے ستارے نحس ہو گئے کہ زھرہ نے مجھے غمزے سے قتل کیا اور مریخ نے قہر سے۔

•

افسوس بر وفات مومن خاں

۲۰ شرطست کہ روی دل خراشم ہمہ عمر
خونابہ بہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر

کافر باشم اگر بہ برگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم همه عمر

ترک مراد

۱۳ غالب روش مردم آزاد جداست
رفتار اسیران رہ و زاد جداست

ما ترک مراد را ارم می دانیم
واں باغچه ضبطی شداد جداست

یعنی آزاد لوگوں کی اور روش ہے اور جو لوگ توشہ اور رسم و راہ کے گرفتار ہیں اُن کا اور ڈھنگ ہے۔ ہم کہ آزاد لوگ ہیں ہمارے نزدیک ترک مراد کا نام ارم ہے اور وہ ارم جس سے شداد محروم رکھا گیا وہ ہمارے ارم سے الگ ہے۔

شکر و رود نامه

۱۴ ایں نامه که راحت دل ریش آورد
سرمایۂ آبروئے درویش آورد

در هر بُن مو دمید جانے ، یعنی
سامان نثار خویش باخویش آورد

تصوف

۱۵ منصور! غمش ز نکته چیناں چه بود
در راست خطر ز هم نشیناں چه بود
چوں عاقبت یگانه بیناں دارست
دریاب که انجام دو بیناں چه بود

کہتا ہے کہ اگر منصور کو لوگ کہیں کہ سولی پر چڑھایا گیا اور ذلت سے مارا گیا تو منصور کو اس کی کچھ پروا نہیں، مگر تم دیکھو کہ جب منصور جیسے یگانہ بیں لوگوں کا انجام دار ہے تو دو بینوں کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

شوخی

۱۶ هر کس ز حقیقت خبرے داشته است
بر خاک ره عجز سرے داشته است
زاهد ز خدا ارم بدعوی طلبد
شداد همانا پسرے داشته است

کہتا ہے کہ جو شخص اپنی یا انسان کی حقیقت سے واقف ہوتا ہے اُس کو عاجزی کرنے کے سوا کچھ بن نہیں آتی۔ پس زاہد جو خدا سے ارم دعویٰ کے ساتھ طلب کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ شداد نے بیٹا اپنا وارث چھوڑا تھا، کیونکہ اول تو ارم جو کہ متروکۂ شداد ہے، اُس کا دعویٰ کرنا اور پھر خدا کے سامنے اُس کے مانگنے میں ہیکڑی کرنی، یہ دونوں باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ شداد نے اپنا وارث حقیقی چھوڑا تھا۔

شوخی

۱۷ غالب به سخن گرچه کست همسر نیست
از نشۂ هوش هیچت اندر سر نیست
می خواهی و مفت و نغز آنگه بسیار!!!
ایں باده فروش ساقی کوثر نیست

کہتا ہے کہ غالب اگرچہ شاعری میں کوئی تیرا ہم سر نہیں، گو عقل کا نشہ تیرے دماغ میں بالکل نہیں ہے۔ شراب چاہتا

ہے ، وہ بھی مفت اور وہ بھی عمدہ اور پھر کثرت سے !!!
یہ بادہ فروش ہے، ساقئ کوثر نہیں کہ تیری سب خواہشیں
پوری کر دے گا۔

شوخی

۱۸ گردیدن زاہداں بجنت گستاخ
ویں دست درازی بہ ثمر شاخ بشاخ
چوں نیک نظر کنی ز روئے تشبیہ
ماند بہ بہائم و علف زار فراخ

یعنی زاہدوں کا بہشت میں بے باک پھرنا اور جا بجا ٹہنیوں پر پھلوں کے لیے ہاتھ مارنا ؛ اگر غور کر کے دیکھو تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک وسیع چراگاہ ہے اور اس میں ڈھور ڈنگر چرتے پھرتے ہیں۔

اخلاق

۱۹ آں را کہ بود درستئے در فرجام
ہم محرم خاص آید و ہم مرجع عام
آساں نبود کشاکش پاس قبول
زنہار نہ گردی بہ نکوئی بد نام

''فرجام'' انجام، اور رنگ و رونق کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں رنگ و رونق، یعنی شہرت و ناموری مراد ہے۔ کہتا ہے کہ جس کی شہرت صحیح اور سچی ہوتی ہے وہ ضرور ہے کہ خواص کا محرم اور عوام کا مرجع واقع ہو، مگر پاس کی کشاکش، یعنی ہر موقع پر اس بات کا خیال رکھنا کہ قبولیت میں فرق نہ آئے ، نہایت سخت چیز ہے۔ پس ہرگز نیکی کے ساتھ بد نام ، یعنی مشہور ہونا نہیں چاہئے۔ اس موقع پر

بجائے مشہور کے 'بدنام' کا لفظ نہایت بلیغ واقع ہوا ہے جس سے ساری رباعی میں جان پڑ گئی ہے ۔

شوخی

۲۰ در عالم بے زری کہ تلخ ست حیات
طاعت نتواں کرد بامید نجات
اے کاش ز حق اشارت صوم و صلواۃ
بودے بوجود مال چوں حج و زکواۃ

کہتا ہے کہ بے مقدوری کی حالت میں جب کہ زندگی تلخ ہوتی ہے نجات کی امید پر طاعت نہیں ہو سکتی ۔ کاش ایسا ہوتا کہ جس طرح حج اور زکواۃ میں استطاعت اور تمول شرط ہے ، روزہ اور نماز میں بھی یہی شرط ہوتی ۔

شکایت ابنائے زماں

۲۱ ہر چند زمانہ مجمع جہال ست
در جہل نہ حال شاں بیک منوال ست
کودن ہمہ ، لیک از یکے تا دگرے
فرق خر عیسیٰ و خر دجال ست

کہتا ہے کہ اگرچہ زمانے میں جھڑاں جاہل بھرے ہوئے ہیں، مگر جہل میں اُن کا حال متفاوت و مختلف ہے ۔ کودن تو سب ہیں، مگر ایک دوسرے میں ایسا فرق ہے جیسا خر عیسیٰ اور خر دجال میں ۔

میکش و جوہر

۲۲ تا مے کش و جوہر دو سخن‌ور داریم
شان دگر و شوکت دیگر داریم

در میکده پیریم کہ میکش از ما ست
در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

یہ رباعی منشی جواہر سنگھ جوہر اور میر احمد حسین میکش کے حق میں کہ دونوں مرزا کے عزیز شاگردوں میں سے تھے، لکھی ہے۔ ''در میکدہ پیریم'' یعنی پیر مغانیم۔ باقی رباعی کے معنی ظاہر ہیں۔

فخریہ

۲۳ دستم بہ کلید مخزنے می بایست
ور بود تہی بدامنے می بایست
با ہیچ گہم بہ کس نیفتادے کار
یا خود بزمانہ چوں منے می بایست

کہتا ہے کہ یا تو میرے ہاتھ میں کسی خزانے کی کنجی چاہئے تھی، اور اگر ہاتھ خالی ملا تھا تو اس میں کسی کا دامن ہونا چاہئے تھا جس کے توسل سے زندگی بسر ہوتی، یا مجھ کو کبھی کسی سے کام نہ پڑتا اور یا زمانے میں خود مجھ جیسا صاحب کمال ہوتا جو میری قدر کرتا۔

امید عفو

۲۴ ہستم ز مے امید سر مست و بس ست
دارم سر ایں کلاوہ در دست و بس ست
گر ارزش لطف و کرمے نیست مباش!
استحقاق ترحمے ہست و بس ست

''سر ایں کلاوہ'' یعنی سر ایں رشتہ، باقی معنی ظاہر ہیں۔

خطاب به اغنیا

۲۵ گر گرد ز گنج گہرے بر خیزد
مپسند کہ دود از جگرے بر خیزد
منت نتواں نہاد برگدیہ گراں
بنشیں کہ بخدمت دگرے برخیزد

گنج گہر سے گرد اٹھنے کے معنی اس کے خالی ہو جانے کے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ اگر جواہرات کا خزانہ خالی ہو جائے تو بلا سے ، مگر یہ گوارا مت کر کہ کسی کے جگر سے دھواں اٹھے ۔ بھیک مانگنے والوں پر احسان نہیں رکھا جا سکتا ۔ خدا نے ان کی خدمت پر تجھ کو کھڑا کیا ہے؛ اگر تجھ سے یہ خدمت پوری نہیں ہو سکتی تو بیٹھ جا، تا کہ دوسرا اس خدمت کے لیے اٹھے ۔

عاشقانہ

۲۶ اے دوست بسوئے ایں فرو ماندہ بیا
از کوچہ غیر راہ گرداندہ بیا
گفتی کہ مرا مخواں کہ من مرگ تو ام
بر گفتۂ خویش باش و نا خواندہ بیا

اوپر کے دونوں مصرعے صاف ہیں ؛ اس کے بعد کہتا ہے کہ اے دوست تو نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے مت بلانا میں تیری موت ہوں ۔ اچھا اب تو اپنے کہنے پر قائم رہ اور جس طرح کہ موت بن بلائے آتی ہے تو بھی بن بلائے چلا آ ۔

مدحیه

اے آں کہ هما اسیر دامت باشد
صاف مے خسروی بجامت باشد
۲۷ تسبیح بهر اسم الٰہی کہ بود
آغاز ز ابتدائے نامت باشد

یہ رباعی سبحان علی خاں مرحوم کو جو مرزا نے خط لکھا تھا ، اُس کے اول میں لکھی تھی - معنی ظاهر هیں -

امید بے جا

۲۸ بازی خور روزگار بودم همه عمر
از بخت امیدوار بودم همه عمر
بے مایه بفکر سود ماندم همه جا
بے وعده در انتظار بودم همه عمر

خطاب به اغنیا

۲۹ باید که دلت ز غصه برهم نشود
از رفتن زر دست خوش غم نشود
ایں سیم و زرست خواجه! ایں سیم و زرست
غم نیست که هر چند خوری کم نشود

''دست خوش'' مغلوب و زیر دست - کہتا ہے کہ اے دولت مند ! چاهئے کہ روپے کے کم هو جانے سے تیرا دل پریشان اور غم میں دبا هوا نہ رهے - اے حضرت یہ سیم و زر ہے اور پھر کہتا هوں کہ سیم و زر ہے؛ یہ غم نہیں ہے کہ جس قدر کھائے جائیے کم نہیں هوتا -

گرانی گوش

۳۰ دارم دل شاد و دیده بینائے
وز کری گوشم نبود پروائے
خوب ست که نشنوم زهر خود رائے
گلبانگ انا ربکم الا علائے

کہتا ہے کہ مجھ کو کری گوش، یعنی ثقل سماعت کی کچھ پروا نہیں، بلکہ اس کو بہتر سمجھتا ہوں، کیوں کہ مغرور اور خود پسندوں کی زبان سے 'وانا ربکم الاعلیٰ' (جو کہ فرعون کا مقولہ ہے) نہیں سنتا ۔

توحید وجودی

۳۱ اے کردہ بآرائش گفتار بسیچ
در زلف سخن کشودہ راہ خم و پیچ
عالم که تو چیز دیگرش می دانی
ذاتے ست بسیط منبسط دیگر ہیچ

"بسیچ" قصد، زلف سخن میں خم و پیچ کی راہ کھولنے سے مراد بیان میں پیچیدگی پیدا کرنی ۔ کہتا ہے کہ عالم جس کو تو نے کچھ اور چیز سمجھ رکھا ہے، وہ صرف ذات واحد ہے جو بسیط ہے، یعنی مرکب نہیں اور منبسط ہے، یعنی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ہے، بس اس کے سوا کچھ نہیں ۔

شکایت

۳۲ اے تیرہ زمیں کہ بودہ بستر من
ہر خاک کہ باتست ہمہ بر سر من
زر بہر کساں و بہر من دانۂ و دام
اے مادر دیگراں و مادندر من

''مادندر'' سوتیلی ماں کو کہتے ہیں - زمین سے خطاب کرتا ہے کہ اوروں کے لیے تو تجھ پر سونا بچھا ہوا ہے اور میرے لیے دانہ و دام کے سوا کچھ نہیں؛ گویا تو اوروں کی ماں ہے اور میری میندر ہے - یہ مضمون تھوڑے تھوڑے فرق سے رودکی اور فرخی نے بھی باندھا ہے، مگر مرزا کے ہاں سب سے عمدہ طور سے بندھا ہے - رودکی کہتا ہے :

جہانا چہ بینی تو از بچگاں
کہ مادر گہے گہ مادندری

اور فرخی کہتا ہے :

مہر فرزندی بر خواجہ فگندہ ست جہاں
این جہاں مادر او نیست کہ مادندر اوست

رسوائی

۳۳ آں را کہ ز دست بے زری پا مال است
رسوائی نیز لازم احوال ست
ما خشک لبیم و خرقہ آلودہ بہ مے
ساقی مگرش پیالہ از غربال ست

کہتا ہے کہ مفلس آدمی کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ

رسوا اور بدنام ہو؛ چنانچہ ہم کو دیکھو کہ ہمارے ہونٹ تو خشک ہیں اور کپڑے شراب میں آلودہ ہیں،گویا ساقی کا جام چھلنی کا بنا ہوا ہے کہ منہ تک آتے آتے ساری شراب کپڑوں پر ٹپک جاتی ہے ۔ قاعدہ ہے کہ مفلس آدمی جو شراب پینے لگتا ہے ، وہ بہت جلد بدنام اور رسوا ہو جاتا ہے، کیوں کہ کبھی کلال کی دکان پر جا کر ہاتھ پسارتا ہے اور جو تھوڑی بہت مل جاتی ہے تو بدمست ہو کر اُس کی دکان ہی پر یا راہ میں گر پڑتا ہے اور آنے جانے والے سب اُس کو دیکھتے ہیں ۔ کبھی کلال کے دام چڑھ جاتے ہیں تو اُس سے بازار میں تکرار ہوتی ہے اور سب لوگ دیکھتے ہیں ، حالانکہ کبھی اُس کو اطمینان سے سیر ہو کر شراب پینی میسر نہیں ہوتی ۔ اس حالت کو اس تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ گویا ساقی تقدیر ہم کو چھلنی کے پیالے میں شراب دیتا ہے کہ ہونٹ تک تو تر نہیں ہوئے اور کپڑے سارے شرابور ہو جاتے ہیں۔ ایسی بلیغ تمثیلیں بہت کم دیکھی گئی ہیں ۔

علت غائی جہنم

۳۴ اے دادہ بباد عمر در لہو و فسوس
زنہار مشو ز رحمت حق مایوس
ہشدار! کز آتش جہنم حق را
تہذیب غرض بود نہ تعذیب نفوس

''فسوس'' ہزل و استہزا ۔ کہتا ہے کہ جہنم میں ڈالنے سے بندوں کو تکلیف دینی مقصود نہیں ہے ، بلکہ (جس طرح سونے کو آگ میں تپانے سے اُس کی کھوٹ نکالنی منظور

ہوتی ہے اسی طرح) آتش جہنم سے نفوس انسانی کو مہذب کرنا مقصود ہے۔

شوخی

۳۵ یا رب تو کجائی کہ بہ ما زر ندھی
بے درد خدائی کہ بہ ما زر ندھی
نے نے! تو نہ غائبی و نے بے رحمی
بے مایہ چو مائی کہ بما زر ندھی

اس رباعی میں مرزا کی شوخی و گستاخی حد سے زیادہ گزر گئی ہے۔ دارالافتا میں تو یقیناً اس پر کفر کا فتویٰ دیا جائے گا، لیکن ہمارے نزدیک ایسے کلام سے بجائے کفر کے زیادہ تر قائل کے ایمان اور یقین پر استدلال ہوتا ہے۔ صاف پایا جاتا ہے کہ سائل معاش کی تنگی و فراخی و خوش حالی و بد حالی کو محض خدا کی طرف سے جانتا ہے اور تدبیر و عقل و دانش کو اس میں بالکل عاجز و درماندہ سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب معاش سے بہت تنگ ہوتا ہے تو یہ نہیں خیال کرتا کہ ہم نے تدبیر نہیں کی یا تدبیر مین مجھ سے غلطی ہو گئی یا ہماری کاہلی و سستی سے یہ تنگ دستی ہم کو نصیب ہوئی، بلکہ نہایت تعجب کے ساتھ خدا کی جناب میں عرض کرتا ہے کہ کیا تیرا خزانہ خالی ہو گیا ہے جو ہم کو کچھ نہیں ملتا؟ ہاں اس قسم کے خطابات آداب شریعت کے بالکل خلاف ہیں اور ایسے ہی خطابات کی نسبت کہا گیا ہے:

ما بروں را ننگریم و قال را
ما دروں را بنگریم و حال را

قصائد

مرزا کے قصائد جن میں قطعات ، نوحے، ترکیب بند، مخمس وغیرہ بھی شامل ھیں، کیا باعتبار کمیت اور کیا بلحاظ کیفیت کے اُن کے اصناف نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنف ھے۔ اگرچہ مرزا کی غزل کا ایک معتدبہ حصہ متاخرین کے طبقے میں کسی بڑے سے بڑے نامور اور مسلم‌الثبوت اُستاد کی غزل سے گرا ھوا نہیں ھے، بلکہ اکثر کی غزل پر ھر ایک لحاظ سے فوقیت رکھتا ھے، مگر اسی کے ساتھ غزلیات کا ایک دوسرا حصہ ایسا بھی ھے جس میں تغزل کی شان، یعنی عام فہم اور خاص پسند ھونا بہت کم پایا جاتا ھے۔ بخلاف قصیدے کے کہ اُس میں قصیدے کی شان جیسی کہ ھونی چاھئے اول سے آخر تک یکساں طور پر جلوہ گر ھے۔

قصائد میں مرزا نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ھے کہیں سلمان و ظہیر کا اور کہیں عرفی و نظیری کا اور ھر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی ھے۔ مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شان دار اور عالی رتبہ ھوتی ھے اور اسی سے قصیدے کی پستی و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ھے۔ مشرقی شاعری میں عموماً اور ایران کی شاعری میں خصوصاً کوئی مضمون مدح و ستائش سے زیادہ پھیکا، سیٹھا، ٹھنڈا اور بے لطف نہیں ھوتا؛ علی‌الخصوص متاخرین نے مبالغے کی لے کو بڑھاتے بڑھاتے مدح کو ھجو کے درجے تک پہنچا دیا ھے اور اس کلیے سے مرزا کی مدح بھی مستثنیٰ نہیں؛ البتہ عرفی نے مدحیہ مبالغوں میں ایک قسم کا بانکپن پیدا کیا ھے جو اُسی کے ساتھ مخصوص ھے۔ جس طرح قدما کے قصائد میں وہ

آن نہیں پائی جاتی اسی طرح مرزا کے قصائد بھی اُس سے معرا ہیں ، لیکن مرزا کے اکثر قصیدوں کی تشبیبیں کچھ شک نہیں کہ عرفی کی تشبیبوں سے سبقت لے گئی ہیں ۔

چونکہ مرزا کے تمام قصائد اور اُن کے ملحقات کے انتخاب کی اس مختصر میں گنجائش نہیں ہے ، اس لیے ہم ایک آدھ پورا قصیدہ اور باقی صرف چند تشبیبیں اور ایک آدھ مدح اور کچھ قطعے اور نوحے بطور نمونے کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور اخیر میں مرزا کا ایک ترکیب بند نظیری کے ترکیب بند کے ساتھ اس غرض سے نقل کریں گے ، تاکہ اصحاب ذوق صحیح کو دونوں کے کلام میں موازنہ اور اس بات کا اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ مرزا نے اکبری طبقے کے چیدہ اور برگزیدہ شعرا کے تتبع کو کس حد اور کس درجے تک پہنچایا تھا ۔

توحید

انتخاب از قصیدہ توحید الٰہی

اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ

دیدہ بیروں و دروں از خویشتن پروانگہے
پردۂ رسم پرستش درمیاں انداختہ

نقش بر خاتم ز حرف بے صدا انگیختہ
شور در عالم ز حسن بے نشاں انداختہ

چرخ را در قالب ابداع دروا ریختہ
خاک را بر قطع پیدائی ستاں انداختہ

عاشقاں در موقف دار و رسن وا داشتہ

غازیاں در معرض تیغ و سناں انداختہ
رنگ ہا در طبع ارباب قیاس آمیختہ
نکتہ ہا در خاطر اہل بیاں انداختہ
با چنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی
مردہ را از خویش دریا بر کراں انداختہ

دوئی کو مردے سے اور وحدت کو دریا سے تشبیہ دی ہے، یعنی جس طرح دریا مردے کو باہر پھینک دیتا ہے، اسی طرح باوجود ہنگامۂ کثرت کے وحدت میں دوئی نہیں سما سکتی۔ بالکل نئی اور نہایت بلیغ تشبیہ دی ہے۔

نرد بانے بستہ با دیوار کاخے در نظر
انتعاشے در نہاد این و آں انداختہ
رفتہ ہر کس تا قدم گاہے وز آں جا خویش را
پایہ پایہ از فراز نردباں انداختہ
غم چو گیرد سخت نتواں شکوہ از دلدار کرد
بہر آسانی اساس آسماں انداختہ
گل چو ماند دیر گردد بر دلش بازار سرد
بہر تجدید طرب طرح خزاں انداختہ
آتشے از روئے گلہائے بہار افروختہ
شعلۂ در جان مرغ صبح خواں انداختہ
دجلۂ در ساغر معنی طرازاں ریختہ
رشحۂ در کاسۂ دریا و کاں انداختہ
جز بدیں آب آتش زردشت نتواں سرد کرد
کعبہ را جوئے بہشت از ناوداں انداختہ
جز بدیں الماس نتواں ایں چنیں در دانہ سفت
رخنہ از اسلام در کیش مغاں انداختہ

یعنی ''آتش زردشت'' ہر ایک پانی سے نہیں بجھ سکتی تھی ، اس لیے میزاب کعبہ سے بہشت کی نہر جاری کردی اور ''کیش مغاں'' ایک ایسا موتی تھا کہ اسلام جیسے الماس کے سوا اُس کا بیندھنا ، یعنی اُس میں رخنہ ڈالنا ناممکن تھا ۔

چشم را بخشیده چوناں گردشے کارباب ہوش
بر زمیں دانند طرح آسماں انداختہ
داده ابرو را بدانساں جنبشے کاهل قیاس
در تن شمشیر پندارند جاں انداختہ
اے ز شرم خاکساران تو ، از شہپر ، ہما
چوں گلیم کہنہ ظل را بر کراں انداختہ
ذوق تمکین گدایان تو ، گنج شاہ را
از دل گنجور و چشم پاسباں انداختہ
تا دریں صورت ز چشم دشمناں پنہاں بود
دوست را اندر طلسم امتحاں انداختہ
تا علاج خستگی آسائش دیگر دہد
خارہا در رہگزار مےہا انداختہ

مرثیہ و نوحہ

منقبت از قصیدہ سیدالشہداء

کفرست کفر درپے روزی شتافتن
ننگ ست ننگ در غم دنیا گریستن
گاہے بہ داغ شاہد و ساقی گداختن
گاہے بمرگ مامک و بابا گریستن
باید بدرد ہرزہ گرستن، وگر یا دگر گریست
بے جا گریستیم ، دریغا گریستن

رشک آیدم به ابر که در حد وسع اوست
بر خاک کربلائے معلیٰ گریستن
رفت آں چه رفت ، بایدم اکنوں نگاه داشت
از بہر نور دیدهٔ زهرا گریستن
باران رحمتے !!! که بانداز شست و شو
دارد به روسیاهی اعدا گریستن
خود را ندید زاں لب نوشیں بکام خویش
زیبد به شور بختی دریا گریستن
مزد شفاعت و صلهٔ صبر و خوں بہا
هیچ از کسے نخواسته الّا گریستن
چوں رزق غیب درد ترا عام کرده اند
سر می زند ز مومن و ترسا گریستن

نوحه

اے فلک شرم ! از ستم بر خاندان مصطفیٰ
داشتی زیں پیش سر بر آستان مصطفیٰ
اے به مهر و ماه نازاں هیچ می‌دانی چه رفت؟
از تو بر چشم و چراغ دودمان مصطفیٰ
سایه از سرو روان مصطفیٰ نفتد بخاک
هاں چه بر خاک افگنی سرو روان مصطفیٰ
گرمئی بازار امکاں خود طفیل مصطفیٰ است
بیں چه آتش می زنی اندر دکان مصطفیٰ
کینه خواهی بیں !! که با اولاد امجادش کنی
آنچه با مه کرده اعجاز بنان مصطفیٰ
نیک نبود کز تو بر فرزند دل بندش رود

آنچه رفت از مرتضیٰ بر دشمنان مصطفیٰ
یا تو دانی مصطفیٰ را فارغ از رنج حسین ؟
یا تو خواهی زیں مصیبت امتحان مصطفیٰ
یا مگر گاهے ندیدی مصطفیٰ را با حسین ؟
یا مگر هرگز نبودی در زمان مصطفیٰ
آں حسین ست اینکه گفتے مصطفیٰ ''روحی فداک''
چوں گزشتے نام پاکش بر زبان مصطفیٰ
آں حسین ست اینکه سودے مصطفیٰ چشمش به رخ
بوسه چوں باقی نماندے در دهان مصطفیٰ
قدسیاں را نطق من آورده غالب در سماع
گشته ام در نوحه خوانی مدح خوان مصطفیٰ

نوحه

اے کج اندیشه فلک حرمت دین بایستے
علم شاه نگوں شد نه چنیں بایستے
تا چه اُفتاد که بر نیزه سرش گردانند
عزت شاه شهیداں به ازیں بایستے
حیف باشد که فتد خسته ز توسن بر خاک
آنکه جولانگه او عرش بریں بایستے
حیف باشد که ز اعدا دم آبے طلبد
آنکه سائل بدرش روح امیں بایستے
تازیاں را به جگر گوشهٔ احمد چه نزاع
وطن اصلی ایں قوم ز چیں بایستے
ایّها القوم ! تنزل بود ار خود گویم
میهماں بے خطر از خنجر کیں بایستے

یعنی یہ تو ادنیٰ درجے کی بات ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ اے اہل شام! کربلا کا میہمان خنجر کیں سے محفوظ رہنا چاہئے تھا ، بلکہ جو سخن اس موقع پر کہنے کے لائق ہے وہ یہ ہے ، یعنی جیسا اگلے اشعار میں بیان ہوا ہے :

سخن اینست کہ در راہ حسین ابن علی
پویہ از روئی عقیدت بہ جبیں بایستے
چشم بد دور! بہنگام تماشاے رخش
رونما سلطنت روئی زمیں بایستے
داشت ناخواستہ در شکر قدومش دادن
اگرش ملک گر تاج و نگیں بایستے
چوں بفرمان خود آرائی و خود بینی و بغض
آں نہ کردید کہ از صدق و یقیں بایستے
باسیران ستم دیدہ پس از قتل حسین
دل نرم و منش مہر گزیں بایستے
چہ ستیزم بقضا، ورنہ بگویم غالب
علم شاہ نگوں شد نہ چنیں بایستے

نوحہ

وقت ست کہ در پیچ و خم نوحہ سرائی
سوزد نفس نوحہ گر از تلخ نوائی
وقت ست کہ آں پردگیاں کز رہ تعظیم
بر درگہ شان کردہ فلک ناصیہ سائی
از خیمۂ آتش زدہ عریاں بدر آیند
چوں شعلہ دخاں بر سر شاں کردہ روائی
جاں ہا ہمہ فرسودۂ تشویش اسیری
دل ہا ہمہ خوں گشتۂ اندوہ رہائی

اے چرخ چو آں شد دگر از بہر چہ گردی!
اے خاک چو ایں شد دگر آسودہ چرائی!
خوں گرد، فرو ریز! اگر صاحب مہری
برخیز بخوں غلط! گر از اہل وفائی
تنہاست حسین ابن علی در صف اعدا
اکبر تو کجا رفتی و عباس کجائی!
توقیع شفاعت کہ پیمبر ز خدا داشت
از خون حسین ابن علی یافت روائی
فریاد ازاں حامل منشور امامت!
فریاد ازاں نسخۂ اسرار خدائی!
فریاد ازاں زاری و خونابہ فشانی!
فریاد ازاں خواری و بے برگ و نوائی!
فریاد ز بے چارگی و خستہ درونی!
فریاد ز آوارگئی و بے سروپائی!
غالب جگرے خون کن و از دیدہ فرو بار
گر روے شناس غم شاہ شہدائی

نوحہ

سرو چمن سروری افتاد ز پا، ہائے!
شد غرقہ بخوں پیکر شاہ شہدا، ہائے!
برخاک رہ افتادہ تنے ہست، سرش کو
آں روئے فرو زندہ و آں زلف دوتا ہائے!
عباس دلاور کہ دراں راہ روی داشت
شمشیر بیک دست و بیک دست لوا، ہائے!
آں قاسم گلگوں کفن عرصۂ محشر
واں اکبر خونین تن میدان وغا، ہائے!

آں اصغر دل خستہ پیکان جگر دوز
واں عابد غم دیدۂ بے برگ و نوا ، ہائے !
اے قوت بازوے جگر گوشۂ زہرا!
دست تو بشمشیر شد از شانہ جدا ، ہائے!
اے شہرہ بدامادی و شادی کہ نداری
کافور و کفن ، بگزرم از عطر و قبا ، ہائے!
اے مظہر انوار کہ بود اہل نظر را
دیدار تو دیدار شہ ہر دوسرا ، ہائے!
اے گلبن نورستہ گلزار سیادت!
نا یافتہ در باغ جہان نشو و نما ، ہائے!
اے منبع آں ہشت کہ آرائش خلدند
داغم کہ رسن شد بہ گلوئے تو ردا، ہائے!
بالغ نظران روشن دین نبی ، حیف!
قدسی گہران حرم شیر خدا ، ہائے!
ماتم کدہ آں خیمۂ غارت زدگاں ، حیف!
غارت زدہ آں قافلۂ آل عبا ، ہائے!
آں تابش خورشید ، دراں گرم روی ، حیف!
واں طعنۂ کفار ، درآں شور عزا ، ہائے!
غالب بہ ملائک نتواں گشت ہم آواز
اندازۂ آں کو کہ شوم نوحہ سرا ، ہائے!

از قصیدہ ضریحیہ

بیا در کربلا تا آں ستم کش کارواں بینی
کہ در وے آدم آل عبا را ساربان بینی

نـه بینی هیچ بر سر خـازنان گنج عصمت را
مـگـر درخـار بـن ها تـار و پـود طیلسان بینی
همانـا سـیل آتـش بـرده بنگاه غـریبان را
کـه هر جـا پارهٔ از رخـت سوجـے از دخـان بینی
بـه بینی چشمهٔ از آب و چـون جـوئی کـنارش را
ز خـون تشنه کامـان چـشمهٔ دیـگـر روان بینی
بـه بینی سرخوش خواب عدم عباس غازی را
نـه مشکش در خـم بازو نـه تیرش در کمان بینی
هـجـوم خستگان و سوز و سـاز نـوگـرفتاران
نـو آئین بـزم طـوے قـاسم نـا شـادمـان بینی
نمـی بینی که چون جـان داد از بیداد بد خواهان
علی اکبر که همچون بخت بد خواهش جوان بینی
گـرفـتم کاین همه بینی، دلے داری و چشمے هـم
بخـون آغشته نـازکـ پـیکر اصغر چسـان بینی!
چـه دنـدان در جگر افسرده باشی کاندران وادی
حسـین ابـن عـلی را در شـهار کـشتگان بینی
نیاری گر دران کوشی که پایش در رکاب آری
نه بینی گر خود آن خواهی که دستش برعنان بینی
تنے راکش رگ گل خار بودے بر زمین یابی
سرے را کش ز افسر عار بودے بر سنان بینی

ستایش روزگار

تشبیب قصیده منقبت امام دوازدهم

هست از تمیز گـربـه هما استخوان دهـد
آئین دهر نیست کـه کس را زیـان دهد

مردست مرد ، هرچه کند بی خطر کند
رادست راد ، هرچه دهد رائگان دهد
گلزار را اگر نه ثمر ، گل بهم نهد
درویش را اگر نه سحر ، شام نان دهد
گنج سخن نهد به نهان خانهٔ ضمیر
وانگه کلید گنج بدست زبان دهد
تا روز خاک تیره نه گردد ز رشک چرخ
رخشانئی ستاره به ریگ روان دهد
تا آدمی ملال نگیرد زیک هوا
سرماؤ نو بهار و تموز و خزان دهد
هم در بهار گل شگفاند چمن چمن
تا راحت مشام و نشاط روان دهد
هم در تموز میوه فشاند طبق طبق
تا آرزوئے کام و مراد دهان دهد
آن را که بخت دسترس بذل مال نیست
طبع سخن رس و خرد خرده دان دهد
آن را که طالع کف گنجینه پاش نیست
نعم‌البدل ز خامهٔ پروین فشان دهد
دانم که آسمان به زمین پیش کار کیست
عکس چه جلوه روشنی روشنان دهد
چون جنبش سپهر به فرمان داور ست
بیداد نبود آنچه بما آسمان دهد
رنگ از گل ست و سایه ز نخل و نوا زمرغ
هرجا بهار ، هرچه بود در خور ، آن دهد
در نشر نفحه قرعه بنام هوا زند
در نشو سبزه حکم به آب روان دهد

مستیز با نسیم ، اگر بلبلے به باغ
جاں در نورد خار و خس آشیاں دهد
دارو ز بہر زندگی آمد ، نه بہر مرگ
جرم پزشک چیست اگر خسته جاں دهد
پرویز دیریاب شہے بود ، ورنه بخت
آواره را به‌راه ز شیریں نشاں دهد
فرهاد زود میر کسے بود ، ورنه دهر
کام دل غریب پس از امتحاں دهد
دارم ز روزگار نویدے که آں نوید
در پیریم بشارت بخت جواں دهد
از داور زمانه به اندیشهٔ درست
شادم که مزد بندگیم ناگہاں دهد
هر گه به سرنوشت سر آید شمار غم
راهم به بارگاه شه انس و جاں دهد
سلطان دین محمد مهدی که رائے او
منشور روشنی به شه خاوراں دهد

صفت سالکان طریقت

تشبیب قصیده مدح بهادر شاه مرحوم

رهرواں چوں گهر آبلهٔ پا بینند
پائے را پایه فرا تر ز ثریا بینند
هرچه در دیده عیانست نگاهش دارند
هرچه در سینه نہانست ز سیما بینند

راستی از رقم صفحۂ ہستی خوانند
نقش کج بر ورق صفحۂ عنقا بینند

یہ شعر گویا ماحصل ہے اس قول کا کہ ''لیس فی الامکان ابدع مما کان'' یعنی جو نظام عالم کہ اب موجود ہے اس سے بہتر نظام ناممکن تھا۔

دوربینان ازل! کوری چشم بد بیں
ہم دریں جا نگرند آنچہ در آنجا بینند
راز زیں دیدہ دراں جوئے کہ از دیدہ دری
نقطہ گر در نظر آرند سویدا بینند
راہ زیں گرم رواں پرس کہ در گرم روی
جادہ چوں نبض تپاں در رگ صحرا بینند
شررے را کہ بناگاہ بدر خواہد جست
زخمہ کردار بہ تار رگ خارا بینند
قطرہ را کہ ہر آئینہ گہر خواہد بست
صورت آبلہ بر چہرۂ دریا بینند
شام در کوکبۂ صبح، نمایاں نگرند
روز در منظر خفاش ہویدا بینند
وحشت تفرقہ در کاخ مصور سنجند
مجمع انس بہ نے بست زلیخا بینند

''کاخ مصور'' وہ محل جس کو زلیخا نے وصال یوسف کے لیے آراستہ کیا تھا اور جس میں تمام سامان عیش و کامرانی جمع تھا۔ ''نے بست'' وہ جھونپڑا جو یوسف کے قید ہو جانے پر اُن کی جدائی کے غم میں زلیخا نے اپنے لیے بنایا تھا اور اُس میں رہتی تھی۔ کہتا ہے کہ یہ لوگ، یعنی اہل اللہ کاخ مصور جیسے آراستہ محل میں اُس تفرقہ کی وحشت کو

دیکھ لیتے ھیں جو یوسف اور زلیخا کے حق میں وھاں سے آخرکار پیدا ھوا اور اُنس اور ملاپ کو اُس ''نے بست'' میں دیکھ لیتے ھیں جو یوسف اور زلیخا کو اُس کے بعد نصیب ھونے والا تھا -

هرچه گوید عجم از خسرو و شیریں شنوند
هرچه آرد عرب از وامق و عذرا بینند

یعنی خسرو و شیریں کا قصہ جو اھل عجم بیان کرتے ھیں، وہ یہ لوگ اُس کو خود خسرو اور شیریں کی زبان سے سن لیتے ھیں اور وامق و عذرا کی روئداد جو عرب والے بیان کرتے ھیں یہ لوگ اُس کو خود وامق و عذرا پر گزرتی دیکھ لیتے ھیں -

نه ستوهند اگر هم راه مجنوں گردند
نخروشند اگر محمل لیلیٰ بینند
خوں خورند و جگر از غصه بدنداں گیرند
خویش را چوں به سر مائده تنها بینند

یعنی جب اُن کے ساتھ کوئی دوسرا دسترخوان پر نہیں ھوتا تو دانت پیستے ھیں، یعنی جو فیض اُن کو پہنچتا ھے، اُس میں اوروں کو بھی شریک کرنا چاھتے ھیں -

سر و تن را اگر از درد سر انگارند
جان و دل را اگر دوست شکیبا بینند
قطرهٔ آب به لب بوسهٔ نشتر شمرند
پارهٔ ناں به گلو ریزهٔ مینا بینند

یہ دونوں شعر دست و گریباں ھیں؛ مطلب یہ ھے کہ درد طلب سے اُکتا جانا اور دوست کے خیال سے فارغ ھونا

کبھی نہیں چاہتے :

قشقه را رونق هنگامۂ هندو خوانند
باده را شمع طرب خانۂ ترسا بینند

یعنی ہر ایک شے کو اپنے اپنے محل پر مناسب و موزوں خیال کرتے ہیں اور کسی چیز سے از راہ تعصب ناک نہیں چڑھاتے -

برسم و زمزمه و قشقه و زنار و صلیب
خرقه و سبحه و مسواک و مصلی بینند

"برسم و زمزمہ" آتش پرستوں کے ساتھ، قشقہ و زنار ہندوؤں کے ساتھ اور صلیب عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے مصرعے میں شعائر اسلام کا بیان ہے - کہتا ہے کہ وہ لوگ برسم و زمزمہ وغیرہ اور خرقہ و مصلی وغیرہ میں کچھ فرق نہیں سمجھتے -

دل نه بندند به نیرنگ و دریں دیر دو رنگ
هر چه بینند بعنوان تماشا بینند
جام جویند و ز رندی نه گرایند به زهد
سبحۂ انجم اگر در ید بیضا بینند
هر چه در سو نتواں یافت بهر سو یابند
هر چه در جا نتواں دید بهر جا بینند
همه گردند دراں پایه که او را دانند
هیچ باشند دراں وقت که خود را بینند

اشعار فخریه

ایں نظر هائے گراں مایه فراموش کنند
چوں به نیرنگ سخن شعبدۂ ما بینند

نظم را موجۂ سر چشمۂ حیواں فہمند
نثر را نسخۂ اعجاز مسیحا بینند
گہ پئے نقل بصد گونہ تقاضا خواہند
گہ پئے فال بصد رنگ تمنا بینند
برد از یاد کہ دنیا ست نمود بے بود
ایں دل افروز نمودے کہ ز دنیا بینند

اس مقام پر اس شعر کی خوبی وجدانی ہے، بیان میں نہیں آسکتی - کہتا ہے دنیا کی یہ دل افروز نمود، یعنی ہماری نظم و نثر جب اہل اللہ کی نظر سے گزرے گی تو وہ اُن کے دل سے اس عارفانہ خیال کو فراموش کر دے گی کہ دنیا محض ایک نمود بے بود ہے -

صفت موسم بہار

تشبیب قصیدہ مدح مکہ معظمہ

شکر! کہ آشوب برف و باد سرآمد
نامیہ از بند ز مہریر برآمد
کسب ہوا نفع آب خضر رساند
سبزہ جہاں را بہ پیشہ راہبر آمد

یعنی آج کل جنگل کی ہوا کھانے سے وہی فائدہ ہوتا ہے جو آب حیات کے پینے سے ہوتا ہے اور جس طرح خضر آب حیات کا رستہ بتاتا ہے اسی طرح سبزہ جنگل کا رستہ بتاتا ہے -

در چمنستان کشودہ بار نوادر
باد کہ بازارگان بحر و بر آمد

اشتلم انتظار گل بود ، ارنه
دیدۂ نرگس ز حدقه چوں بدر آمد
تا ز چه دانسته قرب مقدم گل را!
سبزه به باغ از شگوفه پیش تر آمد

یعنی سبزہ جو شگوفے سے پہلے باغ میں آیا ہے اُس نے گل کی آمد آمد کہاں سے سن لی ہے -

بیہدہ نبود خروش مرغ سحر خواں
کوکبۂ گل مگر به باغ در آمد
قیس کجا تا کند شمارۂ محمل
از پس هر غنچه غنچۂ دگر آمد

غنچے کو محمل سے اور گل کو لیلیٰ سے تشبیہ دی ہے ؛ کہتا ہے کہ قیس جو ایک کے سوا دوسرا محمل نہیں جانتا وہ آئے اور محملوں کو شمار کرے، کیونکہ ہر غنچے کے بعد دوسرا غنچہ اور دوسرے غنچے کے بعد تیسرا وھلّم جراً نکلتے چلے آتے ہیں -

کثرت انواع گل نگر که هیولیٰ
رنجه ز بار فزونی صُوَر آمد

یعنی طرح طرح کے پھولوں کی اس قدر کثرت ہے کہ ہیولیٰ بے شمار مختلف صورتوں کی بہتات سے عاجز آ گیا ہے اور تھک گیا ہے -

لاله بسیچد ز تیغ کوه گزشتن
دامنش اینک ز زیر سنگ بر آمد

''بسیچد'' یعنی ارادہ کرتا ہے ، ''تیغ کوہ'' قلہ کو ، ''دامن از زیر سنگ بر آمدن'' مصیبت سے نجات پانا -

نگہت گل شد وبائے عام جُعَل را
زنجرہ ہر شب نہ ہرزہ مویہ گر آمد

''جعل'' ایک جانور ہے سیاہ رنگ جس کو خوشبو راس نہیں، اسی لیے موسم بہار میں مر جاتا ہے، اور چونکہ گوبر میں پیدا ہوتا ہے، اس لیے اُس کو ہندی میں گبریلا کہتے ہیں، ''زنجرہ'' جھینگر جو رات کو اکثر بولتا ہے، ''مویہ گر'' نالاں و گریاں۔

مے کدہ خسرو گل ست، رزستان
صورت مینا ز غورہ در نظر آمد

کہتا ہے کہ رزستان، یعنی انگور کی ٹٹیاں گویا ''خسرو گل'' کا شراب خانہ ہے، کیونکہ اُس میں نیم خام انگور لگے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے شراب کی بوتلیں۔

رو غم تر دامنی مخور، کہ جہاں را
موج گل از ہر کرانہ تا کمر آمد
فتوئ مے داد ابر و باد و لیکن
شیشہ نہاں بہ کہ ژالہ بد گہر آمد

از تشبیب قصیدہ مدحیہ ملکہ معظمہ

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ملک میں امن ہو جانا اور معافی[۱] کا

۱- معافی کا اشتہار یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو شائع ہوا تھا، کیوں کہ اعلان معافی ہی یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہوا تھا۔ مولانا حالی کا خیال ہے کہ مرزا غالب نے یہ قصیدۂ مدحیہ ملکہ معظمہ اعلان معافی پر تصنیف فرمایا تھا، لیکن مولانا حالی یہ بھول گئے کہ یہ 'قصیدہ مدحیہ ملکہ معظمہ' دستنبوئے غالب طبع اول کے آغاز میں موجود ہے۔ مرزا غالب نے ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے دوران میں پندرہ مہینے کا

بقیہ صفحہ ۴۳۹ پر

اشتہار جاری ہونا۔

در روزگارها نتواند شمار یافت
خود روزگار آنچه دریں روزگار یافت
پرکار تیز گرد فلک درمیاں مبیں
حق داد داد حق کہ بمرکز قرار یافت
در ہائے آسماں بہ زمیں باز کردہ اند
ہر کس ہرانچہ جست بہر روزگار یافت
آمد اگر بہ فرض ز بالا بلا فرود
بر روئے خاک پیچ و خم زلف یار یافت
چوں حسن ماہ یک شبہ بینی بداں کہ ماہ
پاداش جان گدازئ شب ہائے تار یافت
چوں رنگ روئے گل نگری، شاد شو کہ گل
اجر جگر خراشی پیکان خار یافت

بقیہ از صفحہ ۴۳۸

حال یکم اگست ۱۸۵۸ء تک لکھ کر دستنبو کا مسودہ مکمل کر لیا تھا - ستمبر ۱۸۵۸ء میں وہ مسودہ منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس آگرے بھیج دیا تھا ۔ اس کی اشاعت اول مطبع مفید خلایق آگرہ سے منشی ہرگوپال تفتہ ، منشی نبی بخش حقیر، مرزا حاتم علی مہر اور منشی شیو نراین آرام کی نگرانی میں ہوئی - یہ اشاعت اول نومبر ۱۸۵۸ء کے پہلے ہفتے میں پریس سے بازار میں پہنچ گئی تھی - اس وقت صرف پانچ سو نسخے چھپے تھے اور قیمت فی نسخہ آٹھ آنے تھی - تمام کتاب کے ۸۸ صفحات تھے - اولین ۶ صفحوں پر یہ قصیدہ مدحیہ ملکہ معظمہ تھا - دستنبو کے بعد کے دونوں ایڈیشنوں (۱۸۶۵ء اور ۱۸۷۱ء) میں یہ قصیدہ بجائے آغاز کے اختتام پر لگا دیا گیا - جو قصیدہ ستمبر ۱۸۵۸ء میں پریس میں زیر طبع تھا وہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے اعلان معافی کے موقع کی یادگار کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں حالی غلط فہمی کے شکار تھے ۔ یہ قصیدہ غالباً فتح دہلی کے موقع پر کہا گیا ۔ معافی کے اشتہار سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

داؤدی

در خاک و باد آتش و آب آشتی فزود
این پرورش که خلق ز پروردگار یافت
ناچار جز به داد گرایش نمی کند
در دهر هرچه صورت ازین هر چهار یافت
هر کس به قدر فطرت خویش ارجمند گشت
هر شئے سن جوهر خویش اشتهار یافت
گر خواجه بنده را خط آزادگی نشت
هم بر در سرائے خودش بنده وار یافت
ور بنده خود ز خشم خط بندگی درید
توقیع خوش دلی ز خداوندگار یافت
مه روشنی و مهر فروزش ز سر گرفت
لیل و نهار صورت لیل و نهار یافت
بهرام دل به بستن تیغ و کمر نهاد
ناهید ذوق ورزش مضراب و تار یافت
نظاره فتنه های عیان از نظر سترد
اندیشه گنج هائے نهان آشکار یافت
جام از شراب، روشنی آفتاب داد
بزم از بساط تازگئی نوبهار یافت
روی سخن صفائی بنا گوش گل گزید
بانگ قلم نشاط نوائے هزار یافت
برهم زدند قاعده هائے کهن به دهر
هر کس نشاط تازه زهر گونه کار یافت
فیض سحر به غالب پیمانه کش رسید
ذوق صبوح عابد شب زنده دار یافت
ره زن متاع خویش بر ابن‌السبیل ریخت
کودک رضائے لهو ز آزمودگر یافت

گر زاہد ست نیز ز من مے به جام برد
ور مجرم ست نیز ز شه زینهار یافت
با فتنه هم مضائقه در خرمی نه رفت
خود رخت خوابش ازرگ گل پود و تار یافت
دولت سپند سوخت که شد ملک تازه روے
ملک آفریں سرود که دولت مدار یافت
از انتظام شاهی و آئین سروری
سور و سرور و دانش و داد انتشار یافت
برخستگان هند به بخشود از کرم
وکٹوریا که رونق ازو روزگار یافت

شکوهٔ تغافل و عدم توجه به نواب یوسف علی خاں مرحوم رئیس رام پور در زمانهٔ سختی و بے مائگی که بعد از فتح دهلی روزے چند روئے داده بود۔

چوں نیست مرا شربت آبے ز تو حاصل
دانم تو دریائی و من سبزهٔ ساحل
در بادیه بر گور غریباں ز چه سوزد
آں شمع فروزاں که بود درخور محفل
زاں خسرو خوباں چه قدر چشم وفا[1] بود
صد حیف! که شد نقش امیدم همه باطل

۱۔ نواب یوسف علی خاں مرحوم صاحب زادگی کے زمانے میں جب تحصیل علم کے لیے دلی میں آئے تھے، اس وقت مرزا صاحب سے بہت ربط تھا۔ مفتی صدرالدین خاں مرحوم سے عربی پڑھتے تھے اور مرزا صاحب سے فارسی۔ مرزا نے اس قصیدے میں اس زمانے کو یاد دلایا ہے۔ چنانچہ اسی قصیدے پر نواب ممدوح نے سو روپے ماہ وار مرزا کے لیے مقرر فرمایا تھا جو مرزا کے دم واپسیں تک برابر جاری رہا۔

افسانهٔ غم گر بسرایم نبود عیب
با دوست که پیوسته همی برد غم از دل
می‌گویم و هم‌دم زندم طعنه که، تن زن
چوں می نه دهد داد ز فریاد چه حاصل
از طعنه شدم خسته دل و از ره تیمار
دل گفت که هاں شیوهٔ عشاق فرو هل
تا کس نه برد ظن که به شاهد بودم روئے
حاشا که حکایت کنم از لیلی[1] و محمل
شاهد بود آں دوست که اندر غزل او را
خوانند ستم گارهٔ خوں خوارهٔ و قاتل
من نالم ازاں دوست که در عالم انصاف
شایاں بودش گویم اگر خسرو عادل
او خسرو خوباں بود و بنده گدایش
او قلزم و عماں بود و من خس ساحل
خود هرچه سرودم همه با اوست، کزیں پیش
امید گہم بود به هر وادی و منزل
یا رب چه شد اینک که نگیرد خبر از من
بربسته بروئیم در ارسال رسائل
ای یوسف ثانی که بود در همه عالم
مشتاق جمال تو چه دیوانه چه عاقل
تا نزد تو چوں آیم و دور از تو چه سازم
ماندن ز تو دشوار و رسیدن به تو مشکل

۱- چونکه تشبیب میں اکثر معشوق کی طرف خطاب ہوتا ہے، اس لیے کہتا ہے کہ میں اس تشبیب میں لیلیٰ و محمل کا ذکر نہیں کرتا، یعنی معشوق کی طرف میرا روئے سخن نہیں ہے ۱۲

ای کاش به کوئے تو چنیں روی نمودے
زیں ساں که فرو رفته مرا پائی دریں گل
چونست که گاهے نکنی روی بدیں سوئے؟
از چیست که هرگز ندهی وایه به سائل
گر جاں دهم از غصه تو دانی که به گیتی
حرفے غلط از صفحه هستی شده زائل
خواهی که مرا بنگری؟ از دور به فرمائے
تا نزد تو آرند یکے طائر بسمل
از صنعت استاد ازل داں که ز هر سوئے
چوں قبله نما سوی تو ام ساخته مائل
غالب به سخن نام من آمد ازل آورد
دانی که دریں شیوه نیم عامی و جاهل
در فن سخن دم مزن از عرفی و طالب
ایں آیۀ خاص ست که بر من شده نازل
می گنجم و گردوں به گل اندوده درم را
می بیں درگنج ، ارچه کشودن شده مشکل
خود درخور ویرانه بود گنج گراں مند
غم نیست گر آبادئ دهلی شده زائل
هاروت فسون نفس گرم چه داند
اعجاز ز دهلی بود و سحر ز بابل
آں را که صریر قلمم هوش رباید
دیگر نبرد ذوق ز آواز عنادل
توقیع بریلی به تو فرخنده که من نیز
بستم به فره مندی خویش از کرمت دل
حاشا که ستانم زقم قاضی و مفتی
حاشا که پزیرم عمل شحنۀ و عامل

بفرست خرد مند کسان را به حکومت
در جیب گدا ریز قلیلے ز مداخل
هر سال ازاں شهر به من وایه رواں دار
کز بهر همیں گشته در اقطاع تو شامل
امید که لب تشنگی من نه پسندی
زاں رشحه که بر صفحه فشانی ز انامل

''زاں رشحه'' یعنی مداد ، مطلب یه که میرے ساتھ خط و کتابت جاری رہے :

امید که به پزیری و بر من نه کنی قهر
نه پزیرم اگر معذرت فرط مشاغل
امید که آں شیوه نه ورزی که بگویم
کز درد دلم فارغ و از من شده غافل

کیفیت آغاز موسم سرما

تشبیب قصیده مدح نواب وزیر الدوله رئیس ٹونک

عیدالضحیٰ به سر آغاز زمستاں آمد
وقت آراستن حجرهٔ و ایواں آمد
گرمی از آب بروں رفت و حرارت ز هوا
محمل مهر جهاں تاب به میزاں آمد
روز می کاهد و شب راست درافزایش روے
موسم دیر غنودن به شبستان آمد
آذر افروز و خزد اطلس و سیفور بدوز
مهرمه ، می رود اینک مه آباں آمد

هند در فصل خزاں نیز بہارے دارد
گونہ گوں سبزہ حلی بند خیاباں آمد
دے و بہمن کہ در اقلیم دگر یخ بندد
اندریں ملک گل و سبزہ فراواں آمد
نیشکر بسکہ صف آراست، کدیور بہ نسیم
گفت جا نیست وگر سر زدہ نتواں آمد
نخل نارنج نہ بینی کہ ہم از میوہ و شاخ
گوئی و چوگاں بکف آورد و بہ میداں آمد
تا برد داغ غم ہجر شقائق ز دلش
گل صد برگ بہ دل جوئی دہقاں آمد
گر نہ ایں گرمئی ہنگامہ تماشا دارد
از چہ نرگس پۓ نظارہ بہ بستاں آمد

صفت موسم بہار

تشبیب قصیدہ مدحیہ راجا نرندر سنگھ سرگباشی رئیس پٹیالہ

سحر کہ باد سحر عرض بوستاں گیرد
دہد بہ نکہت گل حکم تا جہاں گیرد
برات بر زر گل کردہ اند، پنداری
کہ غنچہ را سپہ سبزہ درمیاں گیرد
مگر بہ گرد گل از بہر پاس حلقہ زدہ است
کہ ژالہ را ز ہوا سبزہ بر سناں گیرد
ستادہ سرو بداں اہتمام بر در باغ
کہ تا بہار دگر راہ بر خزاں گیرد

ز ژاله غنچه به سرمست شاهدی ماند
که بعد باده شکر ریزه در دهان گیرد
چمن ز عکس شفق ساتگین مل گردد
سمن ز جوش طرب رنگ ارغوان گیرد
زنند گر همه آتش به خار ، گل بالد
کشند گر همه پیکر ز سنگ ، جان گیرد
ز انبساط هوا بعد ازیں عجب دارم
که مرغ قبله نما جا در آشیان گیرد
ز گل نگه نتوان داشت دل به حیلهٔ عشق
اگر ز ما نتواند ز دل ستان گیرد
چنان بکنج چمن یافت ذوق طاعت حق
که شیخ شهر چوما ترک خان و مان گیرد
حریص جلوه ـ نگه در هجوم لاله و گل
چوآں گدائے که دنبال کاروان گیرد
چنیں که شاخ همی سینه بر زمیں مالد
چرا کسے ثمر از دست باغبان گیرد

کیفیت صبح

تشبیب قصیده منقبت حضرت امیر

صبحے که در هوائی پرستاری و ثن
جنبد کلید بت کده در دست برهمن
در رفت و روب دیر دم گرم راهبان
آرد بروں گداختهٔ شمع از لگن
خیزند دسته دسته مغان نشسته روئے

در آرزوی چیدن برسم[1] زنار دن
از شور دیریان به گمان خروش صور
اموات را ز رقص به تن پردرد کفن
رخشد ستاره از رخ ناشستهٔ صنم
بالد بنفشه از قد خم گشته شمن[2]
بر روے خاک جلوه کند سایه در نظر
بر بوی دوست حلقه زند مرغ در چمن
خوابد چراغ کشته چو شخص بریده سر
خیزد گل شگفته چو رنجور خسته تن
بر جام مل ز دیدهٔ شبنم چکد نگاه
بر روے گل ز طرهٔ سنبل دود شکن
غوغای روز پرده کشاید ز خوب و زشت
آدائے کوس خواب رباید ز مرد و زن

فخر و خود ستائی با شکوهٔ بخت و گردوں

اس مضمون کے کچھ متفرق اشعار ہم مرزا کے ایک ترکیب بند میں سے جو جناب امیر کی منقبت میں لکھا گیا ھے نقل کرتے ھیں - چونکہ یہ نظم ایک خاص انداز کی منقبت اور خاص طرز کی شاعری پر مبنی ھے جس سے زمانۂ حال کے عام مذاق نا آشنا ھیں ، مگر باوجود اس کے مرزا کے کلام میں شاعری کی حیثیت سے نہایت ممتاز درجہ رکھتی ھے ، اس لیے نہ اس کو اس موقع پر بالکل قلم انداز کیا جا سکتا ھے اور نہ وہ اول سے آخر تک نقل کی جا سکتی ھے - لہذا متعدد بندوں میں سے جستہ جستہ اشعار متضمن مضمون

---

۱ - برسم : جھاؤ یا انار وغیرہ کی پتلی پتلی بالشت بھر کی شاخیں جن کو آتش پرست عبادت ، غسل یا طعام کے وقت ھاتھ میں رکھتے ھیں - ۱۲   ۲ - شمن : بت ۱۲

مندرجه عنوان انتخاب کر کے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں اور جہاں جہاں ضرورت ہوگی مشکل مقامات کی شرح بھی کی جائے گی -

بند اول

آں سحر خیزم که مه را در شبستاں دیدہ ام
شب نشیناں را دریں گردنده ایواں دیدہ ام

اس تمام بند میں مرزا نے اپنی سحر خیزی اور جو کچھ خس نور ظہور کے وقت میں آسمان پر یا زمین پر نظر آیا ہے، اُس کو نہایت بلیغ و جزیل اشعار میں بیان کیا ہے اور آخر کو اُس سے ایک لطیف نتیجہ نکال کر شکایت آمیز فخر پر بند کو ختم کیا ہے - شعر مذکورہ کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ سحر خیز ہوں کہ میں نے چاند کو اُس کی خواب گاہ میں دیکھا ہے اور شب بیداروں ، یعنی کوکب یا ملائک کو اس گردند ایوان (یعنی آسمان) میں مشاہدہ کیا ہے -

اینت خلوت خانۂ روحانیاں ! کاں جا ز دور
زہرہ را اندر ردائے نور عریاں دیدہ ام

''اینت'' کلمۂ تحسین و تعجب ہے بمعنی زہے و خہے، ''روحانیاں'' فرشتے - آسمان کو کہتا ہے کہ کیا عمدہ خلوت خانہ روحانیوں کا ہے جہاں میں نے دور سے یعنی زمین پر سے زہرہ کو چادر نور میں عریاں ، یعنی بغیر کسی حجاب کے دیکھا ہے -

ہریکے فارغ ز غیر و ہریکے نازاں به خویش
لولیے را در دو عشرت گه دو مہماں دیدہ ام
ہر گز اے ناداں به رسوئی نه بندی دل که من
ماہ را در کوز و کیواں را میزاں دیدہ ام

ان دونوں شعروں کا سمجھنا کسی قدر نجوم کی اصطلاحات جاننے پر موقوف ہے ۔ منجموں نے دور فلک کو بارہ حصوں پر تقسیم کیا ہے جن میں سے ہر ایک حصے کو برج کہتے ہیں اور اُن کے نام یہ ہیں : حمل ، ثور ، جوزا ، سرطان اسد ، سنبلہ ، میزان ، عقرب ، قوس ، جدی ، دلو ، حوت ۔ ان میں سے ہر ایک برج کسی نہ کسی سیارے کا خانہ کہلاتا ہے یا وبال مثلاً جدی و دلو زحل کے خانے اور شمس و قمر کے وبال ہیں اور برعکس اس کے اسد و سرطان شمس و قمر کے خانے اور زحل کے وبال ہیں ۔ اسی طرح ہر برج ایک سیارے کا خانہ اور دوسرے کا وبال ہے ۔ ثور اور میزان جن کا دوسرے شعر میں نام آیا ہے یہ دونوں زہرہ کے خانے ہیں اور ثور کے تین درجے چاند کے شرف اور میزان کے اکیس درجے زحل کے شرف کے مقام ہیں ۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے چاند کو اُس کے شرف کے مقام (یعنی ثور) میں دیکھا اور چونکہ ثور اور میزان زہرہ کے خانے ہیں، اس لیے اس مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ میں نے ایک لولی (رنڈی) یعنی زہرہ کی دو عشرت گاہوں یعنی ثور و میزان میں دو ایسے مہمان دیکھے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کے حال سے بے خبر اور ہر ایک اپنے حال میں خوش ہے کہ میرے سوا کوئی دوسرا زہرہ کی عشرت گہ میں نہیں ہے ۔ پھر دوسرے شعر میں دفع دخل مقدر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس بیان کو کسی برے معنی پر محمول نہ کرنا چاہئے، بلکہ صرف مطلب یہ ہے کہ میں نے ماہ کو ثور میں اور زحل کو میزان میں دیکھا ہے ۔

رفتہ ام زاں پس بسیر باغ و مرغاں را بہ باغ
سر برسم خواب زیر بال پنہاں دیدہ ام

''برسم خواب'' یعنی جیسا کہ پرندوں کے سونے کا دستور ہے، ''سر زیر بال پنہاں'' یعنی بازو تلے سر گھسائے ہوئے۔

کلک موج نکہت گل دم زگردش نا زدہ
نامۂ فیض سحر ننوشتہ عنوان دیدہ ام

''موج نکہت گل'' کو کلک، یعنی قلم قرار دیا ہے اور ''فیض سحر'' کو نامہ یعنی خط ٹھہرایا ہے۔ کہتا ہے کہ ایسا سویرا تھا کہ پھولوں کی خوشبو کا قلم ابھی گردش میں نہیں آیا تھا کہ میں نے فیض سحر کا مکتوب جب کہ اس کا سرنامہ نہیں لکھا تھا، دیکھا۔ مطلب یہ کہ فیض سحر ابھی عام نہ ہوا تھا اور پھولوں کی خوشبو سے باغ مہکنے نہیں پایا تھا۔

شانۂ باد سحرگاہی بہ جنبش نامدہ
طرۂ سنبل بہ بالیں بر پریشاں دیدہ ام

اس بیت میں باد سحرگاہی کو کنگھی فرض کیا ہے جس کے ملائم جھوکوں سے گویا سنبل کی زلف سلجھ جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ابھی شانۂ نسیم صبح کو جنبش نہیں ہوئی تھی اور طرۂ سنبل بالین راحت پر پریشان پڑا ہوا تھا۔

باد سر مستانہ می جنبید و شبنم می چکید
غنچہ را در رخت خواب آلودہ داماں دیدہ ام

یہ اس حالت کے بعد کا بیان ہے جو پہلے دو شعروں میں بیان ہوئی ہے۔ کہتا ہے کہ ہوا رسان رسان چل رہی تھی اور شبنم ٹپک رہی تھی جس کی وجہ سے میں نے غنچے کو رخت خواب میں آلودہ داماں دیکھا، یعنی اگرچہ غنچہ ابھی دوشیزگی کی حالت میں معلوم ہوتا تھا مگر چونکہ وہ عنقریب

کھلنے والا تھا ، اس لیے وہ گویا اپنے رخت خواب میں آلودہ دامن ہو چکا تھا ۔

صبح اول گو بروے کس نیاورد از حیا
صبح ثانی را بریں ہنگامہ خنداں دیدہ ام

اب اُن تمام عجائبات کی جو آخر شب اُس کو نظر آئے اُن کی قلعی کھولتا ہے اور کہتا ہے کہ صبح اول (یعنی صبح کاذب جو گویا کہ شرم و حجاب سے ایک جھلکی دکھا کر غائب ہو جاتی ہے) اگرچہ وہ حیا سے اصل بھید منہ پر نہیں لائی، مگر صبح ثانی، یعنی صبح صادق کو میں نے اس تمام ہنگامے پر خندہ زن دیکھا۔ مطلب یہ کہ یہ تمام نظر فریب سیمیائی جلوے تھے جن کو محض وہم نے اختراع کیا تھا اور اسی لیے صبح صادق اُن پر خندہ زن تھی ۔ اس کے بعد بند کو اس گرہ کے شعر پر ختم کرتا ہے اور کہتا ہے :

محرم راز نہان روزگارم کردہ اند
تا بہ حرفم گوش ننہد خلق خوارم کردہ اند

کہتا ہے کہ اگرچہ مجھ کو زمانے کے پوشیدہ اسرار کا محرم بنایا ہے ، مگر اس لیے کہ کوئی میری بات نہ سنے اور پوشیدہ راز ظاہر نہ ہونے پائیں مجھ کو دنیا میں ذلیل و خوار کر دیا ہے ۔

از بند سوم

روشناس چرخ در جمع اسیرانش منم
نور چشم روزن دیوار زندانش منم

کہتا ہے کہ آسمان کے مظلوم اسیروں میں اُس کا روشناس

اور پہچاننے والا صرف میں ہوں ؛ گویا میں اس زندان کے روزن دیوار کی جس میں آسمان کے مظلوم قیدی اسیر ہیں ، آنکھ کا نور ہوں ۔

ثابت و سیار گردوں را رصد بستم به علم
رشتۂ تسبیح گوهرهای غلطانش منم

چونکہ رصد باندھنے سے اکثر ستارے منتظم ہو جاتے ہیں ، اس لیے کہتا ہے کہ میں نے جو آسمان کے ثوابت و سیارات کی رصد باندھی ہے تو گویا میں اس کے گوہر ہائے غلطاں (یعنی کواکب) کی تسبیح کا ڈورا ہوں جس کے سبب سے تمام ستارے مثل دانہ ہائے تسبیح کے منتظم ہو گیے ہیں ۔

نے ز دانش کامیاب و نے بہ‌سختی تنگ دل
شرم سار کوشش برجیس و کیوانش منم

اہل نجوم کے نزدیک برجیس ، یعنی مشتری علم کا اضافہ کرنے والا ہے اور کیوان یعنی زحل سختی اور مصیبت کا بھیجنے والا ہے ۔ کہتا ہے کہ نہ میں علم سے کامیاب ہوں اور نہ سختی و مصیبت سے گھبرانے والا ہوں، تو گویا مشتری اور زحل دونوں کی کوششیں میرے باب میں رائگاں جاتی ہیں اور اس لیے میں ان دونوں سے شرمندہ ہوں ۔

در لئیمی شہرۂ دهر از تہی دستیست چرخ
رفته مسکیں را ز یاد و گنج پنہانش منم

کہتا ہے کہ آسمان جو لئیمی اور بخل میں مشہور ہے ، یہ اس کی تہی دستی کا نتیجہ ہے ، کیوں کہ اس کے پاس دینے کو کچھ باقی نہیں ۔ وجہ یہ کہ اس کا گنجینۂ پنہاں میں تھا سو وہ اپنے خزانے کو، یعنی مجھ کو بھول گیا ہے ۔ ''مسکیں''

سے مراد خود آسمان ہے، جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ غریب اپنا خزانہ کہیں رکھ کر بھول گیا ۔

در غریبی خویش را از غصہ در دل می خَلَم
خوردہ‌ام از شست غم تیرے کہ پیکانش منم

یعنی عالم غربت میں بسبب غم کے میں اپنے دل میں چبھتا ہوں، گویا غم کی چٹکی سے وہ تیر میرے آ کر لگا ہے کہ خود میں ہی اُس تیر کی بھال ہوں :

ماندہ ام تنہا بہ کنج از دور باش پاس وضع
خانۂ دارم کہ پندارند دربانش منم

''دور باش'' ہٹو بڑھو کی آواز کو کہتے ہیں جو نقیب امرا و سلاطین کی سواری کے آگے آگے پکارتے جاتے ہیں، مگر شعراء اُس کو اکثر مطلق روک ٹوک اور ممانعت و مزاحمت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کہتا ہے کہ پاس وضع مجھ کو گھر کے کونے سے کہیں باہر جانے نہیں دیتا ، پس میری اپنے گھر پر ایسی مثال ہے کہ گویا اُس کا درباں میں ہی ہوں ؛

پایۂ من جز بہ چشم من نیاید در نظر
از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

از بند چہارم

چوں بغیر از عمر کاں مفتست ہیچم مایہ نیست
نبودم بیم زیاں گر چرخ کج بازد بہ من
بر منش دستے تواند بود ، زاں بالا ترم
دل نہ بازم شیر گردوں پنجہ گر بازد بمن

پہلے مصرعے کی تقدیر عبارت یہ ہے ''من ازاں بالا ترم کہ فلک را بر من دستے تواند بود۔'' ''شیر گردوں'' سے مراد خود گردوں یا برج اسد یا مریخ۔ ''پنجہ بازیدن'' دست دراز کردن و حملہ نمودن ''دل باختن'' بد حواس شدن۔

هر کرا گردوں بلند آوازه تر خواهد به دهر
نوبت شاهی دهد و انگه بنوازد بمن

''بنوازد بمن'' یعنی اس کو میرے ذریعے سے معزز کرتا ہے۔ دوسرے شعر میں اس کی تشریح ہے:

پادشاهاں را سخن گفتن نه کار هر کس ست
دیده ور شاهے که کار گفتن اندازد بمن
ور توگوئی پادشه را مایه نبود، بیم نیست
خود بشاهاں مایه بخشم گر بپردازد بمن
آں که چوں در ملک هستی سکۀ شاهی زند
سکۀ شاهی بطغرائے یداللّٰہی زند

قولہ ''پادشہ را مایہ نبود'' اس سے یہ مراد ہے کہ سلاطین عہد اس قدر مایہ نہیں رکھتے کہ میرے کمال کے موافق میری قدر کریں اور یا یہ مطلب ہے کہ بہادر شاہ مرحوم جو اس زمانے میں مرزا کے ممدوح اور بادشاہ کے لقب سے ملقب تھے، وہ گردش روزگار سے بے مایہ ہیں۔ قولہ ''گر بپردازد بمن'' بپردازد کا فاعل دوسری بیت میں واقع ہوا ہے، یعنی ''آں کہ چوں در ملک ہستی'' الخ۔ مراد اس سے حضرت امیرالمومنین علی مرتضٰی ہیں جن کی منقبت میں مرزا نے یہ ترکیب بند لکھا ہے۔

قطعات

توجیه توارد خود با کلام سلف

هزار معنی سرجوش خاص نطق من ست
کز اهل‌ذوق دل و گوی از عسل برد ست
ز رفتگان به یکے گر توآردم روداد
مدان که خوبئی آرایش غزل برد ست
مراست ننگ ولے فخر اوست کاں به سخن
بسعی فکر رسا جا بداں محل برد ست
مبر گمان توارد ، یقین شناس که دزد
متاع من ز نہاں خانۂ ازل برد ست

رندانه

فرصت اگرت دست دهد مغتنم انگار
ساقی و مغنّی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی که فریبند
حق را به سجودے و نبی را به درودے

خطاب به یکی مخالفان تونگر

اے که خواهی که بعد ازیں باشم
مخلص صادق‌الولائے تو من
گر ترا شیوه شاهدی بودے
کردمے جان و دل فدائے تو من
ور ترا پیشه شاعری بودے
سودمے چشم و سر به پائے تو من

ور ترا پایه خسروی بودے
سفتمے گوهر ثنائے تو من
چون ازیں ها نهٔ ، مرا چه ضرور
که شوم هرزه مبتلائے تو من
راست گویم ، بهانه چند آرم
ناصح مشفقم برائے تو من
بس که بر مال و جاه مغروری
نیستم خوش ازیں ادائے تو من
چکنی ؟ کایں فساد سیم و زر ست
وائے من ! گر بوم بجائے تو من
بتو هرگز ندادمے زر و سیم
خواجه ! گر بودمے خدائے تو من

خطاب به یکے از نواصب

دیدی آں بدگهر مهر و ولایش به یزید
که به خشم آید اگر زشت و پلیدش گویند
زاں که او خود به سر ابن علی تیغ نه راند
خواجه از ننگ نخواهد که یزیدش گویند
گفتم البته که شبیر بداں می ارزد
که شهیدش بنویسند و سعیدش گویند
گفت زاں رو که عزیزاں همه مسلم بودند
نتواں کرد گوارا که شهیدش گویند

خطاب به یکے از مخالفان خود

کردهٔ جهدے که در ویرانئی کاشانه ام
چرخ در آرایش هنگامهٔ عالم نکرد

گر به هجوت رانده باشم نکته‌ها برخود مپیچ
زان که حرفے ، زانچه گفتم ، خاطرم خرم نکرد
''هم چو تو نا قابلے در صلب آدم دیده بود
زان سبب ابلیس ملعون سجده بر آدم نکرد''
حاش لله ! بودنت در صلب آدم تهمت ست
پیش هر کس گفتم این اندیشه باور هم نکرد

شوخی

ایا زیان زده غالب که از حدیقهٔ بخت
نمی رسد ز تو خار و خسے ز هیچ سبیل
چو لازم ست که پروردگار تا دم مرگ
بود به رزق ضروریهٔ عباد کفیل
چراست این که نداری زر از سیاه و سفید
چراست این که نیابی بر از کثیر و قلیل
فتاده در سر این رشته عقدهٔ ، ورنه
نه مردهٔ تو ، و نے رازق العباد بخیل
ز چند سال به مرگ توؤ تباهی رزق
شدست حکم خود از پیش گه رب جلیل
فرشتهٔ که وکیل ست بر خزائن رزق
نکرد هیچ توقف به رزق در تعطیل
دوم فرشته که یادش بخیر مقرون باد!
روا نداشت در اهلاک شیوهٔ تعجیل
لطیفهٔ کنم از قول شاعرے تضمین
که در لطیفه مر او را کسے نبوده عدیل
''اگر خدائے بداند که زندهٔ تو هنوز
هزار مشت زند بر دهان عزرائیل''

شوخی

به آدم زن، به شیطاں طوق لعنت
سپردند از ره تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم
گراں تر آمد از طوق عزازیل

اب ہم مرزا کی ایک نظم کا مقابلہ دورۂ اکبری کے ایک نہایت ممتاز اور نامور شاعر کے کلام کے ساتھ کرتے ہیں ۔ مرزا کے قصائد و قطعات و مسمطات وغیرہ میں صرف ایک نظم ایسی ملی ہے جس کا مولانا نظیری نیشا پوری کی نظم سے بخوبی مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ نظیری نے جلال الدین اکبر کے بیٹے سلطان مراد کا جو عنفوان شباب میں گزر گیا تھا، ایک مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے جو اُس کے کلیات میں موجود ہے اور چونکہ نظیری کو اُس کے ساتھ نہایت خصوصیت تھی اور اُس کی شان میں نظیری نے متعدد قصیدے لکھے ہیں اور گراں بہا صلے اُن کے جلدو میں پائے ہیں، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ نظیری نے اُس کا مرثیہ کمال صدق دل سے لکھا ہے ۔

مرزا نے بھی مرحوم بہادر شاہ کے بیٹے فرخندہ شاہ کا جو عین نشو و نما کے زمانے میں فوت ہو گیا تھا، مرثیہ اُسی بحر کے ترکیب بند میں لکھا ہے جو مرزا کے کلیات میں موجود ہے ۔ چونکہ دونوں ترکیب بند تیموری شہزادوں کے مرثیے میں لکھے گیے ہیں اور دونوں کا وزن متحد ہے اور ہر ایک میں سات سات بند اور دونوں کا ہر ایک بند آٹھ آٹھ بیت کا ہے ، اس لیے ہم یہ دونوں نظمیں مقابل یک دگر لکھے دیتے ہیں، تا کہ ہر شخص جو فارسی شاعری

کا مذاق صحیح رکھتا ہے ، دونوں میں بہ آسانی موازنہ کر سکے ، مگر افسوس ہے کہ کلیات نظیری کا کوئی صحیح نسخہ ہم کو دستیاب نہیں ہوا لہذا جیسا کچھ لکھا ہوا پایا نقل کر دیا گیا ہے ؛ چنانچہ پہلے بند کے بعض شعر بالکل سمجھ میں نہیں آئے جن کی نسبت ظن غالب یہ ہے کہ اُن میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے -

بند اول

غالب

اے دل بہ چشم زخم حوادث فگار شو
اے چشم از تراوش دل اشک بار شو
اے خوں بہ دیدہ درد گداز جگر فرست
اے دم بہ سینہ دود چراغ مزار شو
اے لب بہ نوحہ نالۂ جاں کاہ ساز دہ
اے سر بہ غصہ خاک سر رہ گزار شو
اے خاک! چرخ گر نتواں زد ، ز جادر آئے
اے چرخ! خاک گر نتواں شد غبار شو
اے نوبہار چوں تن بسمل بہ خوں بغلط
اے روزگار چوں شب بے ماہ تار شو
اے ماہتاب روی بہ سیلی کبود کن
اے آفتاب داغ دل روزگار شو
اے فتنہ باد صبح وزید ، ایں قدر مخسپ
اے رستخیز وقت رسید آشکار شو
آہ ایں چہ سیل بود کہ مارا ز سرگزشت
تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گزشت

نظیری

لب خوش نگشته خنده ره چنگ می زند
در بزم مرگ خنده بر آهنگ می زند
هرگز زمانه جامۂ ماتم بروں نکرد
نارفته شب بدامن شب چنگ می زند
وقت گزشته را با تاسف ز پے مرو
کایں جا نشاط گام به فرسنگ می زند
ایں دهر روز کور، کش ایام خصم باد!
دست طمع به گیسوے شب رنگ می زند
دست اجل به تیغ سیاست بریده باد
از خاک مهر بر دهن تنگ می زند
آرائش جنازۂ و دستار می کند
گوئی که گل بر افسرو اورنگ می زند
ایں چرخ شوخ دیده عجب بے بصارت ست
برجام عشرت که ببیں سنگ می زند
فرزند شاه اکبر والا نژاد مرد
شیون بر آورید که سلطاں مراد مرد

مرزا کے بند میں الفاظ بہت پر شوکت و شان دار واقع ہوئے ہیں اور کوئی شعر صنعت شاعری اور شاعرانہ نزاکت سے خالی نہیں ہے، مگر واقعے کی عظمت جس قدر کہ بیان ہونی چاہیے تھی اُس سے بمراتب زیادہ ظاہر کی گئی ہے؛ بخلاف نظیری کے کہ اُس کا بیان اگرچہ روکھا پھیکا معلوم ہوتا ہے، مگر متانت اور اعتدال کا سر رشتہ اُس نے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بند دوم

غالب

بگزر کہ بر من و تو جفا کرد روزگار
با پادشاہ عہد چہا کرد روزگار
شاہ سخن سرائے سخن ور نواز را
در بزم عیش نوحہ سرا کرد روزگار
شاخے کہ بود موسم آتش کہ بر دہد
از نخل عمر شاہ جدا کرد روزگار
مرگ ایں چنیں رخ و تن نازک ندیدہ بود
کام اجل بہ ہدیہ روا کرد روزگار
شہزادہ خرد سال و بود روزگار پیر
شوخی بہ شاہزادہ چرا کرد روزگار
فرزند پادشاہ نشناسد معانقہ[۱]
آغوش گور بہر چہ وا کرد روزگار
اے آں کساں خاک رہ شہریار را
توجیہ آبروے شما کرد روزگار
ہر چند بے اجل نتواں ہیچ گہ مرد
آتش بہ خود زنید کہ فرخندہ شاہ مرد

نظیری

آفاق پر دریغ و جہاں پر ندامت ست
ایں روز مرگ نیست کہ روز قیامت ست
خلقے پر اضطراب ، چہ جای تمکن ست
دہرے پر انقلاب ، چہ جاے اقامت ست

۱- یہ اشارہ ہے اس دستور کی طرف کہ خاندان تیموریہ کے سلاطین اور شاہزادے کسی سے معانقہ نہیں کرتے تھے -

این ماتم کسے ست که از گریه تا به حشر
بر جیب صبح و دامن شب ها علامت ست
خوں می کند به جلوه دل خلق ، گوئیا
نخل جنازه رسته ازاں نخل قامت ست
هر کس چنیں جمال در آرد به حشر گاه
رضواں گرش بهشت دهد در غرامت ست
دل از نوید صحت او بزم سور بود
اکنوں سرائے ماتم و کوی ملامت ست
یاراں ! عجب شکاری که از دست داده ایم
بر سر زنید دست که وقت ندامت ست
شهباز ما پریده ره آسماں گرفت
مرغے نرفته است که دیگر تواں گرفت

یه دونوں بند سادگی اور مرثیت میں تقریباً برابر برابر هیں البته نظیری کے بند کا چوتھا شعر جس رتبے کا هے ایسا کوئی شعر غالب کے بند میں نہیں هے ۔

بند سوم

غالب

اے قوم ! خویش را به شکیب امتحاں کنید
این کار را به شیوهٔ کار آگهاں کنید
طفل ست شاهزاده و در ره خطر بسے ست
منعش ز عزم رهروی آں جهاں کنید
از میوه گل و انچه دلش خواهد آں دهید

از حیله آنچه رای شما باشد آن کنید
هر حرف دل نشین که بگوئید و نشنود
آن گفته را بعربده خاطر نشان کنید
ور خود ز رفتنش نتوانید باز داشت
بے خود شوید ، جامه درید و فغان کنید
گیرید دشنه در کف و هم بر جگر زنید
تا سینه را ز دیده فزون خون چکان کنید
زنهار پیش شاه مگوئید و بے خبر
تابوت را بجانب مرقد روان کنید
اے اهل شهر مدفن این دودمان کجا ست
خاکم بفرق ، خواب به خسروان کجا ست ؟

نظیری

اے بزم تیره ! رخ چون ارغوان کجاست
وے رزم درهمی ! شه گیتی ستان کجا
شوق سجود و حرمت تعظیم کم‌تر ست
آن ناز صدر و سرکشئی آستان کجا ست
امروز غم به مسند شاهی نشسته است
پهلو نشین خسرو هندوستان کجا ست
آن حکم ها که بود از و آب کار کو
وان کار ها که آمد از و بوی جان کجا ست
دل ها پر از غم ست، عزیزان! چه واقع ست
یک دل شگفته نیست ، خوشی در جهان کجاست
هر جا به سوگ مرگ گروهے نشسته اند
زین غم که عام گشت ندانم امان کجا ست

برگ و شگوفه ریخت ، ثمر از کجا خورم
بشکست شاخ و برگ ، مرا آشیاں کجا ست
کس را سرود درخور ایں تعزیت نبود
پیدا کنید کاول ایں داستاں کجا ست
خلقے بشیون اند و نگویند حال چیست
صبر سخن شنیدن و تاب بیاں کجا ست
آفاق در مصیبت او ممتحن شده
ایں مرگ باعث الم مرد و زن شده

اس بند میں نظیری نے برخلاف پہلے بندوں کے دو شعر زیادہ کر دیے ہیں - نظیری کا بند بلاغت میں شاید مرزا کے بند سے کسی قدر فائق ہو ، مگر مرزا کے بین نہایت دل‌خراش ہیں - متوفی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ کم عمر اور ناتجربہ‌کار ہے اور راہ میں بہت خطرے ہیں ، اس کو جانے سے روکو اور وہ جو کچھ مانگے اس کو دو اور جو بہانہ مناسب سمجھو وہ کرو اور اگر سیدھی طرح نہ مانے تو اس کو سختی سے سمجھاؤ اور اگر یوں بھی کام نہ نکلے تو روؤ اور پیٹو اور کپڑے پھاڑو اور چناں کرو اور چنیں کرو اور بادشاہ کو اطلاع کیے بغیر تابوت مرقد کی طرف لے جاؤ؛ یہ تمام پیرائے بیان کے نہایت مؤثر اور دل خراش ہیں اور گرہ کا شعر سارے بند کا نچوڑ ہے -

بند چہارم

غالب

زاں سبز خط کہ بر رخ او نادمیدہ ماند
گردے بدل نشست و غبارے بدیدہ ماند

بستانیاں بماتم شہزادہ بے خوداند
زیں رو بود کہ پیرہن گل دریدہ ماند
خوں گشت در دل و جگر دوستاں فتاد
آں بادہ ہائے ناب کزو ناکیشدہ اند
در مدح شاہزداہ سخن ہائے دل پذیر
دردا کہ ہم نگفتۂ و ہم نا شنیدہ ماند
در وادیٔ عدم نتواں رفت با حشم
ماند انچہ بود و صاحب عالم جریدہ ماند
زاں گلبنے کہ صرصر مرگش ز پا فگند
خارے بیادگار بدلہا خلیدہ ماند
اخلاق شاہزادہ بود دلنشیں خلق
بوئے ازاں شگفتہ گل نو رسیدہ ماند
آں سرو سایہ دار کہ بارش نبود ـ کو؟
واں نو گل شگفتہ کہ خارش نبود کو؟

نظیری

غم خاست ـ در پیالہ می از ساغر افگنید
شہ بزم تیرہ ـ پردہ ازاں رخ بر افگنید
شمعے کہ دہر روشن ازو بود ـ مردہ است
پروانہ را برید و بخاکستر افگنید
در خانہ اش ز حلقۂ ماتم خرام نیست
ایں حلقہ را ز صحن سرا بر در افگنید
ریحان جلوہ یاسمن عشوہ ریختہ
چینید و ہم برآں قد جاں پرور افگنید
بالیں ز تاب کاکلش آشفتگی کشید
کوتہ کنید عربدہ در کشور افگنید

رفت آں سرے کہ تاج با و سرفراز بود
بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید
پوشیدہ چند جامۂ نیلی ز جور چرخ
بر آفتاب جامۂ نیلوفر افگنید
خیزید تا باں سر تابوت دم زنیم
عرضے کنیم و کار و داعش بہم زنیم

اس بند میں مرزا کا بیان صفائی اور سادگی اور لطافت میں نظیری کے بیان سے سبقت لے گیا ہے جیساکہ اصحاب ذوق پر پوشیدہ نہیں ہے۔

بند پنجم

غالب

دستے ست ای سپہر ترا در ستمگری
بارے برم ز جور تو پیش کہ داوری
نیرنگ ساز چرخ کہ بیداد خوی اوست
با گل کند سمومی و با شاخ صرصری
داغم ز روزگار کہ شاہزادہ بر نخورد
از خوبی و جوانی و فرخندہ گوہری
حیف ست مردنش کہ در ایام کودکی
بود اوستاد قاعدۂ بندہ پروری
ہمہ در دہ ود و سالگیش کردہ کد خدا
با فرخسروانی و فرتاب قیصری
ناگہ روزنامۂ عمرش دریدہ شد
امضا پذیر نا شدہ توقیع شوہری

جز نو عروس صاحب عالم نیا فتند
دوشیزۂ کہ بیوہ کندش بدختری
زیبائی و جوانی فرخندہ شاہ حیف
آں نونہال سروقد کجکلاہ حیف

نظیری

رفتی ورکارہا ہمہ درہم گذاشتی
آشفتگی بہ مردم عالم گذاشتی
جانہائے غم رسیدہ و دلہائے بے قرار
در ہیچ و تاب طرۂ پُر خم گذاشتی
از تو غبار بر دل بیگانۂ نہ بود
بہر چہ بر دل پدر ایں غم گذاشتی
روز و شبت برسم جنیبت ستادہ بود
در زین خویش اشہب داد ہم گذاشتی
شمع مزار و خشت لحد ساختی قبول
رخسار تخت و طرۂ پرچم گذاشتی
ہمت ترابہ ملک نیاور سر فرو
عالم بہر کہ خواست مسلم گذاشتی
حرمت نگاہداشتی و جائے خویش را
بہر برادران مقدم گزاشتی
خون ست بےتو گر ہمہ دل چوں دل من ست
ہر دل کہ بے تو خوں نشود سنگ وآہن ست

اگرچہ یہ دونوں بند اپنی اپنی جگہ نہایت بلیغ ہیں مگر متانت وجزالت کے لحاظ سے نظیری کا پلہ غالب معلوم ہوتا ہے۔

بند ششم

غالب

اے رہ نورد عالم بالا چگونۂ
ماۓ تو درھمیم تو بے ما چگونۂ
از سایہ درغم تو سیہ پوش شد ھما
اے خفتہ در نشیمن عنقا چگونۂ
زاں پس کہ باتو آب وھوای جہان نہ ساخت
در روضۂ جناں بہ تماشا چگونۂ
باگرخان دھر وفائے نداشتی
با حوریان آئینہ سیما چگونۂ
ما بیخوداں بحلقۂ ماتم نشستہ ایم
از خویشتن بگوے کہ تنہا چگونۂ
بے مطرب و ندیم و غلامان خُرد سال
بے باغ و قلعۂ و لب دریا چگونۂ
بعد از تو شاہ خیل ترا برقرار داشت
اینجا[1] عزیز بودۂ آنجا چگونۂ
اے بعد مرگ راتبہ خوار تو عالمے
پروانۂ چراغ مزار تو عالمے

نظیری

اے شاہ مصر دور زکنعاں چگونۂ
اے یوسف از جدائی اخواں چگونۂ
ھر گہ جلوہ کردہ تقاضا چہ می کنی
باحسن شوخ درتہ زنداں چگونۂ

۱- یعنی جہانگیر خاندان تیموریہ میں دستور تھا کہ خاص بادشاہ کی اولاد میں سے جب کوئی شہزادہ مر جاتا تھا تو اس کی تنخواہ اور نوکر چاکر اور اس کی سرکار بدستور بنی رہتی ؟

اسکندر از غم تو بظلمت نشسته است
در زیر گل تو چشمۂ حیواں چگونۂ
اے پارۂ ز جاں و جگر گوشۂ پدر
گشتہ جدا زدیدۂ و داماں چگونۂ
ما بارے از فراق تو در خون دیدہ ایم
تو درمیان روضۂ رضوان چگونۂ
آواز نوحہ طبع و دل آشفتہ می کند
اے بخت خوش بخواب پریشاں چگونۂ
اینجات کار دفتر و دیواں حوالہ بود
آنجا بگو ز پرسش دیوان چگونۂ
قلزم سبک ثبات تر آنجا ز شبنم ست
در بحر کل تو قطرۂ باراں چگونۂ
بشنو کہ بانگ بہر تو بر حشر می زنند
تا بنگریم در صف دوراں چگونۂ
چوں کار رفتگان دگر نیست کار تو
محشر شتاب میکند از انتظار تو

اس بند میں بھی نظیری کے ھاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ھیں نظیری کا یہ بند اُس کے تمام ترکیب بند کی جان ہے اگرچہ مرزا کے یہاں اس بند میں نظیری کے برابر بلند شعر نہیں ھیں مگر مرثیت کا رنگ نظیری سے بڑھ کر پایاجاتا ہے۔

بند هفتم

غالب

گفتار را بنوحہ گری چیدہ ام اساس

غالب

در نوحه شاعری مکنید از من التماس
در پرده سنجی از دم خویشم رسد گزند
در رهروی ز سایهٔ خویشم بود هراس
من میهمان و چرخ سیه کاسه میزبان
دُردی خور هلاکم و تلخابه نوش یاس
باقی نمانده اشک چه گریم به های های
از کار رفته دست - چه بر تن درم لباس
سر حلقهٔ پلاس نشینان ماتمم
اندوه همدمان شه از خود کنم قیاس
چون بود بزم ماتم شهزاده بے خروش
من دم زدم ز تلخ نوائی برین پلاس
از نوحه عرض لطف سخن میتوان گرفت
غالب سخن سرائی و شهنشه سخن شناس
یارب جهان ز فیض تو با برگ و ساز باد
عمر ابو ظفر شه غازی دراز باد

نظیری

فردا کلاه بادشهی بر سر تو باد
رسم العمل برو ز جزا دفتر تو باد
فردا که روز حشر بر انگیزی از زمین
دوش و کنار حور و پری محشر تو باد
روزی که کارها همه موقوف حق شود
جبریل کارساز و خدا یاور تو باد
وقت سوال گوش و لب منکر و نکیر
پر از قبول نکتهٔ جان پرور تو باد

نظیری

آں جُلۂ کہ آدم از و ذل و قدر یافت
از رحمت دو کون بود در بر تو باد
مجموعۂ عمل چو بہ محشر در آورے
کار تو راست ہم چو خط مسطر تو باد
مغز از بخور روی مزارت معطرست
بوئے بہشت ہم نفس مجمر تو باد
آدم بہائے تو نشناسد دریں جہاں
تسبیح قدس در دل کاں گوہر تو باد
نخل ریاض ملک کہ باب عزیز تست
سر سبز از دعائے ثنا گستر تو باد
کارش بہ حسن شاھد فرخندگی بود
ھر چند بر تو مرگ۔ برو زندگی بود

اس بند میں بھی نظیری کے ھاں دو شعر معمولی تعداد سے زیادہ ھیں ۔ افسوس ھے کہ اس وقت کتاب کے چھپنے کی جلدی میں ھم کو اس قدر مہلت نہیں ملی کہ کلیات نظیری کے صحیح نسخے کے ملنے کا انتظار کیا جاتا اور بعد کامل اطمینان کے اُس کے ترکیب بند میں جو اشعار حل طلب تھے اُن کی شرح کی جاتی جس سے ناظرین کو دونوں ترکیب بندوں میں موازنہ کرنے کا زیادہ موقع ملتا ۔ لیکن ھمارا ارادہ ھے کہ اگر اس کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی تو بشرط زندگی اس نقصان کی تلافی کی جائے گی ۔

اب ھم کو مرزا کی کلیات نظم فارسی میں سے صرف مثنوی کا نمونہ دکھانا باقی رہ گیا ھے ۔ اگرچہ پہلے حصے میں کہیں کہیں مختلف مثنویوں کے کچھ کچھ اشعار مقتضائے

مقام کے موافق نقل ہو چکے ہیں مگر نمونے کے طور پر یہاں بھی ایک دو مقام کسی مثنوی کا دکھانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مرزا نے کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی۔ اُن کے کلیات میں گیارہ مثنویاں ہیں جن میں سب سے بڑی مثنوی ۹۲۸ بیت کی ہے۔ اس مثنوی میں جس کا نام مرزا ''ابر گہر بار'' رکھا تھا، اُن کا ارادہ آنحضرت صلعم کے غزوات بیان کرنے کا تھا مگر چوں کہ یہ اُن کی آخری تصنیف تھی اور اخیر[۱] عمر میں

---

۱ - تعجب ہے کہ مولانا حالی اس مثنوی کو مرزا کے آخر عمر کی تصنیف بتاتے ہیں۔ مرزا غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا ہے۔ اس سے ۲۲ سال قبل ۱۸۴۷ء میں سر سید احمد خاں کی مشہور تصنیف آثار الصنادید شائع ہو چکی تھی۔ آثار الصنادید کے باب چہارم، درحالات مشاہیر دھلی، میں سر سید احمد خاں، غالب کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

" اور ایک مثنوی مشتمل اوپر غزوات حضرت رسالت دستگاھی ختمی پناھی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی اگرچہ ہنوز نا تمام ہے، لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے' ان شاءاللہ تعالیٰ جس وقت اتمام کو پہنچے گی گلدستۂ بزم احباب ہوگی ....''

(اقتباس از تذکرۂ اهل دھلی یعنی باب چہارم آثار الصنادید مصنفہ سر سید احمد خاں، طباعت بہ تصحیح و تحشیہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی۔ ناشر انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۵ء صفحہ ۱۰۷)

مثنوی ابر گہر بار آج بھی ناتمام ہے اور اسی قدر موجود ہے جتنی آثار الصنادید کی تصنیف کے وقت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی نے یادگار غالب لکھتے وقت آثارالصنادید بھی نہیں دیکھی تھی حالانکہ اس کا باب چہارم مرزا غالب کے حالات کے لیے ایک معاصر تذکرے کی حیثیت رکھتا تھا اور پھر سرسید سے مرزا کے تعلقات کی بنا پر یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ اہم چیزیں بھی معلوم ہو

بقیہ صفحہ ۴۷۳

طرح طرح کے عوائق اور موانع پیش آئے اس وجہ سے غزوات کے شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی، صرف دیباچہ کے چند عنوان لکھنے پائے تھے کہ مکروہات روزگار نے گھیر لیا۔ مگر یہ مثنوی اُن کی تمام مثنویوں میں ممتاز ہے اور ہم اسی مثنوی کے کچھ اشعار توحید میں سے اور کچھ اشعار مناجات میں سے جو نہایت آزادانہ اور رندانہ طور پر لکھی ہے اور کچھ نعت میں سے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

از توحید

سپاسے کزو نامہ می شود
سخن در گزارش گرامی شود

سپاسے کہ شوریدگان الست
دہندش ببانگ قلم دل ز دست

سپاسے بہ پوزش در آمیختہ
ز دل جستہ و با دل آویختہ

سپاسے دوئی سوز کثرت ربائے
سپاسے دل افروز بینش فزائے

خدا را سزد کز دروں پروری
بدیں شیوہ بخشد ثنا ساوری

بقیہ صفحہ ۴۷۲

جائیں۔ مثنوی ابر گہر بار کے کچھ اشعار "مہر نیمروز" میں بھی نقل کیے گئے ہین۔ مہر نیمروز کے اُس حصے میں وہ اشعار پائے جاتے ہیں جو مارچ ۱۸۵۲ء سے قبل مکمل ہوچکا تھا۔ یہ بھی اسکی ایک دلیل ہے کہ مثنوی ابر گہر بار مرزا غالب کے آخر عمر کی تصنیف نہیں ہے۔

داؤدی

خدائے که زاں گونه روزی دهد
که هم روزی و هم دو روزی دهد

رضا جوئے هر دل که درویش هست
هوا خواه هر رخ که گردیش هست

نرنجد ز انبوه خواهندگان
نیاید ستوه از پناهندگان

خرد جنس هستی فروشندگان
دهد مزد بیهوده کوشندگان

رباید دل اما ز دل دادگان
کشد ناز لیکن ز افتادگان

ز بادے که بر دل وزد در نهفت
زبان را به پیدا در آرد بگفت

نگه را که بیروں نباشد ز چشم
دهه بال پیدائی مهر و خشم

دل و دست با همدگر دوخته
دریں کیسه کردار اندوخته

یعنی در کیسهٔ که از بهم دوختن دل و دست بهم رسیده ـ کردار مردم اندوخته است ـ

رواں و خرد باهم آمیخته
ازیں پرده گفتار انگیخته

نه زیں سو گهرها شمردن تواں
نه راه اندریں برده بردن تواں

به نیروی نُه چرخ برهم زدن
نشاید ز دانست او دم زدن

یعنی بقوّتے که ازاں نه چرخ را برهم میتوان زد از معرفت الٰهی دم نمے تواں زد ۔

گروهے به بند گهر یافتن
فرو بسته دل در زمیں کافتن
یکے را دم تیشه برکاں نخورد
یکے ره به نایاب گوهر نه برد
خرد کز جهانے ست پیشش خبر
نه باشد ز عنواں خویشش خبر
نه بیند جز ایں هیچ بینندهٔ
که مارا بود آفرینندهٔ
نگارندهٔ پیکر آب و گل
شمارندهٔ گوهر جان و دل
به گردش در آرندهٔ نُه سپهر
به گردوں برارندهٔ ماه و مهر
رواں را بدانست سرمایه ساز
زباں را بگفتار پیرایه ساز
بشاهی نشانندهٔ خسرواں
ز رهزن رهانندهٔ رهرواں
بدانش به اندیش فرزانگاں
به مستی نگهدار دیوانگاں

جگر را ز خونابه آشام ده
نفس را به بے تابی آرام ده

شناسندگان را بخود رهنمائے
هراسندگان را غم از دلربائے

نفسها بسودائے او ناله خیز
جگرها به صحرائے او ریز ریز

رگ ابر را اشکباری ازوست
دم برق را بیقراری ازوست

زبانهائے خاموش گویائے او
نهان هائے اندیشه پیدائے او

خرد را که جوید شناسائیش
نگه خیره در برق پیدایش

دوئی بے کفن مردهٔ در رهش
خودی داد گر شحنهٔ درگهش

زهے هستئی محض و عین وجود
که نازد به یکتائیش هست و بود

ز شاخابه کز قلزمے سر دهد
بهر تشنه آشام دیگر دهد

بیک باده بخشد ز پیمانهٔ
بهر ذره رقصے جدا گانهٔ

جهانے ز طوفان بغرقاب در
هنوزش همان چین بگرداب در

اسیرش ز بندے کہ برپای اوست
شناسد کہ بر تخت چیں جای او ست

گروہے ز مستی بغوغا دروں
ہنوزش ہماں می بہ مینا دروں

شہیدش بخویش از طرب بہرہ مند
بجز چشم زخمش نباشد گزند

بہر لب کہ جوئی نوائے ازوست
بہر سر کہ بینی ہوائے ازوست

اگر دیوساریست بے ہوش و ہنگ
کہ ہموارہ پیکر تراشد ز سنگ

بہ بت سجدہ زاں رو روا داشتہ
کہ بت را خداوند پنداشتہ

وگر خیرہ چشمے ست نیّر پرست
بہ دُرد مے از جام انیشہ مست

بمہرش ازاں راہ جنبیدہ مہر
کزیں روزنش دوست بنمودہ چہر

ز تاری درد نان اہریمنے
گروہے بود کز خرد دشمنے

ز بس داد ناآشنائی دہند
بہ آتش نشان خدائی دہند

بہ تن ہا بر آذر گرایش کناں
بہ دل ہا خدا را نیایش کناں

گروهے سراسیمه درد شت و کوے
خدا وند جوے و خدا وند گوے

ز رسمے که خود را بران بسته اند
بیزدان پرستی میان بسته اند

ز مهرے که بیخواست در دل بود
پرستند حق گر به باطل بود

نظرگاه جمعے پریشان یکے ست
پرستنده انبوه - و یزدان یکیست

کدامی کشش کان ازان سوی نیست
بدو نیک را جز بوی روی نیست

جهان چیست ؟ آئینۀ آگهی
فضائے نظرگاه وجه اللهی

بهر سو که رو آوری سوی اوست
خود آن رو که آوردۀ روی اوست

از مناجات

بروزے که مردم شود انجمن
شود تازه پیوند جان ها به تن

روان را به نیکی نوازندگان
به سرمایۀ خویش نازندگان

گهر هائے شهوار پیش آورند
فروهیده کردار پیش آورند

ز نورے که ریزند و خرمن کنند
جهان را بخود چشم روشن کنند

هنگامه با این جگر گوشگان
در آیند مشتی جگر توشگان
ز حسرت بدل برده دندان فرو
ز خجلت سر اندر گریبان فرو
در آن حلقه من باشم و سینهٔ
ز غم هائے ایام گنجینهٔ
در آب و در آتش بسر بردهٔ
ز دشواریٔ زیستن مردهٔ
تن از سایهٔ خود به بیم اندرون
دل از غم به پهلو دو نیم اندرون
ز ناسازی و ناتوانی بهم
دم اندر کشا کش ز پیوند دم
ز بس تیرگیهائے روز سیاه
نگه خورده آسیب دوش از نگاه
بنجشائے بر ناکسی هائے من
تهی دست در مانده ام - وائے من
بدوش ترازو منه بار من
نسنجیده بگذار کردار من
بکردار سنجی میفزائے رنج
گران باری درد عمرم بسنج
که من با خود از هرچه سنجد خیال
ندارم بغیر از نشان جلال

اگر دیگراں را بود گفت و کرد
مرا مایۂ عمر رنج ست و درد
چه پرسی چوآں رنج و درد از تو بود
غمے تازه در هر نورداز تو بود
فروهل که حسرت خمیر من ست
دم سرد من ز مهریر من ست
مبادا به گیتی چو من هیچ کس
جحیمی دل ز مهریری نفس
بپرسش مرا درهم افشرده گیر
پر کاه را صرصرے برده گیر
پس آنگه بدوزخ فرستاده داں
در آتش خس از باد افتاده داں

''پرسش'' سے مراد باز پرس قیامت ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے باز پرس سے مستثنیٰ رکھ اور یہ سمجھ لے کہ مجھ سے بازپرس ہو چکی اور ایک پر کاہ کو باد صرصر آڑا لے گئی۔ اور یہ فرض کر لے کہ میں دوزخ میں بھیجا جا چکا اور ہوا سے ایک تنکا دھکتی آگ میں گر چکا۔

وگر هم چنین ست فرجام کار
که مے باید از کرده راندن شمار

یعنی اگر انجام کار یہی ہے کہ اعمال کی باز پرس ہونی ضرور ہے تو۔

مرا نیز یارائے گفتار ده
چو گویم بران گفته زنهار ده

دریں خستگی پوزش از من مجوے
بود بندۂ خستہ گستاخ گوے

یعنی اس خستگی اور مصیبت کی حالت میں جو کچھ میری زبان سے نکل جائے، اُس پر مجھ سے عذر خدمت چاہنا، کیوں کہ خستہ و مصیبت زدہ غلام گستاخ گو اور بے باک ہوتا ہے۔

دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود
چو ناگفتہ دانی نگفتن چہ سود

زباں گرچہ من دارم اما ز تست
بہ تست ارچہ گفتارم، اما ز تست

ہانا تو دانی کہ کافر نیم
پرستار خورشید و آذر نیم

نکشتم کسے را بہ اہریمنی
نبردم زکس مایہ در رہزنی

مگر مے کہ آتش بگورم ازو ست
بہنگامہ پرواز مورم ازو ست

یعنی صرف مجھ میں ایک عیب ہے کہ میں شراب پیتا ہوں اور اسی سے میری زندگی ہے۔ اس مطلب کو اس طرح ادا کرنا کہ ''آتش بگورم ازوست'' اور ''پرواز مورم ازوست'' منتہائے بلاغت ہے۔ نشۂ شراب سے جو عارضی نشاط اور اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے، اُس کو پرواز مور سے بہتر کسی استعارے میں ادا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ جس طرح چیونٹی کی پرواز اُس کی موت کی علامت ہے، اسی طرح نشۂ شراب کا عارضی نشاط آخر کار

ورث هلاکت ہوتا ہے۔

من اندوہ گین و مے اندہ ربائے
چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے
حساب مے و رامش و رنگ و بوئے
ز جمشید و بہرام و پرویز جوئے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند
دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من، کہ از تاب مے گاہ گاہ
بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سرائے نہ مے خانۂ
نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط
نہ غوغائے امشگراں در بساط
بسا روزگاراں بہ دل دادگی
بسا نوبہاراں بہ بے بادگی
بسا روز باراں و شب ہائے ماہ
کہ بودہ است بے مے بچشمم سیاہ
آفق ہا پر از ابر بہمن مہی
سفالینہ جام من از مے تہی
بہاراں! و من در غم برگ و ساز
در خانہ از بے نوائی فراز
جہاں گل از و لالہ پر بوی و رنگ
من و حجرۂ و دامنی زیر سنگ

دم عیش جز رقص بسمل نبود
به اندازهٔ خواهش دل نه بود

اگر تافتم رشته ، گوهر شکست
وگر یافتم باده ساغر شکست

چه خواهی ز دلق مے آلود من
ببیں جسم خمیازه فرسود من

به ناسازگاری ز همسائیگاں
به سرمایه جوئی زبے مائیگاں

سر از منت ناکساں زیر خاکے
لب از خاک بوس خساں چاک چاک

به گیتی درم بے نوا داشتی
دلم را اسیر هوا داشتی

نه بخشنده شاهے که بارم دهد
بهر بار زر پیل بارم دهد

که چوں پیل زاں جا بر انگیز مے
زرش بر گدایاں فرو ریزمے

به نازکے نگارے که نازش کشم
بهر بوسه زلف درازش کشم

بدیں عمر ناخوش که من داشتم
ز جاں خار در پیرهن داشتم

چو دل زیں هوس ها به جوش آیدے
ز دل بانگے خونم بگوش آیدے

هنوزم همان دل به جوش اندر ست
ز دل بانگ خونم بگوش اندر ست

چو آن نامرادی بیاد آیدم
به فردوس هم دل نیاسایدم

دلے را که کم تر شکیبد به باغ
در آتش چه سوزی بسوزنده داغ

صبوحی خورم گر شراب طهور
کجا زهرهٔ صبح و جام بلور

دم شب روی هائے مستانه کو
به هنگامه غوغائے مستانه کو

دران پاک مے خانه بے خروش
چه گنجائی شورش نای و نوش

سیه مستئی ابر و باران کجا
خزان چون نباشد بهاران کجا

اگر حور در دل خیالش که چه
غم هجر ذوق وصالش که چه

چه منت نهد ناشناسا نگار
چه لذت دهد وصل بے انتظار

گریزد دم بوسه، اینش کجا
فریبد به سوگند، دینش کجا

برد حکم و نبود لبش تلخ گوے
دهد کام و نبود دلش کام جوے

نظر بازی و ذوق دیدار کو
به فردوس روزن به دیوار کو

نه چشم آرزو مند دلاله
نه دل تشنه ماه پرکاله

ازین ها که پیوسته می خواست دل
هنوزم همان حسرت آلاست دل

چو پرسش رگے را بکاود ز دل
دو صد دجله خونم تراود ز دل

بهر جرم کز روے دفتر رسد
ز من حسرتے در برابر رسد

به فرماے کاین داوری چون بود
که از جرم من حسرت افزون بود

هر آئینه همچون منے را به بند
تلافی فرا خور بود نے گزند

بدین مویه در روز امید و بیم
بگریم بدان سان که عرش عظیم

شود از تو سیلاب را چاره جوے
تو بخشی بدان گریه ام آبروے

وگر خون حسرت هدر کردهٔ
ز پاداش قطع نظر کردهٔ

گزشتم ز حسرت ، امیدیم هست
سپید آب روی سپیدیم هست

که البته این رند نا پارسا
کج اندیشه گبر مسلمان نما

پرستار فرخنده منشور تست
هوا دار فرزانهٔ و خشور تست

به بند امید استواری فرست
به غالب خط رستگاری فرست

از نعت سید المرسلین

محمد کز آئینهٔ روے دوست
جز اینش ندانست دانا که اوست

زهے روشن آئینهٔ ایزدی!
که در وے نگنجیده زنگ خودی

ز راز نهان پردهٔ بر زده
ز ذات خدا معجزے سرزده

تمنائے دیرینهٔ کردگار
بسوے ایزد از خویش امیدوار

تن از نور پالوده سرچشمهٔ
ولے همچو مهتاب در چشمهٔ

بهر جام ازو تشنهٔ جرعه خواه
بهر گام ازو معجزے سر براه

کلامش به دل ، در فرود آمدن
ز دم جسته پیشی به زود آمدن

خرامش به سنگ از قدم نقش بند
به رنگے که نا دیده پایش گزند

بہ دستش کشاد قلم نا رسا
بہ کلکش سواد رقم نا رسا

دل امید جائ زیاں دیدگاں
نظر قبلہ گاہ جہاں دیدگاں

بہ رفتار صحرا گلستاں کنی
بہ گفتار کافر مسلماں کنی

بہ دنیا ز دیں روشنائی دہی
بہ عقبیٰ ز آتش رہائی دہی

بہ خوئے خوش اندوہ کاہ ہمہ
بہ آمرزش امید گاہ ہمہ

ز بس محرم پردہ راز بود
بہ نزدیکی حق سرافراز بود

ز رازے کہ باوے سرودے سروش
صدایش بودے ز اول بگوش

خیے قبلۂ آدمی زادگاں
نظر گاہ پیشیں فرستادگاں

کسائی دہ نسل آدم بہ خویش
روائی دہ نقد عالم بہ خویش

بلندی دہ کعبہ بالائے او
گرامی کن سجدہ سیمائے او

یمن روشن از پرتو روئے او
ختن بستۂ چین گیسوئے او

ز بت بندگی مردم آزاد کن
جہانے بہ یک خانہ آباد کن

بہ محراب مسجد رخ آرائے دیر
بہ اندیش خویش و دعا گوئے خیر

تو گوئی ز بس دل ز دشمن رباست
کہ سنگ درش سنگ آہن رباست

نثر فارسی

مرزا کی فارسی نثر کو جو مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے ، اس بنا پر کہ وہ وزن سے معرا ہے صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جا سکتا ہے ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کی جائے تو مرزا کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے ؛ خصوصاً کلیات کا دیباچہ اور خاتمہ ، مہر نیم روز کے ابتدائی عنوان ، تمام تقریظیں اور دیباچے جو لوگوں کی کتابوں پر مرزا نے لکھے ہیں اور مکاتبات کا ایک معتدبہ حصہ سراسر شاعرانہ خیالات اور پوئٹیکل نظم و نسق پر مبنی ہے -

متاخرین میں ابوالفضل ، ظہوری ، طاہر وحید اور جلالائے طباطبا بڑے نثّار مانے جاتے ہیں - مرزا بیدل کی نثر اگرچہ اُن کی نظم کی طرح ایک دوسرا عالم رکھتی ہے ، مگر وہ بھی اپنی شان اور آن بان میں بے نظیر ہے - اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے (اور ضرور تسلیم کرنی چاہئے) کہ مرزا نے متاخرین کی طرز انشاپردازی سے استفادہ حاصل کیا ہے تو بھی متاخرین کی نثروں میں مرزا کی طرز کا

سراغ لگانا ایسا ہی ہے جیسا تخمی آم میں پیوندی کا مزا ڈھونڈنا ۔ تقریباً ساٹھ برس گزرے کہ لکھنؤ کے ایک نہایت لائق آدمی نے مرزا کی نثر کی نسبت یہ بات کہی تھی کہ شیخ ابوالفضل اور مرزا بیدل دونوں کے مختلف اسٹائلوں سے کچھ کچھ مختلف باتیں اخذ کر کے ایک جدا اسٹائل پیدا کیا گیا ہے ، لیکن جب مرزا کی نثر کا اُن دونوں کی نثروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو مرزا کی کوئی ادا اُن کی طرز ادا سے میل نہیں کھاتی ۔

اگرچہ مقتضائے مقام یہ تھا کہ مرزا کی نثر میں جو خصوصیتیں ہم کو معلوم ہوئی ہیں اُن کو یہاں مفصل طور پر بیان کیا جاتا اور ہر ایک خصوصیت مثالوں کے ذریعے سے ناظرین کے ذہن نشین کی جاتی ، لیکن چونکہ لوگوں کو اس قسم کی تدقیقات سے کچھ دل بستگی نہیں ہے ، اس لیے ہم اس بحث سے قطع نظر کر کے حسب وعدہ اُن اصحاب کی ضیافت طبع کے لیے جن کو فارسی زبان کے ساتھ باوجود اُس کی کساد بازاری کے اب تک کچھ نہ کچھ لگاؤ چلا جاتا ہے ، مرزا کی نثروں میں سے بطور نمونے کے کچھ کچھ التقاط کرتے ہیں اور ہم کو اُمید ہے کہ یہ نمونہ اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کافی و وافی ہوگا کہ مرزا نے نثر فارسی میں بھی اُسی قدر بلند پایہ بہم پہنچایا تھا جیسا کہ نظم فارسی میں اُن کو حاصل تھا ۔

اگرچہ مرزا کی نثر کو اگلے نام ور انشا پردازوں کی نثر پر ترجیح دینا ، تا وقتیکہ اُس کو دلیل و برہان سے ثابت نہ کیا جائے ، ایک بے معنی بات ہے ، لیکن ہم کو اُن لوگوں سے جو وجدان صحیح اور ذوق سلیم رکھتے ہیں ،

اُمید ہے کہ وہ مرزا کی نثر میں ایک عجیب طرح کی لذت اور شوخی اور ایک نئی طرح کا بانکپن دیکھیں گے جس سے تمام متاخرین کی نثریں بالکل معرا ہیں۔

چونکہ مرزا کی طرز انشا پردازی سے اکثر لوگ نا آشنا ہیں، اس لیے جہاں تک ممکن ہوگا ہم اُن کی نثر میں سے ایسے مقامات اخذ کریں گے جو صاف اور سلیس ہوں اور با ایں ہمہ جہاں ضرورت ہوگی کہیں بین‌السطور میں، کہیں بریکٹ میں اور کہیں فٹ نوٹ میں حل طلب مقامات کی شرح بھی کرتے جائیں گے۔

مرزا کے تمام فارسی کلام کی املا میں ایک خصوصیت ہے جس سے اکثر لوگ نا واقف ہیں، یعنی وہ بعض الفاظ کو تمام اہل زبان اور زبان دانوں کے بر خلاف دوسری صورت سے لکھتے ہیں؛ مثلاً صد کو سد، شصت کو شست، غلطیدن اور طپیدن کو غلتیدن اور تپیدن، گذشتن اور گذاشتن کو گزشتن اور گزاشتن، آذر اور تذرو کو آدر اور تدرو وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ یہ املا ناظرین کے تردد کا باعث تھی اور نیز ہم اس املا کو صحیح نہیں سمجھتے اس لیے اس کتاب میں جہاں کہیں مرزا کا کلام نقل کیا گیا ہے وہاں الفاظ مذکورہ قدیم معمولی طریقے کے موافق لکھے گئے ہیں۔

نثر فارسی کے نمونے

از مہر نیم روز

خطاب زمیں بوس

مہر نیم روز کے دیباچے میں حمد اور نعت اور مدح

پادشاہ کے بعد ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف خطاب کر کے اپنا درد دل بیان کیا ہے اور اس خطاب کا نام ''خطاب زمیں بوس'' رکھا ہے۔ اس کو کسی قدر حذف و اسقاط کے بعد ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

''قا آن شیوۂ خاقانا! و خواقین خدایگانہ! روی[۱] آوردن من از عدم بوجود بہ سودائے گہر سنجی و گہر فروشی بود۔ کالائے بیش بہائے من دریں چار سو روی روائی ندید و متاع گراں مایۂ مرا دریں بازار ارزش ارزانی نہ شد۔ ناچار ہر چہ با خویش آوردہ ام، چوں گویم کہ با خویش می برم۔ لختے در سفینہ ہا، و پارۂ در سینہ ہا می‌گزارم و می گزرم۔ پس از من آں گنج شائگاں را گر ہمہ باد ببرد گو ببرواگر ہمہ خاک بخورد گو بخور۔ سینہ آرزو ہائے جواں مید را مدفن ست، لمعۂ نگاہ کرم چراغ گور غریباں باد!

نیاگان نامہ نگار از تخمۂ افراسیاب و پشنگ بودہ اند، و فرماں دیاں با فرو فرہنگ۔ فرو مردن چراغ ہستی نور دیدۂ توبہ باد آستین کینۂ کیخسر و پشنگیاں را روز سیاہ پیش آورد۔ خداوندان اورنگ و دیہیم را ازاں برگ و سازہا جز تیغ گند ناگوں بکف نماند۔ بہ مرز و بوم بیگانہ روی آوردند، و بہ دست مزد تیغ زدن نان خوردند۔ ہم ازیں نیستان ایوانان کہسار نشیمن سلجوقیاں دگر بارہ سر بہ افسر و افسر بگوہر آراستند۔ چرخ گردندہ چنانکہ خوی اوست

---

۱ - مرزا اکثر، بلکہ تقریباً ہمیشہ اُن لفظوں کے بعد جن کے آخر میں واؤ یا الف ہوتا ہے بغیر اضافت کے بھی قدما کی طرز پر یائے زاید لاتے ہیں، مثلاً رویا سویا پا اور جا کی جگہ روے، سوے، پاے اور جاے لکھتے ہیں ۱۲۔

این نامداران کاؤس کوس را نیز پای افگند ـ

در مشرب ما خواهش فردوس نجوئی
در مجمع ما طالع مسعود نیابی
در بادۂ اندیشۂ ما درد نه بینی
در آتش هنگامۂ ما دود نیابی

از واپسیان این قافله نیاے من که در قلمرو ماوراءالنهر ، سمرقند شهر مسقطالراس وے بود ، چون سیل که از بالا به پستی آید از سمرقند به هند آمد ـ در دفتر سپهبد شاه نشان ذوالفقارالدوله میرزا نجف خان توقیع نوکری شاهش نوشتند و پرگنه پها سو برات روزی وے و سپاهش نوشتند ـ پدرم پیشۂ پدر خویش داشت، و هم در کارزار جامه گزاشت۔ همانا گلبن ثنائے ترا نو آئین نوا بلبلے همی بایست که مرا زمزمه سنج و دستان سرائے آفریدند ـ

رباعی

غالب بہ گہر ز دودۂ زاد شمم
زان رو بصفائے دم تیغ ست دمم
چون رفت سپهبدی زدم چنگ بشعر
شد تیر شکسته نیاگان قلمم

خاکم به سر که به فریب پندار آزاده روی به سخن لا آبالیانه پرداختم ، و اندازۂ ارزش سخن و پایه والائی گوهر خویش نشناختم ـ سینه من نفسے داشت بروان آسائی نسیمے که از نسترن زار وزد زیان زده من که دم جز به نابایست نه زدم دنبان مرا قلمے بود به دجله باری ابرے که از قبله خیزد بے هده کوش من که باران به شوره زار فرو ریختم ـ

با ایں فروغ گوہر ورخشانی نہاد
زیں سان سیاہ روز کرا کرد روزگار

با فرو فرهنگ بیگانه و با نام و ننگ دشمن ، بافرومایگاں هم نشیں و با اوباش هم رنگ ، پائے بے راهه پوئے و زبان بے صرفه گوئے ، در شکست خویش گردوں را دستیار و در آزار خویش دشمن را آموزگار ، دل پر از خار خار و دیده نشتر زار ، نه دستگاه خودنمایانه آرایشے ، و نه سرو برگ آزادانه آسایشے - سرگزشت هر کس همان فرمان هائے امضا پزیرفتۂ سر نوشت اوست ؛ در آنچه بر من رفت دوستان را با من چه جای سرزنش و مرا با دشمنان چه گنجائی پرخاش -

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج
دانا خورد دریغ که ناداں چه کار کرد

پس از پنجاه ساله آوارگی که تیزئی رفتار من از مسجد و بت خانه گرد انگیخت و خانقاه و مے کده رابه یک دگر زد؛ بهفروغ آں فرۂ ایزی که فریدوں را به فرتاب دادگری دل افروخت و مرا فرهنگ سخن گستری آموخت - بداں[1] در فرودم آوردند که تو نیز چوں حلقه چشمے بداں در داری ، و نتوانی که دیده برادری ... ...
تا همسایۂ اویم سپهریاں در سایۂ من اند و تا خاک نشین آں درم فرشتگاں در رشک پایۂ من اند در دل و دیدۂ روشناں جائے من ست و بر سر ماه و ستاره پائے من - دریں گوشه گزینی و خوشه چینی نخست آیۂ رحمتے که بر من از بالا فرود آمد - رودادن خجستگی زمیں بوس گیهاں خدیو

۱ - اس در سے میاں کالے صاحب کا دروازہ مراد ہے؛ جو بہادر شاہ کے پیر تھے اور مرزا ان کے مکان میں رہتے تھے -

خدا داں بود ۔ دولت روئے آورد ، بخت از خواب جست ، حور چشم روشنی گفت ، رضواں بہ رضاجوئے آمد ، چرخ از رفتہ عذر خواست ، روزگار از گزشتہ بحلی طلبید ۔

نومیدی از تو کفر و تو راضی نہ بہ کفر
نو میدیم دگر بہ تو امیدوار کرد

کالبد خاکئی مرا چوں پیکر گرد باد جائے درمیاں نیست ۔ ھمی یک دو دمہ سرگشتگی تماشا دارد، مگر عندلیب گلشن تصویرم کہ بہ بوئے گل زمزمہ از وے نتواند دمید ، یا سبزۂ جوھر شمشیرم کہ بہ‌وزیدن زدیدن باد مستانہ نیارد چمید۔گسستگی پیوند نشاط کہن شد ، و خون از دل ھمچناں در چکیدن ست تا پیوند چہ قدر استوار بود ؟ و چہ مایہ بہ زور گسستہ اند

شبے با دل دیوانہ کہ لختے از من ھوش مند ترست گفتم کہ اگر بہ گفتار نیرو دھی بہ شاہ ارم کارگاہ بارگاہ عرضہ دارم کہ آئینۂ رازم ، مرا می تواں زدود ، و بندہ سخن طرازم مرا می تواں پرورد ۔ گفت اے ناداں ایں سخن از جائے دگر بود و ھنگام آں گزشت ؛ اکنوں اگر ھمی توانی گفت ، بگوئے کہ خستہ ام مرھم می تواں نہاد ، مردہ ام جاں می تواں بخشید ۔

رباعی

شاھا ھرچند وایہ جوے آمدہ ام
دانی کہ چہ مایہ نغز گوے آمدہ ام
آبم کہ محیط را بہ جوے آمدہ ام
رنگم کہ بہار را بہ روے آمدہ ام

اگر چنانکہ بہ دوراں تو ام ۔ بہ روزگار فرزانہ جمشید بودمے

جمشید روزگار را آفریں گفتے و اگر بدانسان که ثنا خوان شهر یارم فرخ فریدون را ستودمے ، فریدون چرخ و ستاره را گرد سرگشتے ۔ دراں انجمن که زردشت آتش افروخت و ژند آورد ، اگر من بدیں دم آذر فشاں جا داشتمے آذر از بیم من زبانه نزدے و از دل فریبی بیان من کس بشنیدن ژند نپرداختے ۔ من بدیں فرخی بخت که چوں تو خداوند کار فرمائے دارم ، هر قدر بر خویشتن بنازم جا دارد ؛ سرت گردم ! تو نیز بدیں گرمی هنگامه بناز ۔ که همچو غالب بنده آتشیں نوائے داری ۔ اگر بانداز هنر داد التفات می دهی ۔ جائے مردمک دیده به من باز گزار و در دل بروے من بکشائے ۔

گویند در عهد جهاں بانی حضرت صاحبقران ثانی به فرمان آں خسرو دریا دل کلیم راه صدره به سیم و زر لعل و گهر سفته اند ؛ من آں خواهم دیده و راں را دستوری دهی تا از کشش کوشش نه رنجد ، و یکبار گفتار مرا با کلام کلیم بسنجند ۔

پریشان نوائی من در ستائش گفتار خویش اگر خود گزاف نباشد ۔ گفتار راست به گستاخی گزاردن هم از انصاف نه باشد ۔ آخر نه همانم که همه وقت خود را هیچ شمردمے ، و هیچ گه بر خود گمان کمالے نبردمے ؟ سرمستی ذوق برگزیدن[1] ایں والا نظر که برگزیده تست مرا از من برد ، و خامهٔ بے پروا پوے راه بدیں روش و آهنگ به‌خرامش و رامش آورد ــــــــ همانا بلند نامی سلطان دهر در آفاق چشم

۱۔ خاندان تیموریه کی تاریخ نویسی کے لیے مرزا کو حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے تجویز کیا تھا، یہاں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

داشت که چوں منے را که به جادو بیانی شهرهٔ آفاقم به کردار گزاری گماشت - من خود ازاں رو که دل و زبان ایں بیدار مغز آئینه دار دل و زبان شاه است دانم که آنچه عمدة الحکما دریں باب به‌من فرموده ، فرمان شاه است -

بادشاهاں را ثنا گفتن نه کار هر کس ست
دیده ور شاهے که کار گفتن اندازد به من

نامه نگار کردار گزار را به تنومندی توفیق سرانجام خدمت سعادت جاودانی و خاقان را به سایهٔ سواد ایں نگارش که ظلمات آب حیوان ست حیات ابد ارزانی باد :

فخریه فقرے

مرزا نے مہر نیم روز میں جہاں سبب تالیف کتاب لکھا ھے اُس کے آخر میں یہ ظاہر کیا ھے کہ کسر نفسی کی معمولی رسم کے برخلاف اگر میں اپنی طرز بیان کی داد لوگوں سے چاھوں تو یہ کوئی بےجا بات نہ ھوگی بلکہ عین تنقید و تمیز کی بات سمجھی جائے گی - اس کے بعد کہتے ھیں :

”کالا شناسی را نه آں آئین است که نکوئی کالاے خویش از نظر اندازند و پرکار کشائی را نه آں دستورست که بر هر پیکرے که خود کشند عشق نه بازند ، مگر مانی آں نقش را که خود می زد از اعجاز نمی شمرد ؟ و آذر آں بت را که خود می تراشید نماز نمی برد ؟ یزداں را بندهٔ سپاس مگزار باشم اگر قلم را بهر جنبش آفریں نگویم و از سخن به هر اندیشه سپاس نه پزیرم - رفتار کبک و تدرو دل از دست برد - و خرام ایں رعنا لعبت رقاص سرمست نکند؟ حاشا که خرامش کلک بر ورق ایں مایه ذوق انگیز

تواند بود تیرست که به سنبله در حالت سرمستی تصمیم[1] خودنمایانه به ناز می خرامد - این پارسی آمیخته به تازی که از زمان چیره‌دستئ عرب بر عجم در گیتی پدید آمد خسروی گنجینهٔ در بسته بود که خامهٔ من قفل درش کلید آمد - پرویز کجاست تا بنگرد که درین رهروی کدام ره سپرده‌ام ، و بهرام کجاست تا فرارسد که سخن را از کجا به‌کجا برده ام :

خسروی باده درین دور اگر می‌خواهی
پیش ما آئے که جرعهٔ از جامی هست

خود ستائی فروهلم ، و بند پندار بگسلم - آوخ ! ازان روزگار که از خوئ به ناسازی و از کار به بازی سپری شد ، و داد ازان بیداد که در ورزش افزونی خشم و کام بر روان و هوش رفت - از کارفرمائے این نگارش سپاس پزیرم که بپرداختن این نمط که خود را چون سایه با زمین هموار ساخته ام ، تا پرداخته ام و به انگیختن این نقش که چشم و دل و نگاه و نفس باهم آمیخته ام ، تا انگیخته ام - دست از کارهائ دگر کوتاه است ، و دل از اندیشه‌هائے دگر برکنار - نامه نگار که از کردار گزاری بگفتن درد دل روئے آورده بود ، باز به‌پائے سخن می آید و جادهٔ که نشان داده اند می پیماید - نگرندگان همه تن چشم باشند و شنوندگان سراپا گوش

---

۱ تصمیم اور احتراق منجمین کی اصطلاح میں دو متقابل لفظ هیں- جب کسی ستارے کا فاصله مرکز آفتاب سے ٦ درجه هو تو کهتے هیں که یه ستاره احتراق میں هے اور جب یه فاصله ١٦ دقیقه یعنی به نسبت احتراق کے ۳۴۴ دقیقه کم هو تو کهتے هیں که یه ستاره تصمیم میں هے ، الغرض ستاره کا تصمیم میں هونا اس کی عمده ترین حالت هے ۱۲ -

طرز واقعہ نگاری

مرزا نے مہر نیم روز میں جس طریقے سے واقعات تحریر کیے ہیں یہاں دو ایک مثالیں اُس کی بھی لکھی جاتی ہیں:

از روئداد قبل خاں کہ از نیاگان امیر تیمور بود

خان خطا باخویشتن سنجید کہ با قہرمان قوم مغل مہر ورزد و مہر انگیز نامہ رواں داشت وگزیدہ روشے را بہ نامہ‌بری و میانجی‌گری گماشت - فرستادہ آمد و جہان پہلوان قبل‌خاں را زمیں بوسید و نامہ سپرد و پیام گزارد - صرفہ در آشتی بود نہ در فروگزاشت - قاجولی بہادر را بجائے خود نشاند و بہم عنانئ نامہ آور توسن تیزگام سوئے خطا راند - و فرمان دہ آں کشور سراں لشکر را پزیرہ فرستاد، و مہماں را بخوش‌تریں نشیمن فرود آورد- دو پادشاہ سپہر بارگہ بر یک خوان نشستند ، و نان خوردند ، و راؤق آشامیدند ، مگر خرد پیشہ قبل خاں را در اندیشہ گذشتہ باشد کہ مبادا خطائیان زہر بہ بادہ آمیزند و بدیں رنگ خون مہماں ریزند- در ہر بزم پس از اندک مایہ درنگ بہ بہانۂ آب تاختن بروں آمدے و بہ ستم شگوفہ کردے و خوردہ آشامیدہ از دھن فروریختے - چوں بہ بزم اندر آمدے دگر بارہ ساغر گرفتے و خوردنی از سر گرفتے - خطائیاں بہ شگفت فروماندہ کہ یا رب ایں چہ نیرومند و زورآور کسے ست کہ از ما بیش تر می خورد و خورش را بر وے گرانی نیست، وے از ما فزوں تر می کشد و ہشیار تر از ماست - مے کشاں دانند کہ چوں بادۂ پرزور دمادم خورند ، ہرچند ہر بار بشگوفہ اندازند

نه آنست که مستی روئے ندهد ، و تاب مے و زبونیٔ قے منش را بهم بر نه زدند - شبے باده بر خرد زور آورد - قبل خاں ریش دارائے خطا که التان خاں نام داشت ، گرفت و به سوے خود کشید ، و ناسزا گفت - میزباں خشم فرو خورد و نزدیکان خود را که بهم برآمده بودند از گستاخی باز داشت - بامداداں مهماں آهنگ بازگشت سرود - میزباں که از بد مستی دو شینه سرگراں بود - چنانکه میزبانان دامن مهماں زود از دست نه‌دهند و آرزوئے دیر ماندن کنند ، نکرد - کلاه هائے گوهرآگیں ، و کمرهائے زرین ، درخشنده نگین هائے بیش بها و بربسته هائے پرنیاں و دیبا پیش کشید ، و پدرود کرد - هنوز رهرو دور نرفته بود که بدآموزاں التان خاں را از جائے بردند ، و براں آوردند که قبل خاں از راه برگردانند ، و بدرگاه آوردند ، و کالبدش را بدشنهٔ و خنجر ازهم فرو کشایند - سخن[1] به‌نرمی گزارندهٔ ستاره از سپهر فرود آرنده - بدیں کار کمر بست و قبل خاں را براه دریافت ؛ به بازآمدن فریفت - رمیده رام نه شد و از راه برنگشت - فرستاده تنها باز آمد و به فرستنده خبر داد - بگروهے از گرداں و یلاں فرماں رفت که جلوگسیخته شتابند ، و هر کجا یابند اگر بشادی و رادی نیاید بخواری و زاری آورند - مگر قبل خاں را براه دوستی بود از دودهٔ ستودهٔ سلجوق - بکاشانهٔ وے فرود آمد - دانم از بهر آسایش آهنگ دو سه روزه آبخورد داشته باشد خطائیان شوریده مغز دراں ده رسیدند ، و خاں را دراں خانه دیدند - سخن بداں لابه ساز کردند که خاقان فریب خورد ، و خواست که سوئے خطا

۱- یعنی کسیکه بلطف زبانی و حیله سازی ستاره را از سپهر فرود آورد ۱۲-

برگردد ـ خانهٔ خدا که خرد از مهر فزون داشت ـ نهفته بادپائے پیش کشید و گفت کارها دگرگون ست ؛ رفتن بخطا خود بهیچ روئے روا نیست ـ تنها بدیں گروه سیاویز ، و بریں باد توسن نام برنشیں ، و سوئے ایل و اولوس بگریز ـ ناگزیر هم چناں کرد ، و جان گرامی به تیز گامی برد ـ خطائیاں روئے بازگشتن نداشتند۱ ، پے آمیدگاه تگا پوئے خویش ، برداشتند ـ خاں سپهر آستاں نخست بآرامش جا رسید و خطائیان سپس ـ با قاجولی بهادر و فرزان گاه لشکر سگالش رفت که چه می باید کرد ـ انجام کار به بهدید یکدگر بدخواهاں را کشتند ؛ تا از تخمی که کشتند چه دروند ـ

شهریار قبل خاں از یک بانوے نکو دیدار ، که از قوم قنضرات بود ، شش پسر داشت نخستیں و دومیں به اوگین یرقاق و قویله خان نام آور ، و دیگراں به نام هائے دگر روشناس ـ روزے نخستیں ایں دو برادر نام آور ناگه بشکارگاه از هم رهاں جدا بهمی ماند ، و راه گم کرده هرزه همی گردد تاتار خانیاں ، که غارت‌گری پیشه داشتند ، و پیرامن قلمرو مغول همواره راه می زدند ـ با ایں شهسوار پریشاں رفتار بر می خورند ، و چوں مے داند که کیست به اسیری می‌برند ، و به التا خان خطائی می سپرند ـ خاں که دلے پرداشت فرماں می دهد که شاهزداه را بر خر چوبیں به میخ هائے آهنیں بردوزند ، و تن نازنینش از رواں پروازند ـ خداوند مغولستان را که از پیش رنجور بود به جگرتابی ایں داغ درد افزود ـ چوں دانست که ناکام

---

۱ ـ پے برداشتن تعاقب نمودن ـ امیدگاه تگا پوے خویش یعنی کسے که درطلب او تگا پو می نمودند ۱۲ ـ

همی باید مرد دومین پسر خویش قویله خان را به جانشینی گزید ، و به کشیدن انتقام خون برادر وصیت کرده چشم از تماشائے جہان پوشید ۔ قویله خان تا نگین سلیمان بکف آورد بفراهم آمدن سپاه فرمان نبشت ۔ فرمان بران و کینه خواهان از هر سو به تخت‌گاه رو ے آوردند ۔

شہنشاه دانا دل دیده ور
که چون لعل بودے سراپا جگر
بران شد که لشکر فراز آورد
بسوئے خطا ترکتاز آورد

ز مردان و گردان و کند آوران
به جنبش در آورد کوهے گران

ازان رو که بایست خون ریز شد
منش‌ها بخون ریختن تیز شد

دلیران ز دشمن کشی دم زدند
ز دم باد بر روئے پرچم زدند

ز تاتار تا گرد انگیختند
به بنگاه خان خطا ریختند

التان‌خان دل و دست وعنان و سنان بکار آورد، و خود را با سپاهے از ستاره بے شمار افزون تر، به پیکار آورد ۔ کوشید و کوشیدن سود نداشت ؛ رقم فیروزی بنام قویله خان کشیده بودند ۔ شکیبائی گسل شکستے بر خطائیان افتاد ، علم‌ها واژگون شد ، و اندیشه بگریز رهنمون ۔ جہانبان التان خان به‌گریختن جان برد، و تن هائے خسته و دلهائے شکسته از میان برد ، بشهر اندر آمد ، و در بروئے سپاه

کینه خواه بست۔ قویله خاں و لشکریانش نه آں مایه برگ و ساز به یغمار بودند که در اندیشه گنجد ۔ سپاس گزار چرخ و اختر گشتند ، و گراں‌بار و سبک عناں برگشتند ۔ پادشاه بچشم روشنی پیروزی سپاه رعیت را صلائے عشرت اندوزی داد ۔ هنگامۂ جشن گرمی پزیرفت ، و بزم سور آرایش یافت ۔ خواهی هنگامه گرم کن و خواهی بزم آرائے ؛ مرگ را ، نه آں خدنگ به کماں ست که خطا کند ، قویله خان را نیز به هنگام خویش ناوک برنشاں خورد ۔ چوں پسر نداشت برتان بهادر جائے پدر از برادر گرفت ۔ بسکه دلیر و مردانه بود ۔ نامش از خانی به بهادری در جهاں رفت ۔ به روزگار جهاں داری ایں شهر یار دلاور ، برق اجل خرمن هستی قاجولی بهادر سوخت و پسرش آروسچی برلاس پسر لشکری رخ افروخت ۔

پارہ از احوال امیر تیمور

روزے میانه امیر قزغن[1] و امیر طراغائے [2] درباره اولوس و قشون سخن میرفت ، و فرزانه فیروزی فر امیر تیمور دلاور با پدر هم زباں بود ۔ پدر را از گفتار باز داشته خود به شگرفی سخن سرائے شد ، و بداں هنجار زخمه چند برتار گفتار زد که امیر قزغن دراں شیوا بیانی و گهر افشانی به مهر دل بست ، وبا آفریں زبان برکشاد ۔ سخن گوئے فروهیده ادا را پسر خواند ؛ و هم دراں بزم اولجائتو ترکاں خواهر امیر حسین نبیره خویشتن را به آئین دین و قانون شرع بوے سپرد ۔ تا خویشی بر خویشاوندی افزاید ، و آمیزشے چوں شیر و شکر درمیان آید ۔ امیر جهاں‌جوے پس ازاں پیوسته

۱- امیر قزغن نام یکے از آمرائے چغتائیه ۱۲

۲- امیر طراغائے نام پدر امیرتیمور ۱۲

با امیر قزغن در بزم همنشیں و همدم و در رزم پیش‌تاز و پیش آهنگ ، بودے از نبرد آزمایان برلاس و دلاوران چغتا هر که آں دست برد نگرستے شگفتی فروماندے ، ”دوستت مریزاد“ گویا براں دست و بازو آفریں خواندے - پس از امیر قزغن که دامادش تغلق تیمور ناگاه در شکارگاهش کشت - جهان پهلوان تهمتن تواں به تنها دامن همت والا گرفت ، و در تیغ زنی وخصم افگنی کارش بالا گرفت -

هر[1] چند کـه زشت و ناسزایم همه
در عـهدهٔ رحـمت خـدایم هـمه
ور جـلوه دهد چنانکه مایم همه
شائسته نفت و بـوریـایم همه

برادر زن صاحبقراں همانا امیر حسین نیز بوے پیوست ، و عهد بست که هر چه از ملک و مال و برگ و ساز گرد آید بر یکدگر بخشش کنیم ؛ و باهم مهر ، و با قوم جز آرزم ، وبا خلق جز داد نه ورزیم - بخون گرمی ایں دو گرد دلاور دو شیر مرد هم گهر هنگامه گرمی پذیرفت ، وگزیں دستگاهے دسترگ سپاهے فراهم آمد - صاحبقراں نه از سادگی بلکه از آزادگی دل با زباں یکے داشت و امیر حسین همواره در کمین آں بودے که انباز را از میاں بردارد ، و به یکتائی علم دارائی افرازد - از دیده وری بسگالشهاے آں نژند اندیشه ناراستی پیشه - پے بردے ، و از فرزانگی و مردانگی هیچ گاه برو نیا وردے -

ستم بجان کج اندیش می تواں کردن
خجل ز راستی خویش می تواں کردن

۱- یه رباعی گویا آینده آنے والے مضمون کی تمہید هے ۱۲

روزگارے دراز تر از رشتۂ طول امل - با ملوک طوائف درکجدار و مریز و ستیز و آویز گذشت همگنان چشم براه و گوش بر آواز داشتند تا یل اسفند یار نیرو را از کدام سو چشم زخم رسد - ویژه امیر حسین که جز بریو و غریو و رنگ و نیرنگ کار نمی کرد ، و در انبازی و دمسازی ، فتنه پردازی شعبده بازی شیوه داشت - نیرنگ سازی اقبال عدو مال صاحبقران کشورستان را نازم که هم آن گروه بے شکوه را سو بسو پاے بسنگ خوردے ، وهم این گردے دستبرد را جابجا دست از کار رفتے - صدره اتفاق افتاده است که این نفاق پیشگان خرد دشمن خون گرفته را از نژاد چغتا خان دست گرفته بر تکیه گاه خانی و مرزبانی فشانده اند و زود نه دیر شمشیر بر سرش رانده‌اند - تن هائے پیل تنان را مسند و نطع از - پ هم مهیا بود، و سرهائے سروران را ناز بالش و خشت گور از پس یکدگر آماده -

سیر ستاره و روش چرخ نیلگون
اینها کند هر آئینه در مذهب حکیم

اما من آن نیم که پسندم طریق وهم
ز اختر چه شکوه چون نبود جز خدا قسیم

نبود بجز ظهور صفات و شیون حق
صلح و نبرد و فتح شکست و امید و بیم

توقیع معنویست گر انصاف ور ستم
تشریف خسرویست گر اطلس وگر گلیم

از حق بود اضافهٔ هستی بهر صفت
جز وایه نبود آن چه به سائل دهد کریم

هم چنیں بارها امیر حسین را از درماندگی و زبونی کار سخت افتاده است، و سلطان سام هم آورد، افراسیاب همتا۔ بر لابه‌گری وے بخشوده بیاری و یاوری دل نهاده است ۔ کیں هائے نهانی امیر حسین آشکارا بود ۔ همه می دانستند ، وخدیو همه‌داں از همه فزوں تر می دانست۔ دانم که در ضمیر حق پذیر آزرم[1] ناگزیر ۔ می گزشته باشد که مگر ایں سست مهر خوهاے زشت و کردار هائے نکوهیده بگذارد ، و جهاندار را دگر بناراستی و جهانیاں را سپس به دراز دستی نیازارد ۔ آں ناجوانمرد را فرۂ ایزدی کجا که به خشم و کام نگردد، و راه دانش و داد رود ۔ در آزردن دل آزرم نداشت، ودر بردن زر شکیب، و در کشتن خلق پروا ۔

تو پارسا طلبی عاشق و من آں رندم
که مے بحلقۂ اوباش آشکار کشد

پایان کار لشکریانش از ناخوشی ستوه آمده آں جواں میر خداگیر[2] را با هر چهار پسرش گرفته آوردند، و به خداوندگار سپردند ۔ داراے نبردآزمائے را آهنگ عاجز کشی نه بود و خوں گرمی پاداش (یعنی جوش انتقام) نداشت۔ می خواست۔ بر نا بخشودنی بخشودن و گناهان نا بخشیدنی بخشیدن از نهاد اهل بزم خروش برخاست ۔ خاصه شاه محمد مرزبان بدخشاں، و شیخ محمد بیان ، سلدوز ، و امیر کیخسرو ، که ریشں هائے نو و ناسورهائے کهن داشتند ۔ زخمۂ تیز تر زدند، و بنواهائے خونچکاں خونابه فشاں فغاں بر آوردند که ما قصاص خونهاے ریخته می خواهیم نه انتقام فتنه هاے انگیخته که والی

---

۱ آزرم نا گزیر کسے که اورا ازآزرم و مروت چاره نباشد ۔
۲ خدا گیر کسے که بغضب خدا گرفتار شده باشد ۔

ولایت آں را بحل تواند کرد ۔ نا گزیر بدیں گفتار فرجام گیرودار بشرع حوالت رفت ۔ کار آگاهاں و دانش پناهاں خوں ریختن فرمودند، و سادات و علما به کشتن فتوے دادند ۔

پنداری چوں خوں گرفته اینها شنیده باشد در دل اندیشیده باشد که خود را بگریختن از هنگامه بدر برد ۔ و سپس در زاویۂ گمنامی که همسایۂ نیستی ست روزگار بسر برد ۔ ازاں جا که سلاح و سلب نداشت سراسیمه از جا رفت، و آخر گه بدر آمده بجنگ سیلی و مشت ره گریز پیش گرفت خوں خواهاں بخوں گرمی در وے آویختند ، و خونش را که بدویدن گرم شده بود گرما گرم بر زمین ریختند ۔

تو اے ندیم که مانی ز تازه روئی خویش
بسبزۂ که سر از طرف جوئبار کشد

فریب مهر ز گردوں مخور که ایں بے مهر
دهد فشار کسے را که در کنار کشد

هوائے تاج شهی هر کرا بود در سر
سرے بمدفن شاهان تاجدار کشد

پاره از احوال همایوں و شیر شاه

شیر خاں را دل دگر بود و زبان دگر، به لابه گری و فسوں گستری پیام آشتی درمیاں داشت تا چناں شد که هیچ کس را ستیزه در اندیشه نگذشتے ۔ ازاں گل و لائے که در راه پیموده بودند ، و روز و شب از رهروی ۔ نے نے از شناوری ۔ نیاسوده بودند، پیاده آزرده پاے بود، و سوار فرسوده اندام، و ستور پشت ریش ۔ فریب دوستی از دشمن خوردگاں (یعنی همایوں و لشکریانش که فریب از شیر شاه خورده بودند)

دست از غارت و تاراج غنیم کشیدند، و دم آسایش غنیمت شمردند ـ پائےها به جادۂ زه دامن آشنا شد (یعنی پا بدامن کشیده بخواب رفتند) و پیکرها چون صورت دیبا به بستر پیوند پذیرفت ـ سر از بالش بر نمی خیزد تا کلاه و مغفر را چه کنند ، و پیراهن حریر برتن گران ست تا چلقد و جوشن کجا برند ـ هوا نمناک بود، و ابر رشحه فشان ؛ تیغ در نیام زنگ بست ، و نمد زین بربارگی گران گشت ـ سپیده دمے که تیرگی تار میغ جهان را فروگرفته بود ـ هنگامه از سازان هنگام جوئے یکسره بر غنودگاں ریختند ـ شگرف سراسیمگی پدید آمد و طرفه هزاهز در لشکر افتاد ـ کلاه از کمر و پاردم از افسار نشناختند ـ از رخت خواب جسته و بر اسپاں بے زین نشسته ، پراگنده هر طرف تاختند ـ گروهے ''هرچه بادا باد'' گویاں سواره خود را بدریا زندد و هنرورے چند ساحل جویاں به شنا دست و پا زدند ، تا کداماں بزخم دم تیغ و کداماں به خم موج رود مرده باشند و کداماں از طوفان ایں دوآبه (یعنی آب تیغ و آب رود) جاں بسلامت برده باشند ـ شهنشاه بحرو بر (همایون) نهنگ دشت نورد دریا شگاف (یعنی اسپ) را از فراز ساحل در آب افگند ـ پائے از رکاب و عنان از دست و اسپ از خم ران بدر رفت و شاهسوارے که شاهاں هنگام سواری بوسه بر رکابش مے زدند ـ غوطه در آب خورد ـ نظام نام آزادۂ از آب کشان لشکر که پنهاں از خویش اقبال را چشم براه و گوش بر صدا داشت (یعنی اے آنکه خبر داشته باشد منتظر عروج و اقبال خود بود) و با خویشتن دریں اندیشه که از ساحل چون گذرد بر ساحل جا داشت ـ

هواخواهانه بداں چستی که گوئی گوئے دولت برد - خود را بآب درزد - بارے بدانست آشکارا بیناں سقائے سخت کوشے بود و به والا دید معنی آشنایان فرخ سروشے بود که جهانباں را از گرداب بدر آوردد بر جهانیاں منت نهاد -

از دستنبوه

اگرچه مرزا کی نثر میں عموماً عربی الفاظ بہت کم آتے ہیں ، لیکن کتاب ''دستنبوہ'' میں جو غدر کے حالات پر مرزا نے لکھی ہے ، التزام کیا گیا ہے کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پائے [1] - باوجود اس سخت التزام کے مرزا نے ''دستنبوہ'' میں اپنی طرز خاص اور شاعرانہ ادا اور بانکپن کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا ، چنانچہ نمونے کے طور پر دستنبوہ کے چند فقرے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں -

---

۱ مرزا غالب اس کا دعویٰ ہی کر کے رہ گئے اسے نباہ نہ سکے - مولانا حالی نے مرزا غالب کے دعوے کی بنا پر ہی یہ لکھ دیا ہے - خود مولانا حالی نے اس کی تحقیق نہیں کی ہے کہ مرزا غالب اپنے اس دعوے میں کہاں تک صادق رہے ہیں - ۱۹۵۵-۵۶ء میں سید جمیل الدین صاحب نے دستنبو کے الفاظ کا جائزہ لیا اور اپنی تحقیق کے نتائج نوائے ادب بمبئی میں بالاقساط شائع کیے ہیں - موصوف نے الفاظ کی ایک تعداد کثیر کو عربی زبان کی مشہور لغات مثلاً صحاح ، مصباح اللغات ، قاموس ، تاج العروس اور لسان العرب وغیرہ کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ وہ عربی ہیں - چند الفاظ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں - جو عربی میں اور دستنبو میں استعمال کیے گیے ہیں - بریکٹ میں کسی لفظ کی وہ تعداد ہے جو دستنو میں استعمال کی گئی ہے -

ماتم (۹) ، آه (۵) ، خنجر (۲) ، زمزمه (۳) ، شرر (۱) صاحب (۳) غوغا (۴) ، قلعه (۱) ، کیسه (۱) ، جاه (۳) : حکیم (۵) ، صغر (۱) ، کلبه (۴) ، ملکه (۱) ، هزاهز (۱) ، هزبر (۱) ، هوا (۳) وغیره

داؤدی

غدر کے اسباب

''دریں روزگار که هر زمزمه را هنجار، و هر همهمه را رفتار و هر کجا سپاہے بود از سپهدار، سخن پیوندی بگزار و بگوئے که خود روز و روزگار برگشت ۔ اخترشناسان سپہر پیمائے (یعنی منجماں) برآنند که در آں روزگار که بزم ناز یزدجرد شہریار پارس که از ترکتاز تازیان (اہل عرب) بہم خورد ۔ کیوان (زحل) و بہرام (مریخ) در خرچنگ (برج سرطان) انجمن آرائے و هنر آزمائے بودند ۔ اینک هماں پایۂ (درجه) سیزدهم از خرچنگ همچناں بہم پیوستن گاه (جائے قران) بہرام و کیواں ست، و ایں شورش و پُرخاش و جنگ و خواری و خونخواری درنگ و نیرنگ نمایۂ (ظہور) آنست ۔

دانا بدیں گفتار کے گرود؟ آں تاختن لشکرے دیگر بود از کشورے دیگر و ایں برگشتن لشکر ست از خداوندان لشکر؛ چنانکه از داستان باستان پارسیان پارس بہم نمانستن (عدم مشابہت) ایں دو ستیز و آویز هویدائی دارد ۔ دراں بار که سخن در کیش بود ۔ ایران ویراں بفرۂ و فرهنگ کیش نو (یعنی اسلام) فرجام آبادی و از بند آذر بندگی (آتش پرستی) آزادی یافت ۔ در ایں بار که گفتار در آئین ست ۔ هندیاں به چشمداشت کدام آئیں تازه شادماں باشند؟ پارسیاں رخ از آتش تافتند و بسوئے خدا راه یافتند ۔ هندیاں دامن داد گراں (یعنی اهل فرهنگ) از دست دادند و بشکنجۂ دام همدمی دداں (درندگاں) افتادند ۔ نمی بینی که از دامن تاد ام و از داد تا دد چه مایه دوری ست؛ داد آنست که آرامش (راحت) جز در آئین انگریز چشم داشتن کوری ست زخم تازیانۂ تازیاں از خوبی آں کیش فرخ (اسلام) مرهمے

داشت ، روزگار در نورد ایں خستگی (یعنی غدر) خجستگی
اگر میداشت، باز اندوہ از دوش دلہائے نژند (پریشان وتباہ)
بر میداشت ۔ اگر در اندیشۂ راز دانان
بہ ہر دانش و داد ازیں پس پیش آمدے (بہبودی) ہست ۔
بمن نشان دہند ، و بر دل اندوہگین بیم ناک سپاس نہند ۔
جہانیان با جہانبانان ستیزند ، و لشکریان خون لشکر آرایان
ریزند ، وانگاہ شادی ورزند ، و بر خویشتن نہ لرزند ۔
ہاں اے دانندگان فرزبود (حکمت الہٰی) وشناسندگان
زیان و سود ! ایں ہنگامہ بہ آتش خشم خداوند گرم ست ؛
ورنہ کارزار پارس ایں چنیں امید سوز و آرزو گداز نبود ۔''

کیفیت شورش باغیان در دہلی

''چاشتگاہ دو شنبہ شانزدہم ماہ روزہ ویازدہم مئی
سال یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ وہفت نا گرفت در و دیوار
بارہ و بار وے دہلی بجنبید و آں جنبش زمین را فرا گرفت ۔
سخن در زمیں لرز (زلزلہ) نمے رود ؛ دراں روز جہان سوز،
بخت برگشتہ و سرگشتہ چند از سپاہ کینہ خواہ میرٹھ بہ شہر
در آمدند ؛ ہمہ بے آزرم و شور انگیز ، وبخداوند کشی تشنۂ
خون انگریز ۔ دیدبانان دروازہائے شہر کہ بروں
(علاوہ) از ہمگوہری وہمتیشگی نشگفت (عجب نیست)
کہ ہم از پیش ہم سوگند نیز باشند ۔ ہم پاس نمک وہم
پاس شہر گذاشتند ، و مہمانان ناخواندہ یا خواندہ را گرامی
داشتند ۔ آں سواران سرگران سبک جلو (سبک عنان)
پیادگان تندخوے تیزدو چوں درہا باز و دربانان را مہماں نواز
یافتند دیوانہ وار ہر سو شتافتند ، وہر کرا از فرماں دہاں،
و ہر کجا آرامش گاہ آں مہماں، یافتند تا زار نگشتند و

پاک نه سوختند روے ازاں سوئے برنتافتند مشتے گدایان گوشه گیر ، از بخشش انگریزی توشه گیر که نا با تره و دوغ می خورند و در شهر دور از یکدگر پراگنده جا بجا روزگار بسر مے برند (یعنی رعایائے شهر) همه تیر از تبر ناشناسندگان و از غوغائے دزد تیره شب هراسندگاں ، نه پلار کے دردست و نه خدنگے درشست ، اگر راست پرسی ایں مردم بهر آبادی کوئے و برزن اند ، نه برائے آں کـه به آهنگ پیکار دامن به کمر زنند ، با ایں همه ازاں رو که راه آب تیز رو به خاشاک نتواں بست ، دست از چاره کوتاه دیده هر یکے در سرائے خویش بماتم نشست ۔ یکے ازاں ماتم زدگاں منم که در خانه خویش بودم ؛ چوں غریو و غوغا شنودم تا از پژوهش دم زدم ، دراں مایه درنگ که مژه برهم زدم ، آوازه بخوں غلطیدن صاحب اجنٹ بهادر و قلعه دار در ارک (قلعه) و دویدن سواراں و پیاپے رسیدن پیادگاں در راسته بازار از هر گوشه و کنار ، بلند گشت ۔ هیچ مشت خاکے نماند که از خون گل انداماں ارغواں زار نشد ، و هیچ کنج باغے نبود که از بے برگی مانا بدخمۂ نوبهار نشد ۔ هاے! آں جهانداران داد آموز دانش اندوز نکو خوے نکونام ، و آه ازاں خاتون پری چهره نازک اندام ، بارخی چوں ماه و تنے چوں سیم خام ؛ و دریغ آں کودکان جهان نادیده که درشگفته روئی بر لاله و گل می‌خندیدند ، و در خوش خرامی بر کبک و رتذرو آهو مے گرفتند ۔ کـه همه یک بار بگرداب خون فرورفتند ۔ اگر مرگ بربالین ایں کشتگاں بمویه (بگریه) خروشد ، و دربں سوگ سیاه پوشد ، رواست ؛ و اگر سپهرخاک گردد و فروریزد ، و زمیں سراسیمه چون گرد از جا برخیزد بجاست ۔

اے نونہار چوں تن بسمل بخون به غلط
اے روزگار چوں شب بے ماہ تار شو
اے آفتاب روے به سیلی کبود کن
اے ماهتاب داغ دل روزگار شو

بارے چوں آں روز تیره بشام رسید ، و گیتی تاریک تر گردید ، سیه درونان خیره کش (بخیرگی کشنده) هم در شهر جا بجا رخت تن آسانی انداختند ، وهم در ازک باغ خسروی را آخر اسپاں و نشیمن شاهی را از خواب گاه خویش ساختند ۔ رفته رفته از شهرهائے دور دست آگهی رسید که شوریدگان هر سپاه ، و در هر فرود آمدن گاه دمنزل) خون سپهبدان ریخته‌اند ۔ گروها گروه مردم را از سپاهی و کشاورز دل یکے گشت و همه بے آنکه باهم سخن رود ۔ دور و نزدیک یکدست بر یک کار کمر بستند ؛ وانگاه چساں پر زور کمرے و چگونه استوار بستنی که جز به جنبش جوش خونے که از کمر گذرد کشاد نه پزیرد ۔ پنداری ایں لشکرهائے بے مرد جنگجویان بے شمار را جاروب وار کمر بند یکے ست ۔ آرے رفت و روب هند بوم بداں ساں که آرامش و آسائش اگر جویند باندازۀ پر کاهے گاهے نیابند ، هم چنیں جاروب گیتی آشوب همی خواست ۔ اینک هزار لشکر نگری همه بے لشکر آرائے آراسته ، و بسا سپاه بینی یکسره بے سپهدار بجنگ برخاسته توپ و گلوله و ساچمه (چهرا) و بارود بهمه از خانه انگریز آورده ، و با گنجینه داراں روئے بستیز آورده ، آئین نبرد و ورزش پیکار همه از انگریز آموخته ، و رخ بکیں آموزگاراں افروخته دل ست سنگ و آهن نیست چرا نه سوزد۔ چشم است رخنه و روزن نیست چوں نگرید ؟ آرے هم

مرگ فرماندهان باید سوخت ، و هم برویرانیٔ هندوستان باید گریست ، شهرهائے بے شہریار پر بندہ هائے بے خداوند جنانکه باغهائے بے باغباں پر از درختان بردمند ، رهزن از گیرودار و بازارگا از تمغه ، خانه ها ویرانه ها و کلبه ها(دوکانها) خوان یغا آهن نیست چرا نه سوزد ـ چشم ست رخنهٔ و روزن نیست آموخته و رخ بکین آموزگاران افروخته ـ دل ست سنگ و خلهٔ انگریز آورده ـ آئین نبرد و ورزش پیکار همه از انگریز برخواسته ـ توپ و گلوله و ساچمه (چهرا) و بارود همه از بداغ مرگ فرمان دهان باید سوخت و هم بر ویرانی هندوستان بایدگریست ـ شهرهائے بے شهریار پر از بندہ هائے بے خداوند چنانکه باغ هائے بے بباغان پر از درختان نابرومند ـ رهزن از گیرودار آزاد و بازرگان از تمغا ، خانه ها و ویرانه ها ، و کلبه ها (دوکانها) خوان یغما ـ

از دیباچه ثانی درفش کاویانی

غالب خاکسار هرزه کار را از آسماں بزمیں فرستادند ؛ و فرماں دادند که دریں بیشه پیشه کشاورزی (کاشتکاری) ورزد و ایں فرازماں (فرماں) را بازماں (توقف) نه پسندد ـ ناگزیر مے بالیست (ضرور تها) کمر بستن و زمین خستن ، گاؤ راندن و دانه افشاندن ـ نادان (کشاورزی نکرد بلکه) به هوس در زمین غزل جاں کند ، و ازاں گہر ها که با خویش آورده بود ، نیمه دراں زمین پراگند ـ همانا (گویا) از هردانهٔ که کاشت هزار دانه چشم داشت ازمروارید که در خاک نهاں کنند ـ شنیدهٔ ؟ که ریشه سربرزند ـ کاش جو کاشتے تا سود برداشتے ـ دانست که همه را خاک خورد ؛ (یعنی تلف شد ناچار) نیمهٔ دیگر را پیش شاهان

روزگار بود - دیدند و پسندیدند و نه خریدند - شبے با یکے از رازدانان پژوهش (پرسش) رفت کہ در مبداء فیاض بخل نیست ؛ ابر بر باغ و راغ و سمن و دمن یکساں بارد ، چراست ؟ کہ مردم چندے نادار و اندے (چندے) تونگرند -
گفت راست گفتی توقیع سرنوشت ها یکے ست (یعنی یکسانست) جدا شناس (مابہ‌الامتیاز) اگر هست جز این نیست کہ کاروبار گروهے از هر یک بر یک ورق ، و سوز و ساز جرگۂ (گروهے) از هر کس بر یک صفحہ نوشتہ اند - آناں ورق از دفتر باخویش آوردند و برات روزی از هر در کہ مقدر بود بردند - ایناں ازاں رو کہ انفکاک صفہ از ورق صورت نہ بست تہی دست آمدند و تہی کیسہ زیستند - گفتم از چیست ؟ کہ در چار سوئے دهر - ع

بخت صلہ مدح و قبول غزلم نیست

گفت آں ازیں ست کہ برات (چٹھی یا چک) نیاوردۂ و ایں ازآنست کہ سخنہائے بلند داری ، و بہ ناشناسا زباں (یعنی اجنبی زبان) حرف می زنی - گفتم چہ کنم تا از اندوہ باز رہم؟ گفت شکیب ورز ، و خوں‌گری ، و آں چہ از شیخ حزیں شنیدۂ می‌گوے -

کس زباں مرا نمے فہمد
بہ عزیزاں چہ التماس کنم

نشاں دادن اغلاط برهان قاطع سپاس می خواست نہ ستیز ؛ در قلمرو هند کس نماندہ باشد کہ مرا بدین نیکی بد نخواندہ باشد - یکے خنجر آورد کہ من قاطع[1] قاطع برهانم ؛ دگرے اخگر آورد

---

۱ - جو کتابیں قاطع برهان کے جواب میں لکھی گئی هیں ان میں سے ایک کا نام قاطع قاطع اور ایک کا محرق قاطع رکھا گیا تھا -

که من محرق آنم - کیست تا از من بدان جوان مردان گوید که از دریدن و سوختن کاغذ جز فغان و دخان چه خیزد ؟ بزه‌مند (گنهگار) منم ؛ اگر در آتش فگنند ور به تیغ دونیم زننده بهر دو گزند درخورستم (یعنی لائق هستم) و بهر دو سزا سزاوار——— .

سخندان راستی جوے را بایسته آن که از هر کتاب فرهنگ عبارت جامع آن را بدان نگاه تیز نگرد که از بس تیزی در جوهر لفظ فرود رود تا چگونگی پیوند الفاظ که انگیزش گاه معنی ست آشکار شود - هرگاه آن را بهنجار اهل زبان نه بیند - داند که در سودائے زبان دانی جز زیان نه بیند

دگران دانند و کارآنان ؛ مرا نیز خردے و روانے داده اند - فراز آوردهٔ (پیش آورده) اندیشهٔ بیگانگان راچون پزیرم ؟ و از نیروے خرد خداداد کار چرا نگیرم ؟ هستی‌بخش را سپاس که نیروفزائے دانش من دانشمند[1] کسے ست که اگر چنانکه رازدان بود - رازگوے نیز بودے ششمیں ساسان[2] بشمار آمدے -

ز خویشان به بیگانگی شادمانم
نمانم بکس چون بکس مے نمانم
غریبم ولے روشناس عزیزان
چنار سرافراز در بوستانم

---

۱ - مراد ازاں مولانا عبدالصمد استاد میرزا ست-

۲ - ساسان نام پسر بهمن بن اسفندیار بود که از پادشاهی سیاحت وتحصیل‌حکمت و ریاضت پرداخته و سه ۳ کس از اولاد وے‌نیز برطریقه وے بوده اند و ایں هرچهار را ساسان اول و دوم وسوم و چهارم نامیده اند من بعد پس از خسرو پرویز ساسان پنجم بظهور آمده که دساتیر را از لغت ژند در زبان دری ترجمه کرده - ۱۲

گرفتم که از تخم افراسیابم
گرفتم که از نسل سلجوقیانم
دل و دست تیغ آزمائی ندارم
ره و رسم کشورکشائی ندانم
بمیدان معنی خداوند رخشم
بمضمار پهلو زبان ـ پهلوانم
دو سی سال توقیع معنی نوشتم
سزد گر نویسند صاحبقرانم

قاطع برهان ـ که صنعت نقشبند خیال من ست ، نه نامهٔ اعمال من ست که دراں جہاں بمن خواهند سپرد ـ هم دریں جہاں خواهد ماند در دل فرود آمد که بمقامے چند کلامے چند بفزایم ، وایں مجموعه را ، که قاطع برهان نام نهاده ام ـ سپس درفش کاویانی خطاب دهم ـ

نازم بخرام کلک و طرز رقمش
مانا ست ز تیزی بدم تیغ دمش
چوں اسم کتاب قاطع برهان بود
گردید درفش کاویانی علمش

حاشا که در هیچ محل از عقیدهٔ خویش رجوع کرده باشم ـ سرودن سخنهاے ریزه (متفرقه) جز افزون هوش انگیزه (سبب و باعث) ندارد ـ یاراں جفا کنند ، و من به ازائے هر جفا (بعوض هر جفا) وفا ورزم ـ همانا نکوئی وبهی یاراں خواهم و بس ـ بند نهند ، پند دهم ـ داد دریغ دارند ،

اندرز دریغ ندارم ۔ سنگ زنند ، ثمر بارم ۔

از تقریظات و دیباچہ ہائے

مرزا نے جو تقریظیں یہ چھاپہ اور اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں پر نثر میں لکھے ہیں اُن میں ، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ، شاعری کا عنصر نظم سے بمراتب غالب تر پایا جاتا ہے ۔ ہر ایک معمولی بات کو تمثیل اور استعارے کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں ، فقروں اور اُن کے اجزا میں عموماً ایک خاص قسم کا وزن اور تول اور اکثر سجع کی رعایت ملحوظ رکھتے ہیں ، اکثر جگہ صفات متوالیہ و متتابعہ ایراد کرتے ہیں اور صفات مرکبہ جو نظم کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں ، اکثر استعمال کرتے ہیں ، پس سوا اس کے کہ یہ نثریں شعر کے اوزان مخصوص سے ، جن کو اُس کی ماہیت میں کچھ دخل نہیں ، معرا ہیں ، ہر ایک اعتبار سے اُن پر شعر کی پوری تعریف صادق آتی ہے ۔

چونکہ یہ نثریں مرزا نے اپنے عالی دماغ اور نکتہ سنج معاصرین کی ضیافت طبع کے لیے لکھی ہیں اور اُن میں اپنی نو آئین طرازی اور نادرسنجی کا ، جیسا کہ چاہیے ، حق ادا کیا ہے اس لیے جب تک کہ اُن کے ایک ایک فقرے کی شرح نہ کی جائے عام ناظرین ان سے کچھ لطف نہیں اُٹھا سکتے اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ کتاب کا حجم زیادہ بڑھ جائے گا جس کی وجہ سے کتاب کا مطالعہ ناظرین پر شاق گزرے گا ، لہذا اُن نثروں میں سے صرف اس قدر انتخاب کیا جائے گا جس سے مرزا کی ان جزیل اور گراں مایہ نثروں کا کسی قدر اندازہ ہو سکے ۔

اس غرض کے لیے ہم اول بطور مثال کے مختلف مقامات سے مختلف مضامین کے کچھ فقرے لکھ کر دکھاتے ہیں کہ مرزا کس طرح معمولی باتوں کو تمثیل اور استعارے کا لباس پہنا کر بلند منظر پر جلوہ گر کرتے ہیں ؛ مثلاً کتاب ''پنج آھنگ'' کا دوسرا آھنگ جو مرزا نے اپنے نسبتی بھائی علی بخش خاں کی خاطر سے لکھا ہے اور جس میں اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف زبان فارسی کے متعلق کچھ ابتدائی قواعد اور ھدایتیں قلمبند کی ہیں ، اُس کے اول میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں طرح طرح سے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس پھیکے اور سیٹھے مضمون پر کچھ لکھنا میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے ۔

وھاں ایک جگہ مضمون مذکور کی نسبت لکھتے ہیں ''زمینے شور کہ چوں ذوق مے در طینت زاھد ۔ ھیچ گلبن را درآنجا ریشہ در خاک نہ دود ۔ و خاکے نا استوار کہ ھر دیوار کہ دراں ریگستان بر کشند پیش از سایہ خود بخاک افتد'' ۔

فارسی دیوان کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو کہ دیوان مذکور اور اُس کے نوادر افکار میں آورد اور تصنع یا کسی اُستاد کی بلا واسطہ تعلیم اور ھدایت کو مطلق دخل نہیں ہے ، اس طرح ادا کرتے ہیں ''بنامیزد (یعنی چشم بد دور) نخستیں نقابے ست از روے شاھد ھر ھفت کردۂ معنی بجنبش نسیم بر افتادہ ؛ یعنی ننگ کشاکش دست نا کشیدہ باز پسیں چراغیست از گرمی چراغان نیم سوختہ پہلو رخ بافروختن دادہ ؛ یعنی داغ منت خس نادیدہ'' ۔

ایک جگہ اس مطلب کو کہ خدا تعالیٰ نے مجھے جیسا دماغ معنی خیز دیا تھا ویسا معنی کی قدروقیمت پہچاننے اور اُس کے بیان کرنے کا ملکہ بھی عنایت کیا ، اس طرح بیان کرتے

ھیں ''سخن آفرین خدائے گیتی آرائے را ستایم کہ تا نہانخانۂ ضمیرم را از فراوانی رنگا رنگ معنی بہ لعل و گہر نباشت ، بازویم را ترازوی مرجان سنجی و خامہ ام را ھنگامۂ گہر پاشی ارزانی داشت'' ۔

اب ھم کچھ کچھ عبارتیں دیباچوں اور تقریظوں سے انتخاب کرکے ھدیۂ ناظرین باتمکین کرتے ھیں ۔

از دیباچہ دیوان فارسی

دیوان فارسی کے دیباچے میں ایک جگہ اس مطلب کو کہ لوگ مجھے اکتسابی علوم سے بے بہرہ سمجھ کر میرے حسن بیان پر تعجب اور میرے کمال سے انکار کرتے ھیں ، اس طرح بیان کرتے ھیں ۔ ''لائے خم میخانہ سرمدی نسبت ناچشیدگاں ۔ سگالند کہ ھیچمدانے را ایں مایہ سیرابی نطق از کجاست ؛ غافل کہ نم رشحۂ یک فیض ست کہ سبزہ را دمیدن ، ونہال را سر کشیدن ، و میوہ را رسیدن ، و لب را زمزمہ آفریدن آموخت ۔ و بہ پرتو مہتاب ازلی ھدایت شب‌گیر نکردگان ۔ اندیشند کہ تیرہ سر انجامے را ایں ھمہ روشنائی گفتار چراست ؛ بے خبر کہ فرۂ تابش یک نورست کہ شمع را بشعلہ ، و قدح را ببادۂ و گل را برنگ ، و دروں را بسخن برافروخت ....
داغم از کوتہ‌نظران تنگ چشم کہ دمیدن تازہ گل از گیاہ ، و درخشیدن برق بشب ھائے سیاہ ، شگفت ندارند ؛ و جنبیدن زبانہائے گویا بہ سخن ھائے نغز دشخوار انگارند ، غنچہ مشکیں نفس ست ، و باد غالیہ سائے ، و گل کشادہ روئے ، و بلبل نواسنج ؛ زباں چہ گناہ کردہ است کہ سخن سرائے نباشد ۔ مہر جلوہ برتابد و ذرہ بیتابی ، و بحر روانی ، و قطرہ اشتلم ،

دل را کہ گفتہ است کہ از شورش ستوہ آید۔ همانا بدانست این گروہ بادہ در خمخانۂ توفیق ہماں قدر بود کہ حریفاں گذشتہ را تردماغ ساختہ ؛ حالیاً بساط بزم سخن برچیدہ ، و جام و سبو بر سر ہم شکستہ ، و ازاں قلزم‌قلزم راوق نمے برجائے نماندہ ، پندارند۔ کاش بانجمنے ، کہ من در فرودیں ردہ (یعنی صف پائیں) بہ حلقۂ اوباش قدح می‌گیرم فرارسند تا وارسند کہ مے فراوانست ، و ساقی بے دریغ بخش پیمانہ ہا جرعہ ریزست ، ولبہا العطش‌گوئے۔ وللہ در من قال۔

هنوز آں ابر رحمت در فشان ست
مے و میخانہ با مہر و نشان ست

آرے صہبائے سخن بہ روزگار من از کہنگی تند و پرزورست ؛ و شب اندیشہ را بہ فر دمیدن سپیدۂ سحری برات فراوانی نورست۔ ہر آئنہ رفتگاں سرخوش غنودہ اند و من خرابستم پیشینیاں چراغاں بودہ اند و من آفتابستم۔‘‘

اس کے بعد ایک جگہ اپنے تمام فخر و مباہات پر افسوس کر کے اس طرح لکھتے ہیں ’’انصاف بالائے طاعت است۔ در ہوائے کہ بال بالا خوانی (یعنی خود ستائی) زدہ‌ام و در ادائے کہ خود را بشگرفی ستودہ‌ام ، نیمۂ ازاں شاہد بازی ست ؛ یعنی ہواپرستی و نیمۂ دیگر توانگرستائی یعنی بادخوانی۔ بیداد بیں کہ ہر جا بشانہ خمے از زلف مرغولہ مویاں کشودہ شود۔ بلا در من آویزد ؛ تا دل بہ پیچاک آں شکن بندمے و خواری نگر کہ ہرگاہ از خود غافل و از خدا فارغے بر اورنگ سروری کج نشیند۔ ہوس مرا انگیزد تا بہ پیشش بندہ وار راست استمے۔ شادم از آزادی کہ بسا سخن بہنجار عشق‌بازاں گزاردستم ؛

و داغم از آزمندی که ورقے چند بکردار دنیا طلباں در مدح اهل جاه سیاه کردستم ؛ دریغا که عمر سبک سیر لختے به چامه‌وچنگ سرآمد و پارهٔ بدروغ و دریغ رفت ۔ فرجام گراں خوابی برنخاست ؛ و آشوب هوس ناکی فرو نه نشست ۔“

از خاتمه دیوان فارسی

خاتمۂ دیوان فارسی میں اس بات کا عذر، کہ دیوان کی تکمیل میں کیوں اس قدر دیر لگی کہ اکتالیس برس کی عمر میں اس کے چھپوانے کی نوبت پہنچی، اس طرح کرتے ہیں کہ فکر نہایت خود سر اور بلند پرواز تھی اس کی روک تھام میں بہت سا زمانہ گزر گیا اور اس مطلب کو اپنے طرز خاص میں یوں ادا کرتے ہیں ۔

”هاں دهان رخشے بداں توسنی که عنانش موئے ومشامش بوئے برنتافتے و از شموسی (سرکشی) گام بدرازی نهاده جز به پنهانه شتافتے ۔ از ترسنده دلی عنانش کشیده و به لابهٔ آواز بوسه اش آرمیده داشتمے ۔ چوں پارهٔ از راه‌بدیں گونه که برشمردم، بریده شد، و روز بلند گشت، هم جوش تندی توسن فرونشست، و هم دست و پائے سوار از عنان و رکاب خستگی پذیر آمد ۔ تاب مهر نیمروز ۔ مغز سر سوار گداخت و تفتگی ریگ بیاباں نعل در پائے تگاور نرم کرد ۔ رایض را دم و کره را قدم بگذار آمد ۔ هم آں به آخر گرائید، و هم ایں ر به بستر نیاز آمد ۔ توانائی به چاره سگالی توسنی سر آمد ؛ و در هنگام گسسته دمی خستگی روئے آورد ۔

کیست تا از من پرسد؟ و اگر نا پرسیده گویم در دلش فرود آید که دریں سی سال همت را با فطرت چه آویزش ها (یعنی جنگ ها) روئے داده ؛ و پس ازانکه ۔ کار بداں

جا رسیده که همدگر کوفتگی فرومانند ۔ بمیانجی گری توفیق بکدام قرارداد آشتی اتفاق افتاده خامه دیر جنبش بود و شوق زود گرائے (جلد باز) گفتارها از نہیب دورباش اندیشه بدر از نائے فاصلۂ دل و زبان خون شد و اگر نه گه از دل بزبان رسید ۔ والا بسیچی همت آن را بخامه نسپرد ۔ هر چند منش (طبیعت) که یزدانی سروش ست در سرآغاز نیز گزیده گوئے و پسندیده جوئے بود ۔ اما پیشتر از فراخ روی (یعنی بسبب آزاد روی) بے جاده نشناسان برداشتے و کثری رفتار آنان را لغزش مستانه انگاشتے ۔ تا همدران تگاپو پیش خرامان را بخجستگی ارزش همقدمی (یعنی لیاقت همراهی خویش) که در من یافتند ۔ مهر بجنبید و دل از آزرم (مروت) به درد آمد ۔ اندوه آوارگیہائے من خوردند و آموزگارانه در من نگرستند ۔ شیخ علی حزین بخندۂ زیر لبی بیراهه رویہائے مرا در نظرم جلوه گر ساخت و زهر نگاه طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آن هرزه جنبش هائے ناروا در پائے ره پیمائے من بسوخت ۔ ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس (تاثیر کلام) حرزے ببازو و توشۂ بکمر بست و نظیری لا آبالی خرام بہنجار خاصه خودم بچالش (رفتار) آورد ۔“

از دیباچه دیوان تفته

دیوان تفته کے دیباچے کی تمہید میں ضعف و انحطاط قوی اور اپنے قلب ماهیت کو اس طرح بیان کرتے هیں ۔ ”هاں اے غالب تیره روز وژم اختر! که بدیں هستی و کسائی (شخصیت) که تراست ۔ بداں مانی که دانی در عالم فرض محال سپندے دیده ایم بر آتش آرمیده ۔ الله الله! چه مایه

جوش سوداست (یعنی غلبه مـاده سودا) کـه هر نفسے کـه مے کشی - چوں خطے که از نقطه بر آورند - همرنگ سویدا ست آں قلمرو اندیشه - که از روانی خامه و روائی گفتار آب و هوا داشت ، دے مہش را فرودیں پرستار بود ، و چاشت گہش را نسیم سحری پیشکار - بدیں ناخوشی و نژندی ویراں چراست - سبزه را چه افتاد که به چمیدن دل از دست تماشائیاں نبرد ، و غنچه را چه روے داد که به دمیدن پردۂ شکیب نظارگیاں نه درد -

آں اثر پردۂ سـازت چـه شـد
زمزمۂ خـاره گدازت چـه شـد

آں ز جنوں پرده کشـایت کو
ولولـۂ سـلسـلـه خـایت کو

آں نفس نـاله کمندت کجاست
واں نگه جلوه پسندت کجاسـت

گفتی (یعنی در جواب گفته) که سوز غم دود از دل برآورد، و گداز نفس آذر در زباں زد - با دلے که هر آئینه نگداخت ، و با زبانے که همانا نسوخت ، عذر غمزدگی مسموع نیست - بیا تا همیں دل بد زهرۂ الحذر نوائے را بسخن نہیم ؛ و همیں زبان کژ نغمه این المفر سرائے را بگفتار آریم - (یعنی طوطاً و کرهاً تقریظ دیوان تفته برنگاریم) -

ز مـن جوئے در بد نکو زیستن
جـگر خوردن و تازه رو زیستن

سمن چـیدن و در ره انـداخـتن
دل افشردن و در چـه انداختن

(مراد از سمن چیدن و در رہ انداختن آنکه بر همگنان اظہار خوش حالی می کنم و اندوہ درونی را کہ دل افشردن عبارت ازاں ست در چاہ می اندازم تا بر ہیچ کس ظاہر نشود) ۔

روان کــردن از چشـم همواره خــون
بــه شــورابــه شستن ز رخساره خون
شـگفتن ز داغــے کـــه بر دل بــود
نهفتن شـــرارے کـــه در دل بــود

ستایش سخن چشم بد دور خمکدۂ سخن را شرابے ست پرزور کہ زمین ازاں بہ لائے (یعنی بد روئے) و سپہر ازاں ببوئے آں چناں برقص آید کــه اگر کعبه را حجرالاسود از دیوار و مشتری را عمامه از فرق فرود افتد ۔ شگفت ننماید،، ۔

انتخاب از مکاتبات

از تقریظ تذکرہ گلشن بے خار

مرزا کی نثر فارسی کا سب سے بڑا حصہ اُن کے مکاتبات و مراسلات ہیں جن میں سے اکثر بہت صاف اور سلیس ہیں اسی لیے ہم اس حصے میں سے بہ نسبت اور نثروں کے کسی قدر زیادہ انتخاب کریں گے اور جہاں تک ہو سکے گا مشکل فقروں اور دقیق عبارتــوں کے نقل کرنے سے احتراز کــیا جائے گا اور نیز جو امور مرزا کے خــانگی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اُن کو بھی چھوڑ دیا جائے گا ۔

مرزا علی بخش خاں فیروز پور جھرکے میں ہیں نواب احمد بخش خاں کا انتقال ہوگیا ہے اور اُن کی جگہ شمس‌الدین خاں مسند نشین ہوئے ہیں، مرزا ۔ علی بخش خاں کو کلکتے پہنچ کر خط لکھا ہے ، اُس میں لکھتے ہیں :

''میر فضل مولی خاں نام یارے داشتم ؛ او را نا گرفت (ناگہ) در عرض راہ مرشد آباد یافتم در نورد گفتگوہائے و پرس وجوہائے کہ رفت۔ از جامہ گذاشتن (یعنی از مردن) فخرالدولہ بہادر بمن خبرداد ؛ و باز بہ کلکتہ مرزا افضل بیگ و دیگراں برگفتند۔ آوخ ! کہ چراغ روشن ایں دودمانی مرد ، و شبستان آرزوہا تیرہ و تار شد۔ از جانب شما اندیشناکم ؛ و دانم کہ آنچہ شما را پیش آید دل خواہ نباشد۔ ناکساں را روز بازار خواہد بود ؛ و فرومایگاں را گرمی ہنگامہ۔ زودا کہ انجمن از ہم پاشد ؛ و پراگندۂ چند گردآیند دولت روئے گرداند ؛ و آسودگی بر خیزد۔ زینہار ہوشمندی را کار بایدبست ؛ و ہموارہ بخود نگراں باید بود' ۔

ایک اور خط کو جو علی بخش خاں کے نام لکھا ہے ، اس طرح شروع کرتے ہیں ''جان برادر ! سخن را از فراوانی برروئے ہم افتادن ست ؛ و گرہ درگرہ گردیدن ۔ و من آں مے خواہم کہ اندک گویم ، و سود بسیار دہد ، وشنوندہ را آں زود دریابد۔ و ایں بسیچ (قصد) روائی پذیر نیست مگر آں کہ گویندہ دراں کوشد کہ نبشتن از گفتن آں مایہ دور تر نہ رود کہ سر ایں ہر دو رشتہ باہمدگر نتواں تافت ؛ و نقش یکے در آئینۂ دیگرے نتواں یافت۔ زمانے گوش بمن دارید و فرا رسید کہ چہ مے گویم ، و ازیں گفتن چہ مے خواہم و شما را در برابر آں چہ می باید کرد ، و اندازۂ آں بایست تاکجاست'' اس کے بعد کچھ خانگی معاملات تحریر کئے ہیں۔

میر اعظم علی اکبر آبادی مدرس مدرسۂ اکبر آباد جو

میرزا کے هم وطن هیں اور انھوں نے بیس برس کے بعد مرزا کو خط لکھا ہے اور خط نہ لکھنے کی شکایت کی ہے، اُن کے خط کا جواب اس طرح لکھتے ہیں :

امروز شرارۂ بداغم زده اند
نشتر به رگ صبر و فراغم زده اند
از کثرت شور عطسه مغزم ریش ست
تا عطر چه فتنه بر دماغم زده اند

جنبش خامۂ عیسوی هنگامۂ مطاع مکرم مخدوم اعظم را نازم که به احیائے هوس هائے مرده ساحت خاطر را عرصۂ محشر ساخت، و بازار رستخیز گرم کرد ۔ خار خار دیرین آرزوها سر از دل بدر آورد؛ بیاد آمد که مرا هم در گیتی وطنے، و از مهربانان انجمنے بوده است ۔ چون نشتر پرسش بمغز اندیشه فروبرده اند (یعنی احوال پرسیده اند) خونچکانی نواها تماشا کردنی ست ۔ درازی زمان فراق ۔ که بگمان مخدوم شانزده سال ست و بدانست نامه نگار کم از بست۲۰ سال نیست سر تیز کزلکے بوده است که نقش آسایش از صفحه خاطر بدان سترده اند ۔ آغاز ورود بدهلی ۔ که در بادۂ غفلتے به قدح داشتم (یعنی بقیۂ هوا و هوس در سر بود) لختے از عمر به پیمودن جادۂ کامرانی هوس گذشت، و بے راهه خرامیده شد ۔ تا سر از مستی بگردید (یعنی بدمستی سے پھر گیا) و اندران بےخودی پائے مصطبه پیما به گوے فرو رفت (گڑھے میں اتر گیا یعنی ایک ایسا صدمه پهنچا که نشے هرن هوگئے) لاجرم درهم شکسته سراپائے، دگر اندوده سر و روے برخاستم ۔ هنگامۂ دیوانگی برادر یک طرف، و غوغائے دام

خواہاں یک سو ؛ آشوبے پدید آمد کہ نفس راہ لب ، و نگاہ روزنۂ چشم ، فراموش کرد ؛ و گیتی بدیں روشنی روشناں در نظر تیرۂ و تار شد ۔ بالیے از سخن دوختہ ، و چشمے از خویش فروبستہ ۔ جہاں جہاں شکستگی ، و عالم عالم خستگی با خود گرفتم ۔ و از بے داد روزگار نالاں ، و سینہ بر دم تیغ مالاں ۔ بکلکتہ رسیدم ۔ فرماندھاں سر بزرگی و کوچک دلی (یعنی مہربانی و شفقت) کردند ، و دل را نیرو بخشیدند ۔ آں ہمہ بخشایش ۔ کہ مشاہدہ رفت ۔ آمید کشایش آورد ؛ و ذوق آوارگی و ہوائے بیاباں مرگی ۔ کہ مرا از دھلی بدر آوردہ بود ۔ بدل نماند ۔ و ہوس آتش کدہ ھائے یزد و مےخانہائے شیراز ۔ کہ دل را بسوئے خود مے کشید ، و مرا بہ پارس می خواند ۔ از ضمیر بدر جست (یعنی بمشاہرہ شہر کلکتہ جملہ ہوس ھا از خاطر بدر رفت) دو سال دراں بقعہ مجاور بودم ؛ چوں گورنر جنرل آہنگ ہندوستان کرد پیشاپیش دویدم ، و بدھلی رسیدم ۔ روزگار بر گشت ، و کار ساختہ شدہ ۔ صورت تباھی گرفت ۔ اکنوں ششمیں سال ست کہ خانماں بباد دادہ ، و دل بر مرگ ناگاہ نہادۂ بکنجے نشستہ ام ؛ و در آمیزش بروئے بیگانۂ و آشنا بستہ ۔''

''من اگر با ایں ہمہ رنج و اندوہ ۔ کہ پارۂ ازاں بازگفتم در نگارش نامۂ و سپارش پیام کاھل قلم و کوتاہ دم باشم ، و بزرگن وطن را بیاد نیارم ؛ در عالم انصاف بزہ‌مند نیستم ۔ اما گراں‌مائگاں جہان مہر و وفا ۔ کہ از دورافتادگاں نپرسند و از مرگ و حیات دوستاں باز نجویند ۔ اگر گفتگو بمیان آید و سمند شکوۂ عناں بر عناں (یعنی بمقابلۂ یک دگر) تازد گوے دعوے چگونہ خواھد برد ، و قطع نظر از حریف آب دنداں

(یعنی حریف مغلوب) کہ منم خداے توانا را چہ جواب خواہند داد۔''

''کس از اہل وطن غم خوار من نیست
مرا در دہر پنداری وطن نیست''

مولوی نور الحسن نامی ایک نوجوان نے کلکتے سے مرزا کو خط لکھا ہے اور اس کے ساتھ ایک نثر کا مسودہ اصلاح کے لیے بھیجا ہے۔ اس کے جواب میں جو خط مرزا نے لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں۔ ''پدید آمد کہ خاطر عاطر را بجانب نثر گرایشے، وہمنگامہ ایں گفتار (یعنی نثر نگاری) را در آنجا (در کلکتہ) آرایشے ہست۔ بارے ہم دل بہ پسندیدہ شغلے نہادہ آید، وہم اندریں فن گزیدہ روشے پیش گرفتہ آید۔ دم سردی شما (یعنی کم شوقی شما)۔ بہ دانش آموزی آنچہ دیروز (یعنی در زمانہ گزشتہ) نہ کلکتہ دیدہ ام۔ یاد میکنم؛ وخون گرمی شما (یعنی سرگرمی شما) در خرد اندوزی آنچہ امروز مےنگرم خود را بدیں شاد می کنم۔ ہمانا در اندیشہ نہالے برہگذر دارم بداں زودی۔ کہ ثمر از شاخ افتد۔ نخلے شدہ، و رطب بار آوردہ؛ نے نے بہنگازمہ یوسفی در نظر دارم بداں خوبی کہ دل از فرشتہ رباید از بند حجاب بدر آمد، و ہر ہفت کردہ۔ خواستہ آید کہ مسودہ نثر در ہر ماہ بمن فرستید، و من آں را نگرستہ، ونشست ہر کرشمہ و انگیز ہر بذلہ را ببائستگی آراستہ بہ شما فرستم۔ صاحب من! مگر ندانستہ آید کہ گفتار جز بگفتار سرہ نگردد، و سخن جز بہ سخن شناختہ نشود۔ ہر چند ارادت شما ذریعہ سعاوت من وخرسندی شما موجب رضامندی من ست۔ لیکن تحریر درمیاں نگنجد، وبمیانجی گری خامہ کار برنیاید۔

آرے نگارش یکدست ست وگفتار لخت لخت۔ ستردن یک لفظ از میانـــہ ، و آوردن لفظ دیگر بجـــاے آں بر نشانہ ۔ دانا شناسد کہ چہ مایہ گفتکو وچہ قدر پرس و جو دارد ۔ و حق ایں پرسش نتواں گزارد ۔ مگر بہمزبانی ۔ دریں نزدیکی یکے از برادراں ۔ کہ در برادراں از وے عزیزترے نیست سخنہائے پراگندہ مرا کہ عبارت از نثر ست ۔ گرد آوردہ ، وصورت سفینہ دادہ است ۔ زیں پس آں مجموعہ پریشانی را پیش شما مے فرستم ؛ تا دستمایہ سگالش در سخن و باز نمائندۂ اندازہ نکوئی فن تواند بود'' ۔

نواب مصطفی خان مرحوم نے (جب کہ مرزا سے نیا نیا تعارف ہوا ہے) مرزا کو خط لکھا ہے اور اس میں، اُن کی شاعری اور نکتہ سنجی کی بہت تعریف کی ہے ، اپنے نتائج افکار میں سے کچھ اُن کو بھیجا ہے اور اُن کے تازہ غزلوں کی جو حال میں لکھی ہوں ، درخواست کی ہے ، مرزا نے اُس کے جواب میں جو ایک طولانی خط لکھا ہے ، اُس میں ایک لمبی تمہید کے بعد لکھتے ہیں ۔

''تا دکانم در کشادہ بود ، و رنگ رنگ متاع سخن بروے ہم نہادہ ، کس از مشتریاں حلقہ بردر نزد ، و سودائے خریداری از ہیچ دل سر برنزد ۔ چوں دکاں را کالا ، و زباں را حرفہائے جگر آلا (یعنی آلودہ بخون جگر) نماند ۔ روزگار گرانمایہ خریدارے (یعنی نواب مصطفی خان) پدید آورد کہ نقد رائج سخن خود را بہ بہاے گفتار ناسرہ من می دہد ؛ وگوہر را بہ پلہ بیعانگی خزف می نہد . . . . ہاں وہاں اے خریدار دکان بے رونق ! از فراوانی مسرت ور ود مسعود ہمایـــوں نامـــہ چـــہ گویم کـــہ مرا ۔ با آنکہ نکوئی

خواه خویشم - برمن به رشک آورد - حوصله مرا که فرسوده غمہاے دہرم - گنجائی ایں مایہ شادی کو ؟ واندیشہ مرا۔ کہ دل شکستہ دور باش یارانم - فرجام پذیرائی ایں ہمہ قبول کجا ؟ روزگار را از آزار خویش چگونہ پشیماں گیرمے کہ ایں چنیں شادی را بخود در پذیرمے و دوستاں را تا کجا قدرناشناس پندارمے کہ از شمار ایں قدر ستایش دوبارہ خویش باور دارمے - حقا کہ نہ آساں ست ستودہ شدن بہ زبان شیوہ بیاناں (یعنی فصحا و دشوارتر ازانست اندازہ نمائی باندازہ داناں ،،۔

''قبلہ مزد چہل سالہ جگرکاوی آنست کہ فراہم آوردم ؛ وبر فرق فرقداں سائے افشاندم - (یعنی مجموعہ نظم فارسی) اکنوں آبم بداں روانی و آتشم بداں گرمی نیست - گوئی پس از سخن آں گنج گنجداں رفتہ و از سخن ہر چہ ازل آورد من بود گفتہ شد ....

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے تذکرہ گلشن بےخار کا مسودہ مرزا کے مطالعے کے لئے بھیجا ہے اس کو دیکھ کر مرزا نے نواب صاحب کو خط لکھا ہے ''من کہ زبانم در ستائش بیقرار است و اندیشہ در سگالش (مشورہ) گستاخ امید کہ دراں پایہ بزمرۂ خوشامدگویاں شمردہ نشوم ، و بدیں مایہ جرأت بزہ مند نگرم - بنامیزد (چشم بد دور) تذکرۂ ترتیب یافتہ و مجموعۂ فراہم آمدہ کہ پیش طاق بلند نامی را نقش و نگار است ، و نہال نکوسرانجامی را برگ و بار - رہرو نظر چوں بہ بیداے کنار ناپیدائے ذوق سخن گام تماشا بردارد و توشۂ بہ ازیں بر کمر نتواند

بست - خضر باں همه جگر تشنگی که سکندر داشت - لبش برشحۂ آبے تر نتوانست کرد ؛ و آں آب از دریا بخشیدن بود - شما گروهے را از دور و نزدیک به سخن زندگانی جاوید بخشدید ؛ و ایں لختے از عمر بکار دیگراں کردن است جاوداں زنده باشید که سخن گویاں از شما زندۂ جاوید شدند - و همگناں رابه نکوئی نام برآمد - بارے گهر نه سفتن خامه و گوهرین نه گشتن نامه در ردیف الف به نگارش اشعار پرویں‌نثار حضرت آزرده[1] از چه روست ؟ هر چند ذکر خدام برجیس مقام در جریدۂ ایں فن نه سزاوار شان فضیلت باشد لیکن اگر بمقتضائے فرط محبت جرأتے بکار می رفت گناهے نه بود؛ و در تلافی آں به پوزش نیاز نمے افتاد،،

حکیم احسن الله خاں مرحوم نے مرزا سے جب که وه کلکتے میں مقیم هیں خواهش کی هے که اگر آپ نے اپنی کچھ نثریں جمع کی هوں تو بهیج دیجئے - اس کے جواب میں مرزا لکھتے هیں -

"درد مند نوازا ! نسیم وردد مشکیں رقم نامه غنچۂ ایں راز را پرده کشائے ، و شمیم ابں نوید را غالیه‌سائے آمد - که روزگار به کزلک مد طول زمان فراق نقش بے اعتباری هاے من (از صفحۂ خاطر احباب نه سترده و ترکتاز صرصر بیداد جدائی خاکساریهاے مرا زیاد عزیزاں نبرده است "

"در معرض طلب نثر فرومانده تر ازاں میزباں

---

۱ - اول مسودے میں مفتی صدر الدین خاں مرحوم متخلص به آزرده کا ذکر نهیں کیا گیا تھا مگر مرزا نے جب یه خط لکھا تو نواب صاحب نے ان کا تذکره بھی درج کر دیا ۱۲ -

بے دستگاہم کہ ناگرفت (اچانک) مہمانے عزیزش از راہ دور دررسد ، و بیچارہ بسابگرد سرا پائے سرمایۂ خویشتن بگردد ۔ تا شوربائے دودپختے و نان کشکینے (یعنی نان جویں) فراز آرد من و ایمان من کہ بگرد آوردن نثر پراگندہ نپرداختہ و خود را دریں کشاکش نینداختہ ام ۔ چہ پیدا ست کہ فروریختۂ کلک ایں کس (یعنی من) نقشے ست نژند ، (یعنی زشت) یا رقمے ست فرہمند (یعنی خوب) در صورت اول چہ لازم ست خود را بہیچ فروختن ، و وبال نظارۂ آیندگاں بہ سلم خزیدن ، و در شق ثانی اندیشہ مے سنجد کہ رفتگاں چہ بردہ اند گزشتگاں چہ یافتہ کہ ما را از روئے آں وایہ (یعنی دریوزہ) بیتاب دارد ۔ انصاف بالائے طاعت است ۔ بدعوئی گاہے کہ توانائی قتیل را بفروهیدگی فرہنگ (یعنی بہ پسندیدگی روش) مسلم داشتہ ، ولوائے نورالعین واقف بشیوائی شیوہ (یعنی بخوبی طرز) بر افراشتہ باشند ۔ باکہ باید گفت کہ کہ نتائج طبع ما کجائی ست و ما را چہ لذت دریں جگر خائی ست ۔ سطرے چند کہ بدیباجگی دیوان ریختہ کسوت حرف و رقم پوشیدہ ، و دود سودائے کہ بآرائش سفینۂ موسوم بہ گل رعنا از سویدا جوشیدہ است ارمغان می فرستم و از شرم تنگ مایگی آب میگردم ۔ والسلام ۔

شیخ امام بخش ناسخ نے اپنا دوسرا دیوان میر موسیٰ جان کے ہاتھ مرزا کو بھیجا ہے ، اس کی رسید اس طرح لکھتے ہیں ۔ ''دریں ہنگام ، کہ فروماندگی از اندازہ گذشتہ و دل بافسردگی خوئے گرفتہ است ۔ ندانم چہ مے نگارم و چہ می نگرم کہ دریں نگرستن نگہ از ناز بدیدہ در نمی گنجد ، و دریں نگارش نامہ از شادی در بناں (سرانگشت) می رقصد

بخت را برسائی ستایم و پندارم کہ بطور معنی رسیدہ ام ۔ خود را بگرانمایگی آفریں گویم و انگارم کہ موسیٰ را با یدبیضا دیدہ ام ۔ اگر مخدوم مرا بگرفتن عیار ایں دعویٰ حیرتے روے دہد ، و ایں مایہ بالا خوانی و خود نمائی از من عجب آید ۔ گویم ہاں انصاف ، سخن بکنایہ می سرایم نہ بہ گزاف ۔ موسیٰ اشارہ بہ سیدی مکرمی میرموسیٰ جاں ست ؛ و یدبیضا عبارت از دیوان فرد خانی عنواں ۔

”زہے دیوان کہ مدادش از دودۂ چراغ طورست ۔ و غلافش از دیبائے حلہ حور ۔ قلزم معنی را سفینہ است ، و جواہر مضموں را گنجینہ . . . سبحان‌اللہ سخن بہ روزگار مخدوم بپایہ بلند رسید ، و اُردو را رونق دیگر پدید آمد ۔ ایں کہ نارسیدن نامۂ من بخاطر عاطر جائے گرفت ، و شکوۂ آں بزبان قلم رفت ۔ مرا آبرو افزود ، وارزش مرا در نظرم جلوہ‌گرساخت ۔ خوشا من کہ دراں چشم و دلم جائے باشد ، وچوں نامۂ من نہ رسد بہ آرزو ارزد ۔ گرد سر ایں نوازش گردم ، و بریں پرسش جاں بر افشانم . . . .“

مولانا فضل حق مرحوم کے مکان کے قریب آگ لگنے کی خبر مرزا کو بذریعۂ خط موسومہ لالہ ہیرا لال کے معلوم ہوئی ہے ، اس پر مولانا ممدوح کو اس طرح لکھتے ہیں ۔

”قبلہ و کعبہ ! اگر نہ ایں بودے کہ لالہ ہیرا لال را ہوائے دیدن عنقا در سر ، و ناگہ شامگاہے بہ نشیمن تنہائی من گذر ، افتادے ۔ آں در گرفتن آتش گردا گرد والا کاشانۂ ، و سوختن خانہ و رخت ہمسایگاں از ہر کرانہ ، و نرسیدن آسیبے بملازمان دراں میانہ ، از کجا شنودمے ؛

و اگر نه شنودے هر آئینه هم حق دوستانه پرسش - که شیوهٔ غمخواری و اندوه ربائی ست - نا گزارده ماندے ، و هم ایزدی نی'یش که لازمهٔ حق شناسی و سپاس گزاری ست بتقدیم نرسیدے - هاں اے وفا دشمن! بیگانگاں (چوں لاله هیرا لال) کامیاب پیام و نامه ، و آشنایان جگر تشنهٔ رشحهٔ خامه !!

وائے برمن که رقیب از تو بمن بنماید
نامهٔ واشدهٔ مهر به عنوان زدهٔ

''همانا آں سوزندهٔ آذر سرگرمی شوق از من فراگرفته بود که بیتابانه گرد سر گردید ، اندراں آشتلم (شدت) زبانه و شراره در خویشتن نگهداشت هیهات من کجا و ایں همه دعوی بلند از کجا ! خودنمائیهائے گماں تاثیر مهروفا ست که مرابدیں رنگ هرزه لائے و یافه سرائے دارد ؛ ورنه آں را که از شعله آه جگر سوختگاں دامن نسوزد ؛ عجب نیست اگر آتش افروخته پیرامن نسوزد - شکوه پیشکش ، و پیغاره (طعنه) بر طرف ؛ خدائے توانا را شکر گویم که بلائے بی زینهار از بندگاں خویش بگرداند ، و تا بے بصراں را دیده و دیده وراں را سرمه بدست آفتد - کرشمه نیروے جبرئیل و معجزهٔ آسودگی خلیل را ده نظرها تازه کرد ــــــــ اگر دانستمے که پیش خود شرمساری نخواهم کشید ، و مرا اندریں محال طلبی برمن زباں طعنه دراز نخواهد شد - ازاں مخدوم بے عنایت پاسخ ایں نامه و تفصیل ایں هنگامه در خواستمے و پرسیدمے که دراں هنگام که آتش زبانه زد ، و نگه بسراغ تیرگی دودے و تابش نمودے فرارسید - شما چه می کردید ؟ و نور چشم مردمی و فرزانگی مولوی عبدالحق کجا بود ؟ و پس ازانکه رستخیز - در همسایه آشکار شد ، و هزاهز در

انجمن افتاد۔ سراسیمگی درونی پرستاران و بے تابی برونی هوا داران چه قیامت آورد ؟ وایںهمه آشوب چه مایه دیر کشید ؟ وفرجام کار ، که مژدۂ ایمنی دادند ، بر کارخانۂ دواب و بنۂ وبار کہاراں (یعنی اسباب ایشاں) که اینها را جز باطراف کاشانۂ محل نیست ، و بیشتر ازینها طعنۂ آتش بلکه افروزینۂ (ایندهن) آتش ست چه گذشت ؟ لیکن ، چوں ارزش التفات از من سلب کرده ، و مرا نیک دردل فردو آورده اند که حالیاں دراں گوشۂ خاطرم جاے نمانده ۔ هرچه گفته ام بطریق آرزوست نه به سبیل سوال والسلام''۔

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے خط کا جواب جس میں شوق ملاقات اور غزل تازه کی خواهش ظاهر کی هے اُس کے اول اور آخر فقرے یه هیں ''سحر گاهے که دلم از درد شانه چنانکه مومن[1] مهر پیشه از رنج همسایه در آزار باشد ۔ بے قرار بود و دستم از اشتلم بے تابی دل رعشه دار ؛ فرخنده سروشے از در درآمد و سپردن بهار سامان نامه گل به جیب تمنا ریخت ۔ هرچند نامه سپارمس امید را کیمیا و دیدۂ جاں را توتیا آورد ، تارک اقبال را افسر و پیکر آرزو را زیور بخشید ، لیکن ازآں جا که آں قدسی مفاوضه از شعر و غزل ، چوں نامۂ اعمال زاهد از ذکر مے و شاهد ، ساده بود ؛ دل سودا زده بداں نیاسود ، و خمارم بداں یکدو جرعه صهبا نشکست ۔ گفتم هے هے! نه مژده دیدارے که دل به نشاط آں تواں بستن و نه کرشمۂ غزلے که لب بزمزمۂ آں تواں کشودن ——— امید که ازیں بعد زود نه دیر بانشانے غزل شادم فرمایند ، ونوید رو بکوتاهی نهادن روز فراق

[1] دل کو مومن سے اور شانه کو همسایه سے تشبیه دی هے ۱۲

که اندریں موسم که خسرو انجم به اسد[1] جائے دارد عجب نیست ، بفرستند ، دولت و اقبال روز افزوں باد"

جواب نامۂ شیخ امیر الله سرور تخلص "رسیدن دلنواز نامه دل را تنومند و شاخ آرزو را برومند ساخت ـ گله از نارسیدن پاسخ نامه هائے خویش مے کنید و از خدا شرم ندارید ـ من خود از جانب شما نگرانی داشتم که کجائید؟ و چه در سر دارید؟ بارے پرده از روئے کار شما برگرفتم و دانستم که یک چند مرا فراموش کرده بودید ؛ ناگاه ورود جناب مولانا تراب علی بداں بقعه افتاد ؛ شنیدید که فلانی (یعنی غالب) از سخت جانی هنوز زنده است ، مهر کهن بجنبید ، خواستید که بنامه یاد آورید ، از فراموشی روزگار گذشته اندیشه کردید ، لا جرم دروغے چند برهم یافتند و آں را دیبای دیباچۂ نامه ساختید ـ از حال من پرسیده اید ـ چه گویم که بگفتن نیرزد ، چنانکه گفته اند :

شکسته دل تر ازاں ساغر بلوریم
که درمیانۂ خارا کنی ز دور رها

خیره سر و آشفته رائے ، نه زباں سخن سرائے و نه دل از سراسیمگی برجائے چهار سال می گذرد که مقدمۂ من باجلاس کونسل در پیش ست و دلم از تفرقۂ بیم و امید ریش حکمے که قطع خصومت تواند کرد برنیامده و هنگام به پایاں رسیدن تیره شب نا امیدی در نیامده حالیا براں سرم که چوں

---

[1] یه خط مرزا نے اس وقت لکھا ھے جب آفتاب برج اسد میں تھا چونکه اسد مرزا کا تخلص اور اُن کے نام کا جزو ھے۔ اس لیے آفتاب کے برج اسد میں ھونے سے یه شگون لیا ھے که ایسے وقت آپ کا مجھ سے ملنا کچھ دور نہیں ھے۔

جزو اعظم کونسل اشرف الامرا لارڈ ولیم کونڈس بنٹنگه بهادر بدیں دیار در آید بدامنش در آویزم و داد خواهم و استدعائے صدور حکم اخیر کنم - گروهے بر آنند که نواب عالی جناب بدهلی نخواهد آمد و هم ازاں رهگذرها باجمیر خواهد رفت - اگر همچنیں ست بدامن و روزگار من و آوخ از دوری راه و درازی کار من -

خواسته آید که نتائج طبع والائے شما بنگرم و از ترا دیده هائے وکام و زبان خود بشما آرمغانے فرستم - فرصت آں کجا؟ و دماغ ایں کو؟ آمد آمد نواب، گورنر، و دریوزهٔ اخبار از هر در، ترتیب افراد مقدمه و تمهید نگارش حال، سنجیدن اندیشه هائے رنگا رنگ و سگالیدن اندازهٔ بیان - آں مایهٔ دستیاری و غمخواری از کسے چشم ندارم که چوں ورقے انشا کرده باشم نقل آں تواند برداشت، با چوں دفترے از بهر نگرستن پریشاں کنم آں اوراق پراگندهٔ فراهم تواند کرد- بهر رنگ چند روز دیگر معاف دارید، و تا زمانیکه بمن پیوندید گاه گاه بنامه زنگ زدائے آئینه و داد باشید -

مولوی سراج الدین احمد لکھنوی جو کلکتے میں کسی عمدہ خدمت پر ممتاز ہیں اور مرزا کے نہایت سچے اور گاڑھے دوست ہیں اُن کو نواب امین الدین خاں مرحوم کے باب میں جب کہ وہ رئیس فیروز پور جھرکہ کے خلاف اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے کلکتے گئے ہیں اس طرح لکھتے ہیں ”مخدوم غالب ! اگر نه اندوه سترگ بند بر دلم نهاده بودے - من دانم و دل که در شکوه چه روش ها ایجاد و در گله چه عربده ها بنیاد

کردمی - صرفۂ شما (یعنی سود شما) در ناکامی من ست (جس کے سبب سے شکوہ کرنے کی فرصت نہیں ہے) ورنہ اگر تاب و توان داشتمے آن قدر با شما در آویختمے که شما را دامن و گریبان بزیان رفتے ، و مرا سر درد شکستے - آخر از خدا بترسید ، و از روئے داد بسنجید که کار من و شما بدان رسد که روزها بگذرد و به نامه یاد نگردم گفتم (یعنی میں اوپر کہہ چکا ہوں) که در بند گزارش اندوہ ہے تازه ام شکوه کجا بخاطر ناشاد سے رسد - اگرچه اندریں ورق گنجائی ایں دو سطر نیز نبود - لیکن اندیشه بران پیچید که مبادا دوست ادانشناس من مرا از خود خرسند داند ، و بدیں گمان از تلافی فارغ باشد و من زیان زدۂ جاوید امید گسته باشم -

بالجمله دریں نامه نگاری مدعائے اصلی بدیں رنگ ست که برادر صاحب مشفق نواب امین‌الدین احمد خان بهادر ابن فخرالدوله دلاور الملک نواب احمد بخش خان بهادر رستم جنگ راهمان موج بلا که زورقم شکسته بود (یعنی تعدی رئیس فیروز پور) خانه بسیلاب فنا داد - خون وفایم بگردن که دریں سفر از همپائش باز ماندم - و ماندگی و بیچارگی من ازیں جا توان سنجید که دندان بر جگرنهم، و امین‌الدین احمد خان را در سفر تنها گزارم - اگر قاضی محبت بدیں جرم بر نطعم نشاند ، و به تیغ بے دریغ خونم ریزد ، سزاوارم و لطف دریں ست که هر چند دریں باب بگفتار گرایم ، و هنگامۂ پوزش آرایم شرم‌ساری بیشتر گردد ، و خجلت افزاید - مگر سراج‌الدین احمد به تلافی بر خیزد و تا از گرانی تشویر (شرمندگی) سبکدوش گردم ، و گرد خجلت از چهره برافشانم - یعنی کمر به غم خواری و رهرو نوازی

استوار بندید ، و خود را دوست دیرینۂ امین‌الدین خاں دانستہ آنچناں چارہ سازی و سگالش‌گری بجا آرید کہ این درد مند دور از خانماں (یعنی امین‌الدین خاں) اسداللہ روسیاہ را فراموش کند ؛ شما را بجائی او داند ۔ ونیز بہ برادر والا قدر گفتہ شدہ است کہ چوں بہ کلکتہ رسد و شمار دریابد داند کہ اسداللہ پیش ازو بہ کلکتہ رسیدہ است ۔ قطع نظر ازیں مدارج کہ بر شمردم ۔ آخر خدائے ہست ودادے ہست افسانۂ ناکامی و ستم‌کشی این فروغ ناصیۂ سعادت یعنی امین‌الدین احمد خاں خارہ را دل بگذارد ، و آہن را آب گرداند ۔‘‘

دوسرا خط مولوی سراج‌الدین احمد کے نام اس طرح شروع کرتے ہیں ’’گوہر آگین نامۂ دلنواز پس از روزگارے دراز رسید ، و دیدہ و دل را فروغ و فراغ بخشید ۔ نارسیدن نامہ مرا بافسردگی شوقم حمل کردید ؛ چرا بہ مرگ من حمل نہ کردید ؟ تا از ادا شناسی ہائے شما خرسند بودمے ، و شما را اہل دل و دانشور شمردمے ۔ من و ایماں من کہ ریشۂ مہر شما بہ مغز دل دویدہ ، و محبت شما باجاں در آمیختہ ۔ تا زندہ ام ، بندہ ام ۔ وفا آئین من ست ، و مودت دین من ست اگر در نگارش نامہ درنگے روے دہد بر فراموشی محمول نشود ۔ دردہا در دل ، و ہنگامہ‌ہا در نظر ، و تفرقہ ہا در خاطر ، سودہا در سر چہ گویم چہ می کنم ، و روزوشب چگونہ بسر می برم ۔

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اسٹرلنگ صاحب فارن سیکرٹری گورنمنٹ ہند کی وفات پر اس طرح لکھتے ہیں ’’عمر من و جان من ! پس از رسیدن گرامی نامہ

در بند آں بودم کہ پاسخ گزار شوم وماجرائے خود شرح دهم - ناگہاں دی کہ دو شنبہ پانزدهم ذی‌الحجہ بود آوازہ در افتاد کہ مجموعۂ مکارم اخلاق را شیرازۂ وجود ازهم گسیخت ؛ شمع ایوان سروری مرد ، ونہال باغ آگہی را برگ و بار فروریخت - دستگیر درماندگاں را دست از کار رفت ، وگرہ کشاے بستہ‌کاراں را نے بناخن شکست - خاکم بدهن - چگونہ گویم ؟ و اگر من نہ گویم کیست کہ نمی داند ؟ کہ مستراندرو استرلنگ مرد ، و از گیتی جز نام نیک با خود نبرد - کاش روے گداختہ (پگھلی هوئی کانسی) بروزنۂ گوشم ریختندے تا نشنودمے - کہ چہ شد - اکنوں امید غمخواری کہ از بایدم داشت ؟ و دل را بخیال گردش چشم کہ تسکیں داد - رپوٹ کہ فرانسس هاکنس بہادر در خصوص داد خواهی من بہ صدر فرستادہ است - چگویم کہ چہ مایہ امید کاہ و اندوہ فزائے بودہ است تکیہ بر کارسازی آں چابک خرام بیدائے فنا (یعنی استرلنگ) داشتم اکنوں از شش سو فلک بکام دشمن ست - ز ینہار در پاسخ ایں نامہ درنگ روا مدارید ؛ وبنویسید کہ آں والا گہر را چہ روے داد ، و آں گلبن روضۂ مردمی را کدام تند باد از پافگند ؛ و پس از وے سرانجام دفترکدہ چہ شد و جایش کہ گرفت - اللہ ماسوای هوس“ -

ایک اور خط میں مولوی صاحب موصوف کو اپنے ایک کلکتے کے دوست مرزا احمد بیگ کی تعزیت اس طرح لکھتے هیں ”والا نامہ رسید ، و نوید فراق دائمی مرزا احمد رسانید - چہ مایہ سنگین دل و سخت جانم کہ نامہ در تعزیت دوست انشا می کنم و اجزائے وجودم از هم نمے

ریزد - می گفت که بدهلی می آیم ؛ وعده فراموش بے مروت راه گرداند ، و ناقه بسر منزل دیگر راند - گرفتم که خاطر دوستان عزیز نداشت - چرا بحال خرد سالان خود نپرداخت ، وسایه از سرشان باز گرفت - وائے بے یاری یاران وے ، و دریغا بے پدری پسراں وے - هر چند از مرگ نتواں نالید ، وگسستن تار و پود پندار هستی را چاره نتواں کرد . لیکن انصاف بالاے طاعت است ؛ هنوز هنگام مردن مرزا احمد نبود - چرا آں قدر صبر نه کرد که به کلکته رسیدے ، و روے نظاره فروزش دگر باره دیدے - چرا آں مایه درنگ نه ورزید که حامد علی جواں گشتے ، وکارها باندازه دانش وے رواں گشتے ، حیف که مهیں پسرش خرد سال ست ؛ و باشد که به حقیقت سرمایه پدر دانا ، وبگردآوردن زرهاے پراگنده توانا ، نباشد - وباشد که چوں آں سرمایه به چنگ آرد بباد دهد ، و بر فرودستان خود ستم کند ، و کهین برادراں را ناکام گزارد - هر آئینه دریں حال امینے باید هوش‌مند و حق سناش - که گرد چاره براید ، وغم خواری بے پدر ماندگاں نماید - لله در من قال :

مرا باشد از درد طفلاں خبر
که در طفلی از سر برفتم پدر

والله که تیمار آں بیچارگاں عین فرض و فرض عین ست هم برشما و هم بر مرزا ابوالقاسم خان ، بیکسی ایں جماعة در نظر باید داشت و غافل نباید بود - ان الله لایضیع اجرالمحسنین‘‘۔

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد سے دوستانہ شکایت اس طرح کرتے ہیں ’’ز ینهار صد زینهار

اے مولوی سراج الدین ! بترس از خدائے جہاں آفرین - که چوں قیامت قایم گردد ، و آفریدگار بنشنید ؛ من گریاں یو مویه کناں دراں هنگامه آیم ، و در تو آویزم ، وگویم که این آن کس ست که یک عمر مرا به محبت فریفت ، و دلم برد و چوں من از سادگی بر وفا تکیه کردم ، وایں را از دوستاں برگزیدم - نقش کج باخت ، وبمن بیوفائی کرد - خدا را بگو که آں زماں چه جواب خواهی داد ؟ وچه عذر پیش خواهی آورد ؟ وائے بر من که روزگارها گذرد وخبر نداشته باشم که سراج الدین احمد کجا ست و چه حال دارد - اگر جفا بپاداش وفاست بسم الله هر قدر توانی بیفزائے - که اینجا مهر و وفا فراواں ست ؛ لاجرم جفا نیز باید که فراواں باشد - و اگر خود ایں تغافل به بادا افراه (یعنی بپاداش) جرمے دیگر ست - نخست گناه مرا خاطر نشان باید کرد ، وانگاه انتقام باید کشید ، تا شکوه درمیاں نه گنجد ، ومرا زهره گفتار نباشد - منم که معاش من از گونه گوں رنج و رنگ رنگ عذاب به معاد کفار ماند ؛ خوں در جگر ، وآتش در دل ، وخار در پیراهن ، وخاک برسر - هیچ کافر بدیں روز گرفتار مباد ، وهیچ دشمن ایں خواری مبیناد - راست به تنها روی ، مانم که در صحرا پایش به گل فرو رود ؛ وهر چند خواهد که بالا جهد نتواند و فرود تر رود - والا قدر نواب امین الدین احمد خاں بهادر که گیتی را برویش دیدمے ، و وصالش را زندگی دانستمے ، به کلکته رهگرا شد - دیگر زندگی از بهر که خواهم و دل را بدیدار که شادماں دارم - واماندگی من ازینجا تواں سنجید که نتوانستم همپایش کردن و روا داشتم او را تنها گذاشتن ....

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین کو اپنے مقدمے کے بگڑ جانے کا حال اس طرح لکھتے ہیں۔

''کار من به داد گاه دهلی چنانکه دانسته باشید۔ تباهی گزید۔ حالیا بران سرم که اگر مرگ امان دهد باز بدان در (یعنی در سپریم گورنمنٹ) رسم، و درد دل بدان زمزمه فروریزم که مرغان هوا و ماهیان دریا را بر خود بگریانم۔ هیهات! اگر معاش من همیں پنج هزار روپیه سالانه هم بدیں تفریق۔ از روئے دفتر سرکار ثابت شده بود بایستے که صاحبان صدر مرا از پیش راندندے و گفتندے که هرزه مخروش؛ آنچه تو بازیافت وانموده یافتنی ازاں افزوں تر نیست، وقرارداد نیز هماں ست۔ لاجرم دیوانه بودمے اگر بدیں کشور باز آمدے، وبایک قبیله (یعنی باجمعے کثیر) که خویشاں و برادران من اند۔ به ستیزه برخاستمے۔ وبه باطل ستیزی نام بر آورد مے۔

چکنم که کار برگشت، وروزگار برگشت۔ خدا را بنگر، وبه درد دل من وارس۔ کولبرگ بتوسط کرنیل هنری املاک برمن مهربان شود، و رپوٹے که خوشتر ازاں نتواں اندیشید بصدر فرستد، وجوابے که سودمند تر ازاں نتواں سنجید۔ از صدر حاصل نماید؛ هنوز آں جواب در راه باشد که کولبرگ معزول گردد۔ وهاکنس که بجاے کولبرگ نشیند۔ آنچه برهم زدن هنگامه سلطنتے را بس باشد۔ از بهر من بصدر نویسد، ومن دراں داوری (معامله) از مستر استرلنگ چشم یاوری داشته باشم؛ هنوز آں رپوٹ بصدر نرسیده باشد که مستر استرلنگ راهرو راه عدم گردیده باشد۔ چوں از همه بگسلم، وبدامن جارج سونٹین بهادر آویزم، گرم از جا برخیزد؛

ودامن برشغل جہانبانی افشاند۔ سبحان اللہ ! معزول نگردد مگر کولبرگ، بمرگ ناگاہ نمیرد مگر استرلنگ بولایت نرود مگر جارج سونٹیں ؛ درخور ایں صدمہ ہاے جانکاہ نباشد مگر اسد اللہ داد خواہ''۔

مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک اور خط ''دلنو از نامہ پس ز عمرے رسید ، وعمرے دیگر بخشید ؛ تا عمر باندوہ سپری شدہ را تلافی تواند کرد ۔ اما شاد کردن دلے کہ نہادش بہ غم سرشتہ باشد نہ آسانست ۔ منم کہ چوں نامہ شما رسیدے مستانہ از جاے برجستمے ، و جہاں جہاں نشاط اندوختمے ۔ اینک تا چشم بسواد ایں صحیفہ دوچار شد گیتی در نظرم تیرہ وتار شد ۔ نخست آنچہ بنظر درآمد خرد آشوب خبرے بود کہ دل تا جگر خون کرد ۔ یعنی از جہاں رفتن خواہر عزیز شما ۔ ہے ہے ! مخدومہ مرحومہ ہماں ست کہ تا در کلکتہ خبر رنجوری وے شنودہ بودید دل از دست رفتہ بود ، وسراسیمگی سراپاے خاطر را فرو گرفتہ در نظر دارم کہ از مردنش بر شما چہ قیامت گذشتہ باشد ۔ توانا ایزد پاک شما را شکیب عطا فرماید ، وتنومندی ۔ دل و توفیق ثبات ارزانی دارد ، و ایں سانحہ را در روز نامہ عمر شما خاتمہ مکارہ و مقطع مصائب گرداند ۔

''آشکارا شد کہ مخدوم مرا از علاقہ تازہ خوشنودی نیست ۔ ہر آئینہ انکشاف ایں معنی غبار ملال ، بردل فرو ریخت ۔ خدا را دلتنگ نتواں شد ، وکلکتہ را غنیمت باید پنداشت شار ستانے (معمورہ) بدیں تازگی در گیتی کجا ست ۔ خاک نشینی آں دیار از اورنگ آرائی مرزبوم دیگر خوشتر ۔ من و خدا کہ اگر متاھل نہ بودمے ، و طوق ناموس عیال

بگردن نداشتے ؛ دامن بر هرچه هست افشاندمے ، وخود را دراں بقعه رساندمے - تا زیستمے دراں مینوکده بودمے ؛ و از رنج هواهاے ناخوش آسودمے - زهے هوا هاے سرد ، وخوشا آب‌هاے گوارا ، فرخا باده‌هاے ناب ، وخرما ثمرهاے پیش رس -

همه گر میوهٔ فردوس بخوانت باشد
غالب آں انبهٔ بنگاله فراموش مباد

مولوی سراج‌الدین کو مرزا صاحب نے کسی واقعے کا قطعهٔ تاریخ لکھ کر بھیجا ہے اور اُنھوں نے بغیر خواهش مرزا صاحب کے وہ قطعہ بہت سی مدح و ستائش کے ساتھ اخبار آئینہ سکندر میں چھپوایا ہے جب وہ پرچہ مرزا کی نظر سے گزرا ہے تو اُس کا شکریہ اور ایک اور خبر کے درج کرنے کی درخواست اس طرح کی ہے -

گمنامے را نامور ساختن ، وهیچے راهمه پنداشتن ، عنایتے ست سترگ و مرحمتے ست بزرگ ؛ خاصه که آں سترگ عنایت بے ابرام داعی روے نماید ، وآں بزرگ مرحمت بے استدعاے سائل ظهور آید - نگرنده اگر دیدهٔ حق بیں دارد - بنگرد که واجب تعالیٰ شانه اجزاے ممکنه را - که در کتم عدم متواری بوده اند بمحض عنایت پیرایهٔ وجود بخشیده ، و براں معدومات منت نهاده - حقا که اگر تاملے بسزا کرده شود رقم گشتن قطعهٔ تاریخ در آئینه سکندر ازیں عالم خبر مے دهد - و چوں ناخواسته ایں چنیں نوازش بمیاں آمد - هر آئینه روائی خواهش را چگونه چشم نتواں داشت لاجرم در گزارش مدعا فصلے بمیاں نهاده آرزو را سرانجام گفتگو داده می شود -

نهفته مباد که قدرنشناسی حکام رنگ آں ریخت که فاضل بے نظیر والمعی یگانه مولوی فضل حق از سررشته داری عدالت دهلی استعفا کرده خود را از ننگ و عار وا رهاند حقا که اگر از پایۂ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آں مایه بکاهند که از صد ـ یک وا ماند و باز آں پایه را بسررشته داری عدالت دیوانی سنجند، هنوز ایں عهده دون مرتبه روے خواهد بود ـ بالجمله بعد ازیں استعفا نواب فیض محمد خاں (رئیس جهجهر) پانصد روپیه ماهانه برائے مصارف خدام مخدومی معین کرد و نزد خود خواند ـ روزیکه مولوی فضل حق ازیں دیار مے رفت ولیعهد خسرو دهلی صاحب عالم مرزا ابو ظفر بهادر مولانا را تا پدرود کند ـ سوے خود طلبید، و دوشالۂ ملبوس خاص بدوش وے نهاد ، و آب دردیده گرداند، و فرمود که ''هرگاه شما می‌گوئید که من رخصت می شوم مرا جز اینکه بپذیرم ـ گریز نیست ـ اما ایزد دانا داند که لفظ وداع از دل بزباں نمی رسد الا بصد جرثقیل'' تا ایں جا سخن ولیعهد بهادر است غالب مستهام از شما می خواهد که واقعۂ توديع مولوی فضل حق ، و اندوه ناکی ولیعهد بهادر ، و بدر آمدن دلهائے اهل شهر ، بعبارتے روشن و بیانے دلاویز در آئینه سکندر بقالب طبع در آرید ؛ و مرا دریں تفقد منت پذیر انگارید ـ والسلام''ـ

مولوی سراج الدین احمد نے خط اس مضمون کا بھیجا ہے کہ مرزا صاحب کچھ حالات پارسیوں کے اسلاف کے لکھیں اور کوئی ایسی کتاب کا نشان دیں جس سے آن کے مفصل حالات معلوم ہوں ـ نیز کسی تذکرے میں درج

کرنے کے لئے مرزا کے اشعار کا انتخاب اور خود مرزا کا ترجمہ طلب کیا ہے، اُس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں۔

”ہر نسیمے کہ ز کوے تو بخاکم گذرد
یادم از ولولۂ عمر سبکتاز دھد

رسیدن مہر افزا نامہ دل برد، و جاں بخشید۔ اگرچہ آں جاں با من نماند، وھم بر سر آں نامہ نفشاندن رفت؛ لیکن سپاس دلربائی وجاں بخشی باقی ست۔ امید کۂ تا جان بخشیدۂ یزداں در تن ست گزاردہ آید۔

مخدوم من در رسیدن نامۂ پیشیں دو دل (متردد) چراست؟ ھنوزم نشاط ورود آں نمیقہ در دل، و سواد سطور آں صحیفہ در نظر جا دارد۔ چوں فرماں چناں بود (یعنی درنامۂ پیشیں) کہ غالب خویشتن نشناس لختے از رسم و راہ سترگان پارس برگوید، وکتابے ازاں گروہ نشان دھد کہ راز آں دیریں کیش، و ساز ایں باستانی زباں ازاں اوراق تواں یافت؛ لا جرم دانش من (علم من) اندازۂ سرانجامِ پاسخ آں برنتافت (تحمل نکرد) چوں دوبارہ گفتند کہ خواھش چنیں ست۔ ناچار مہر خموشی از دھاں و پردۂ شرم نادانی از میان برداشتہ میگویم کہ روائی ایں خواھش از ھیچکس چشم نتواں داشت؛ و خود را بہ بند ایں پژوھش (تلاش) خستہ نتواں کرد۔ نگارندۂ دبستان مذاھب ایں ھمہ لاف آشناروئی (واقفیت) آنچہ میگوید نہ ھمہ ست و نہ ھمہ بر جائے خودست (یعنی نہ مکمل ست و نہ سراپا صحیح ست (پارسیاں کہ در سورت و بمبئی آشیاں دارند زینہار گماں نبری کہ ازاں گروہ

(یعنی سترگان پارس) جز نام‌ونشان دارند ـ آن پویهٔ و
آن هنجار (یعنی آن روش و آن طریق) و آن نگارش و آن گفتار
ندانند ، و جز تخمهٔ و نژاد از روئے شیوه بپارسیان نمانند ـ
پارسیان از گران مائگان روزگار ، و برگزیدگان دادار بوده اند؛
و روزگار فرمانروائی خویش و انشهاے سودمند (علوم مفیده)
و کنشهائے خرد پسند (اخلاق پسندیده) داشتند ـ
کشائش را ز خراشش هفت سپهر ، و نمائش اندازهٔ گردش ماه‌و
مهر ، پدید آوردن رخشنده گهرها از ته خاک
و بدر کشیدن بادهٔ ناب از رگ تاک ، پژوهش اسباب خستگی
و رنجوری و گزارش احکام پزشکی (طبابت) و چاره‌گری ،
پرده کشائی فهرست اسرار کیانی (سلطنت) و فرماندهی
در صد بندی تقویم آثار بندگی و فرمانبری ـ و عنوان بیک
دگر بستن رنگ رنگ گهرها ، و هنجار سره کردن گونه
گون هنرها ، دارد ـ گیاها فراخور هر درد بکار اندر آوردن ،
و پرندگان هوا و درندگان دشت را بشکار اندر آوردن ؛ کوتاهی
سخن ـ والائی انداز هرگونه بینش ، و پیدائی اندازه کمال
آفرینش ـ همه در آئینهٔ اندیشهٔ این فرزانگان روے نموده ـ
و انگیزش بائیستگی گفتار و کردار که اکنون به اندکے
ازان بسیار نازند ـ از مغز دانش این فرهنگیان بوده است ـ
گنجینهٔ خسروان پارس را از هر علم دفترے بود ، و هر
دفتر از گران‌مایگی ـ گنج گوهرے ـ چون دولت ازان طائفه
روے برتافت ، و سکندر ابن فیلقوس بر ایران دست یافت ،
کتب خاصهٔ خسروی بتاراج رفت ـ اما آنچه پراگنده بود و
گمنامان بهرگوشه و کنار داشتند ـ برجاماند ـ تا با روزگار
پیروزی تازیان دران کشش و کوشش ٪ جا گردآمد

(فراهم آمد) و برفرمان خلیفه - افروزینهٔ گلخن گرمابهاے (حمامهائے) بغداد شد - همانا احکام آذر پرستی هم باآذر بازگشت - زبان آوران عرب پارسی را بتازی آمیختند، و زبانے تازه برانگیختند - اکنون کیست تا بدان زبان کهن سخن درست تواندگفت ، و ازاں دیرین آئین براستی خبر تواند داد- پژوهندهٔ این راز را کام دل برنیاید ؛ و من ضامن که هرچه پس از فراواں جستجو فراهم آورد - نه آنچناں باشد که دل بداں تواں نهاد -

دیگرآنچه کلک مشکبار بداں رفته که منتخبے از گفتار ناروائے خود برنگارم ، لختے از ماجراے خود برگزارم - اندیشه را به لب گزیدن و خرد را به شگفت زار (در محل تعجب) افگند -

چگویم از دل و جانے که در بساط من ست
ستم رسیده یکے ناامیدوار یکے

از چه بداں ارزم و مرا ایں پایه از کجا باشد که ستودگان مرا ستایند ، گفتار مرا در تذکرهٔ شعرا جا دهند - از فرجام فرهمندی هستی (یعنی از شان و شکوه هستی و سروبرگ پیدائی - که نزد آشکارا بیناں زود زوال ، و بوالا دید یکتا گزیناں (یعنی قائلاں وحدت وجود) نمود بے بودست آنچه بمن داده اند زبانے ست یافه سراے وخامه ایست بیهوده پوے - من هم از بے مائیگی چوں کودکاں که درم از سفال سازند و به گنجینه داری نازند - سرودهٔ زبان پیمودهٔ خامه را (یعنی کلام خود را) پاره پاره بهم بسته و ریزه ریزه یکجا کرده - بگمان نام‌آوری که دل از

تاب اندوه ناروائی آں خون ست - دیوانے ترتیب دادہ جا بجا بنظر گاہ التفات یاراں فرستادہ ام - بزرگانے کہ بہ پرسش غالب مستمند روے آرند - سواد ہر غزلے کہ خواہند ازاں اوراق بردارند؛ کہ انتخاب و التقاط اشعار حوالہ بہ راے نامہ گرد آور (یعنی مؤلف تذکرہ) است؛ نہ باشارۂ و ایمائے سخنور------ اما اگر گزارش حال سخنور ہوس است خود ایں مایہ بس ست کہ چوں در جریدۂ آں فن ز م،ن سخن رانند - سخن را در ستایش من بدیں گونہ بہ کرسی نشانند کہ از ناکسان روزگار و بیکسان دہلی دیار مسلمان زاد ایست کافر ماجرا وگبریست مسلمان نما کہ از غلط نمائی غالب تخلص می کند وبدیں رنگ ژاژ می خاید -

خرسندی غالب نبود زیں ہمہ گفتن
یک بار بفرمائے کہ اے ہیچ کس ما

پنہاں نماناد کہ در اصل آفرینش از دودۂ روز فرورفتگان ، و حلقۂ بخت برگشتگان- ستم رسیدہ و روے بہی نادیدہ کسم، آرائیش سخن پیش کش (یعنی بر طرف) ترک نژادم ، و نسب من با فراسیاب و پشنگ مے پیوندد - بزرگان از من انجا کہ با سلجوقیاں پیوند ہم‌گوہری داشتند، و بعد دولت ایناں رایت سروری و سپہبدی افراشتند - بعد سپری شدن روزگار جاہمندی آں گروہ (یعنی سلجوقیاں) چوں ناروائی (کسادبازاری) و بینوائی روے آورد - جمعے را ذوق رہزنی و غارتگری از جاے برد؛ و طائفہ را کشاورزی پیشہ گشت - نیاگان مرا بہ توراں زمیں ، شہر سمرقند آرامشگاہ شد - ازاں میانہ نیاے من از پدر خود رنجیدہ آہنگ ہند کرد، و بہ لاہور ہمراہی معین‌الملک گزید، چوں بساط دولت معین‌الملک در نوشتند -

بدھلی آمد ، و با ذوالفقارالدولہ میرزا نجف خاں بہادر پیوست۔ زاں پس پدرم عبداللہ بیگ خاں بشاھجہاں آباد بوجود آمد ، و من بہ اکبرآباد۔ چوں پنج سال از عمر من گذشت۔ پدر از سرم سایہ برگرفت۔ عم من نصراللہ بیگ خاں چوں خواست کہ مرا بہ ناز پرورد۔ ناگاہ مرگش فرازآمد۔ کمابیش پنج سال پس از گذشتن برادر بے مہین برادر برداشت، و مرا دریں خرابہ جا تنہا گذاشت و ایں حادثۂ کہ مرا نشانۂ جاں گدازی و گردوں را کمینہ بازی بود در سال ہزار و ہشت صد و شش عیسوی بہنگام ہنگامۂ لشکر آرائی و کشور کشائی صمصام الدولہ جرنیل لارڈ لیک بہادر بروے کار آمد۔ چوں عم مرحوم از دولتیان دولت اھل فرنگ، وبا انبوھی چار صد سوار برکاب صمصام الدولہ، با سرکشاں سرگرم جنگ بود، و ھم از بخشش ھائے سرکار انگریزی دو پرگنہ سیرحاصل از مضافات اکبر آباد بہ جاگیر داشت۔ سپہ سالار سرکار انگلشیہ بہ خونبہائی آفتاب (یعنی نصراللہ بیگ خاں) کلبۂ تار گدایاں را چراغ ، و ما بینوایاں را بعوض جاگیر بمشاھرہ از خار خار جستجوے وجہ معاش فراغ بخشید۔ تا امروز۔ کہ شمارۂ نفس شماری زندگانی بہ چل و چار میرسد۔ بداں راتبہ خرسندم ، و بداں مایہ قانع۔ در سخن از پرورش یافتگان مبداء فیاضم ، و سواد معنی را بفروغ گوھر خویش روشن کردہ ام۔ از ھیچ آفریدہ حق آموزگاریم بگردن و بار منت رھنمایم بردوش نیست۔

غالب بہ گہر ز دودہ زادشمم
زاں زو بصفائی دم تیغست دمم

چوں رفت سپہبدی زدم چنگ به شعر
شد تیر شکسته نیاگاں قلمم

نامه بپایاں رسید، و شرم پراگنده گوئی و دراز نفسی بر من اشتلم کرد - دیده وراں دانند که گفتنی فراواں بود، و افسانه پریشاں؛ تا کجا اندک گفتمی، و گفتار را از درازی نگاهداشتمے مرا درانچه رفت گناهے نیست - و اگر نزد گناه ست، دوست کریم ست و کرم عذر خواه - والسلام -

منشی جواهر سنگھ جوهر تخلص کے باپ رائے چھجمل دهلوی نے مرزا کو جب که وه کلکتے میں هیں، ایک رئیس کی نسبت جو اپنے باپ کی جگه مسند نشین هوا هے، لکھا هے که وه حکیمانه طریقه رکھتا هے اور سخاوت اس کی جبلت میں هے، اس کے جواب میں مرزا لکھتے هیں "ایکه گفتی فلانی روش حکیمانه دارد، و دنیا را کار آگاه نه می‌گذارد با این همه اندوهناکی خنده‌ام درگرفت، و عنان ضبط خویش از کفم بدررفت ندانی که بر اسپان بادرفتار برنشستن، و گروها گروه مردم را پیشا پیش دوانیدن، تن را بلباس رنگا رنگ برآراستن، و معده را به الوان خوردنیها ممتلی گردانیدن، شهوه از اندازه بیروں راندن، و غبار معصیت بر فرق افشاندن، از حکما نیاید؛ و پزشکاں را نشاید - کار دانشوراں چیست؟ دور از آبادی در بن کوهے نشستن، و از شش جهت در بروئے خلائق بستن، تن را بریاضت فرسودن، و جاں را به بخردی پالودن - هر که حکیم خردگزین ست کاروبارش این ست - بے برگ و نوائے از شکنجۂ گوناگوں حسرت بدر جسته به فراخ نائے خوشی (مستی)

رسیدہ است ؛ از کجا کہ آزادہ کہ دو بالطبع کریم بود ۔ ہنوز ادعیۂ منی از ریاح غالطیۂ صالحۂ کبدیہ ممتلی دارد ؛ ہر آئینہ بفرمان بادست ۔ روزے چند باش تا بنگری گرہ بر کیسۂ زر زناں ، و در حسرت زر تلف کردہ زاری کناں این کہ فلاں و بہمان را از نزد خویشتن راندہ است ۔ حقا کہ روئے در مصلحتے نداشت ، و ہرچہ کرد از بے خردی وابلہی کرد چہ اگر دانا بودے ، و خرد داشتے ۔ آناں را کہ راندہ است نہ راندے ، و کارہا از آناں گرفتے ۔ و ایناں را کہ باخود در یک پیرہن جا دادہ است ۔ چوں غبار از دامن افشاندے ؛ و ہرگز بہوائے ایناں نرفتے ۔ کودکی و بے حاصلی ورزید ؛ مگر در ایام صاحبزادگی و ولیعہدی از آناں دلے برداشت ، و با ایناں لختے رام بود ۔ از آناں دل بدیں خیرگی خالی کردن ، و در دام ایناں بدیں کوری درآمدن ۔ نہ بفرمان دانش ست نہ بفرمان بینش ؛ حکیم کرا می گوئی ؟ و کرم پیشہ کرا می خوانی ——— چوں سخن دریں باب بسیار ست نامہ بدعا ختم می کنم ۔ دیدہ را بینشے درست و دل را دانشے سود مند روزی باد،، ۔

مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ جن سے مرزا باندے میں مل کر کلکتے روانہ ہوئے ہیں ، کلکتے میں پہنچ کر اُن کو سفر کی تمام روئداد لکھی ہے اُس کے آخر میں لکھتے ہیں ’’روز سہ شنبہ چہارم شعبان پارۂ از روز بر آمدہ در کلکتہ رسید ۔ غریب نوازیہائے وہاب بے منت را نازم کہ در چنیں دیار خانۂ چناں کہ باید ، و ہر گونہ آسائش را بکار آید ؛ ہم او را با اندازۂ فراغ خاطر آزادگاں فضائے ، و ہم اندرو مانند دہان آز دنیا طلباں بیت الخلائے ؛ درگوشہ

صحن پر از آب شیریں چاھے ، و برطرف بام درخور اھل تنعم آرام گاھے - بے آں کہ جستجوئے رود ، یا گفتگوئے شود - بے منت و بے زحمت بکرایۂ دہ روپیہ ماھانہ بہم رسید ؛ و آدم و چاردارا تکیہ گاہ آرامش گردید - دو روز در رنج راہ آسودہ منشور لامع النور (یعنی سفارش نامۂ مولوی محمد علی خاں) را مشعل راہ مدعا ساختم ، و در کشتی نشستہ آھنگ ھگلی بندر کردم لطف ملاقات نواب علی اکبر خاں طباطبائی اگر گویم کہ مرا از بخت عجب آمد - روا ست ؛ و اگر گویم کہ مرا بر من برشک آورد و نیز جا دارد بخدائیکہ - خرد آفریدہ و خردور برگزیدہ - بدیں گراں مایگی و صاحب دلی در بنگالہ دیگرے نخواھد بود - یا رب ایں گوھر گرامی از کدام کان ست ، و ایں گرامی گوھر (گرامی ذات) از کدامیں دودماں - بارے چوں نخستیں صحبت بود بچارہ جوئی و مصلحت پرسی درد سر ندادم و دو سہ ساعت نشستہ بغم کدہ بازآمدم آوخ (افسوس) کہ دریں روزھا نواب را با حکام ھگلی در خصوص زمینے کہ وقف امام باڑہ است معارضہ در پیش و دل سرگرم فکر کار خویش ست - وللہ و در القائل -

ھمہ را ماتمی حسرت دنیا دیدم
چوں بعشرت کدۂ گبر و مسلماں رفتم

روزگار فرماں بر و بخت فرماں پذیر باد'' -

ایک اور خط میں مولوی صاحب ممدوح کو دیگر حالات کے بعد کلکتے کے مشاعروں اور اپنے معترضوں کا حال اس طرح لکھتے ھیں ''از نوادر حالات ایں کہ سخنوراں و نکتہ رساں ایں بقعہ پس از ورود خاکسار بزم سخنے آراستہ بودند - در

هر ماہ شمسی انگریزی روز یک شنبۂ نخستیں سخن گویاں در مدرسۂ سرکار کمپنی فراہم شدندے ، و غزلہاے ہندی و فارسی خواندندے ناگاہ گراں مایہ مردے کہ از ہرات بسفارت رسیدہ است دراں انجمن می رسد ، و اشعار مرا شنودہ ببانگ بلند می ستاید ، و بر کلام نادرہ گویان ایں قلمرو تبسم ہائے زیر لبی می فرماید ۔ چوں طبائع بالذات مفتون خودنمائی ست ۔ ہمگناں حسد می برند ، و کلانان انجمن و فرزانگان فن بر دو بیت من اعتراض نادرست بر آوردہ آں را شہرت می دہند ۔ وبے آنکہ مرا زباں بپاسخ آشنا شود ۔ از دانشوراں ۔ کہ مخدومی و ملاذی نواب علی اکبر خان و مکرمی و مطاعی مولوی محمد محسن ازانانند ۔ جوابہا می یابند ، وپس زانوے خموشی می نشینند ۔ چنانچہ ہم بہ فرمان ایں دو بزرگوار مثنوئے انشا کردہ ام ، و بعد از اظہار عجز و انکسار خویش جوابہاے اعتراض در آں ابیات موزوں ساختہ ؛ و آں مثنوی (یعنی مثنوی باد مخالف) پسندیدہ طبع عالمے افتادہ است ۔ انشاء اللہ العظیم زیں بعد عریضۂ کہ بہ والا خدمت خواہد رسید ورقے ازاں ابیات در نورد آں خواہد بود'' ۔

نواب ضیاء الدین احمد خان اکبر آباد گئے ہوئے ہیں ، مرزا آن کو اپنے قدیم وطن اکبر آباد کی یاد میں دلی سے اس طرح لکھتے ہیں ''جان برادر ! اشک و آہ غالب نامراد یعنی آب‌وہواے اکبر آباد بہ شما سازگار باد ۔ گرفتم کہ خود را بسفر گرفتہ (یعنی فرض کردہ‌اید) ونزدیک خود (یعنی بدانست خود) از من دور تر رفتہ اید ؛ اما چوں ہنوزم در وطنید ہمانا کہ نزدیک بامنید ۔ شادم کہ شوق

دور اندیشی دیده ودل را دریں سفر باشما فرستاد ، تا همدریں غربت (یعنی در دهلی) شادمانی دیدار وطن نیز توانم داد - زینهار اکبرآباد را بچشم کم (یعنی بچشم حقارت) ننگرند ، و از رهگذرهاے آں دارالحفیظ گوئی ، والامان سراے ، گذرند ، که آں آباد چه ویراں و آں ویرانه‌آباد بازی‌گاه همچو من مجنونی، وهنوز آن بقعه را در هر کف خاک چشمه خونی ست - روزگارے بود که دراں سرزمیں جز مهرگیا (نام رستنی) نه رستے ، وهیچ نهال جز دل بار نیاوردے - نسیم صبح دراں گل‌کده (یعنی آگره) به مستانه وزیدن دلهارا آں مایه از جا برانگیختے (یعنی بشورش آوردے) که رنداں را هواے صبوحی از سر ، وپارسایان را نیت نماز از ضمیر فروریختے - هر چند هر ذره خاک آں گل زمیں را از تن پیامے بود دلنشیں، وهر برگ آں گلستاں را از جاں درودے بود خاطرنشاں ؛ اما تازگی وقت شما را در نظر داشته در دو پرده شور پرسش برانگیخته بود ، وچشم براه داشت که کے نویسند ، و دریغ که هیچ گاه ننوشتند که رخش سنگیں (یعنی اسپ سنگیں که در اکبر آباد معروف است) دعائے مرا بکدام ادا پذیرفت ؟ و دریا بپاسخ سلام من بزباں موج چه گفت ؟

نواب عبدالله خاں صدرالصدر میرٹھ برادر نواب محمد سعید خاں مرحوم رئیس رام پور نے مرزا کو لکھا ھے که رئیس ممدوح کی شان میں قصیده لکھو مگر اس زمانے میں مرزا پریشاں بهت هیں اس لیے آن کے جواب میں لکھتے هیں ”خدام بلند مقام که سرانجام قصیده از غالب بے نوا چشم داشته اند مگر آں فرسوده رواں افسرده دل را که هنوز نه مرده است زنده پنداشته اند -

گمان زیست بود بر منت ز بیدردی
بدست مرگ ولے بدتر از گمان تونیست

کاش که کشایش ایں کار چوں صنعت نقاشی و گلدستہ بندی تنہا بکوشش دست وبازو صورت بستے ، تا چشم از خستگی دل پوشید مے ، وفرماں پذیرانہ در پردازش کار کوشیدمے ۔ چہ کنم چوں سرایں رشتہ در دست دلست ۔ تا دل بر جاے نباشد زبان سخن سراے نباشد ۔ دیدہوران صاحب دل دانند کہ چہ قدرھا دیدہ و دل بہم آمیختہ شود ، تانقشے ، بداں شگرفی کہ بالغ نظراں پسندند ۔ انگیختہ شود ایں دل شکستہ بہم نہ پیوستہ ۔ کہ در سینہ من ، و ھمانا دشمن دیرینہ من ست ۔ زنہار بکار سخن‌گستری نیاید ، معنی‌آفرینی را نشاید ۔ ....''

قاضی عبدالجمیل بریلوی نے کچھ غزلیں اول ھی مرتبہ اصلاح کے لیے بھیجی ھیں اُس کے جواب میں اصلاح کے متعلق لکھتے ھیں ''خواھش حک و اصلاح مہر افزود ۔ چندانکہ دیدہ بداں سواد دوختم نازیبا صورتے بنظر درنیامد ھنجار و روش خود از نیروھاے درونی ست ۔ آرے نے خامہ در بنان ھرکس خرامے دیگر دارد ۔ آموزش را دریں پردہ راہ نیست ۔ و اگر گویند ، ھست ، ھر آئینہ مےتوانم گفت کہ نیست مگر بہ ھمنشینی و ھمزبانی آموزگار بسربردن روزگار در سرہ کردن گفتار ، چوں صحبت صورت ندارد ، و گفتہ آمد کہ ھرچہ بہر نمط گفتہ اند نہ غلط گفتہ اند ۔ می باید حلقہ بر در دل زد ، و ھمت از مبداء فیاض دریوزہ کرد ۔ بکثرت مشق ، و فراوانی ورزش و پیروی رھروان راہداں ، کشاکش‌ها روے خواھد

نمود ؛ و اندیشه را دستگاہ گفتار را سرمایہ خواہد افزود،،

مولانا فضل حق مرحوم کو ایک خط میں خط نہ بھیجنے کی شکایت لکھی ہے اور ایک قصیدہ جو حمد میں عرفی کے سب سے پہلے قصیدے پر لکھا ہے، خط کے ساتھ بھیجا ہے اور اس کی داد چاہی ہے، وہ خط بجنسہ لکھا جاتا ہے۔

سبحان اللہ ! با آنکه از فراموش گشتگانم ، و دانم که دوست مرا به دو جو بلکه به نیم خس برنگرید۔ ہرگاہ بساز دادن آہنگ گلہ روے آرم ، و سنجم که ایں پردہ (یعنی نغمہ) را بے پردہ (یعنی بے تکلف) مے توانم سرود ، و از قہرمان اندیشہ دور باشے (یعنی امتناعی) درمیاں نیست ہر آئینہ۔ بدیں شادمانی کہ ہنوزم با دوست روے سخنے ہست۔ آنچناں بر خویشتن می‌بالم کہ غم جان گداز فراموشی فراموش ، ولب از زمزمۂ کہ دل در بند سرودن آنست (یعنی شکایت) خاموش می گردد۔

از خویشتن بذوق جفا با تو ساختیم
با ما دگر مساز کہ ما با تو ساختیم

دریں روزہا ہواے آں در سر افتاد کہ بیتے چند کہ در توحید مجیباً لعرفی گوید۔ آید۔ چوں کوشش اندیشہ بجائے رسید کہ نہ عرفی را محل ماند ، ونہ مرا جاے۔ ناگزیر آں ابیات رابر کسے عرضہ میدارم کہ چوں من صد و چوں عرفی صد ہزار را بہ سخن پرورش تواند کرد ، و پایۂ ہریک بہریک تواند نمود۔ والسلام۔،،

یہاں تک ہم نے مرزا کے مکاتبات میں سے جو بجاے خود

ایک دفتر طویل‌الذیل ہے کسی قدر صاف اور سلیس عبارتیں انتخاب کرکے لکھی ہیں اگرچہ اس قسم کی اور بہت سی عبارتیں اور خطوط مرزا کے مکاتبات میں سے انتخاب ہوسکتے ہیں مگر کتاب کا حجم بہت بڑھ گیا ہے اس لیے ہم اسی قدر قلیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس انتخاب کے بعد ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کی دل چسپی کے لیے اُن مشہور اُستادوں اور نثاروں میں سے جن سے ہندوستان کے لوگ بخوبی واقف ہیں، چند شخصوں کی نثر کا مقابلہ مرزا کی نثر سے اس طرح کیا جائے کہ جو عبارتیں مرزا اور دیگر اشخاص کی نثروں میں متحدالمضمون پائی جائیں اُن کو ایک دوسرے کے محاذی لکھ دیا جائے اور اس بات کا اندازہ کرنا، کہ کونسا مضمون کس پایۂ کا ہے اور کونسا کس درجے کا، ناظرین کے ذوق و وجدان پر چھوڑ دیا جائے۔

سب سے پہلے ہم دو متحد المضمون مقام سہ نثر اور مہر نیمروز سے نقل کرتے ہیں۔ ظہوری نے دوسری نثر میں ابراھیم عادل شاہ والی بیجا پور کی نو صفتیں الگ الگ بیان کی ہیں - جن میں سب سے اول معرفت الٰہی کا ذکر کیا ہے اور شاعرانہ مبالغے کے ساتھ اپنے ممدوح کو اس صفت سے موصوف کیا ہے - مرزا نے مہر نیمروز کے دیباچے میں حمدونعت کے بعد بہادر شاہ مرحوم کی مدح کے موقع پر اپنے شاعرانہ انداز میں اُن کو بادشاہی اور درویشی کا جامع قرار دیا ہے اور مثل ظہوری کے نظم و نثر دونوں میں یہ مضمون ادا کیا ہے، چنانچہ ہم دونوں کتابوں سے وہ مقامات مقابل یکدگر نقل کرتے ہیں۔

ظهوری

تاجداری لفظ و معنی به حشمت ثنای تارک آرئیست که سمی خلیل خود یعنی ابراهیم عادل شاه را در هفت اقلیم به نه صفت یگانهٔ و ممتاز گردانیده اول معرفت که باوجود حجب کثرت در مشاهدهٔ شاهد وحدت معنی کلام معجز نظام ''دلو کشف الغطا ازدوت یقنیاً'' وصف حال او ساخته گلستان نیت و بوستان عقیدتش از خس و خا شاک شک و شبه پرداخته مجموعهٔ عرفان موحداں فردے از دفتر شناسائیش، عتف و اشتلم ماسوے پسندیدهٔ طبع مواسائیش به توضیح بیانش نشانهاے بے نشاں (یعنی ذات بے نشاں) همه دل‌نشیں و خاطرنشاں ۔ به آفتاب جهاں گرد تاکید نظر بر دوربیناں نینداختن، و به مصور قضا تهدید به احوال احوالان نپرداختن زنار را با سبحه نه پیوندیست که گسیختنش بر کشاکش کشیشاں (یعنی قسیساں) نه خندد، و کفر را با ایماں نه سریست که صداعش صندل چاره از پیشانی برهمناں نبرد ۔ از صدمهٔ توحیدش دوئی در یکی گریخته، وبهٔ علاقهٔ تجریدش خودی در توئی آویخته گوشے حق شنو، چشمے حق بیں، دلے حق جو، خاطرے عرفاں زا، سینهٔ معرفت خیز، تار کے آسماں سا، جبههٔ سجده ریز ۔

از انجاکه بعد هر دور طورے دیگر ست ، و پس از هر انجام سر انجامے جداگانه ؛ در هر عهد عهد اسمے دیگر ست (یعنی اسمے دیگر از اسمائے الٰہی) و در هر وقت وقت کشایش طلسمے دیگر ۔ فره ایزدی (شان الٰہی) که چندے را بنام آوری شکوه عز و غنا از سیما درخشیدے ، و اندے را به نشان مندی فقر و فنا فروغ بخشیدے ۔ مظهرے کامل و مرآتے روشن خواست تا دراں مظهر ظهور هر دو رنگ ، و دراں مرآت رویت هر دو صورت یکباره رو دهد ۔ اورنگ و منبر یکے شد ، و وسّاده و سجاده را دوئی از میان رفت ۔ درفش کاویانی (که نشان بادشاهی ست) از عصا و ردا که هر دو شعار درویشان و هر دو درفش جمع آمده) منت پذیرفت که پیدائی من به پیوند این دو جزو باز بسته است و عصا و ردا درفش را سپاس گفت که دریں صفحه (یعنی در درفش) نقش جمعیت ما رسا نشسته ست ۔ به یک دگر خوردن ایں دو قدح (یعنی فقر و سلطنت) مجمع البحرینے پدید آورد ، و سر بهم آوردن ایں دو قوس نقش دائرهٔ پدیدار کرد ۔ از سر جوش فروغ مهر و ماه بافشردن و پالودن و سرشتن پیکرے ساختند ، و بهر دفع گزند چشم بد از پروین و پرن براں پیکر سپند سوختند سرش را بتاج شاهی افراختند ، دوش را بنور الٰہی افروختند***زهے در انجمن خلوت نشین و به پادشاهی کار آگهی گزیں ۔ پادشاهاں در انجمن ازاں کار آگه ، ادب آموخته ، درکار آگاهاں در خلوت ازاں پادشاه فیض اندوخته ۔

ظهوری

پای رفعت بر آسمان دارد
سر خدمت بر آستان دارد

در عبادت به گفتن و دیدن
طرز او طرز حق پرستیدن

خلوت دیگران و صحبت او
وحدت این و آن کثرت او

در دلش این و آن نمی گنجد
هیچ جز حق دران نمی گنجد

بت شکن گشت چون خلیل نخست
بادش ازرانی اعتقاد درست

کفر در فکر نکتهٔ عرفان
شرک در شکر نعمت ایمان

طینتش باج خواه طینت ها
نیّتش پادشاه نیت ها

در عبادت زهے تنومندی
بندگی درخور خداوندی

سر وحدت بمغز برد از پوست
همه او کرد خویش را همه اوست

غالب

اے کہ از راز نہاں آگہ نۂ
دم مزن از رہ کہ مرد رہ نۂ
در[1] ہزاراں مرد مرد رہ یکے ست
آدمی بسیار امّا شہ یکے ست
ور تو مے پرسی کہ مرد راہ کیست
جز سراج الدین بہادر شاہ کیست
در طریقت رہنماے رہرواں
در خلافت پیشواے خسرواں
آنکہ چوں از راز وحدت دم زند
دفتر کون و مکاں برہم زند
آنکہ چوں در نے نوا را سر دہد
نے شود نخلے کہ شبلی بر دہد
شبلی از منبر دہد آواز عشق
شاہ ما بر تخت گوید راز عشق
عشق دارد پایۂ ہر کس نگاہ
منبر از شبلی تخت پادشاہ
آنچہ ابراہیم ادہم یافتست
بعد ترک مسند جم یافتست
شاہ ما دارد بہم در رہروی
خرقۂ پیری و تاج خسروی
شاہی و درویشی اینجا باہم ست
پادشاہ عہد قطب عالم ست

---

۱ - یہ شعر مثنوی معنوی کا مشہور ہے اسی لیے مرزا نے بغیر حوالے کے یہاں لکھ دیا ہے اور شہ کے لفظ نے یہاں نہایت لطف پیدا کردیا ہے - ۱۲

شیخ علی حزیں اور مرزا کے طرز بیان کا مقابلہ

شیخ نے جو اپنے دیوان کا دیباچہ لکھا ہے اس میں وہ فخریہ فقرے، جو اس نے اپنے دیوان اور اپنے کلام کی شان میں لکھے ہیں، اسی قسم کے فقرے مرزا نے بھی دیوان فارسی کے دیباچے میں انشا کیے ہیں - سو دونوں دیباچوں میں سے ہم ملتے جلتے فقرے انتخاب کر کے اس مقام پر مقابل یک دگر لکھتے ہیں -

حزیں

ھمایوں خطہ ایست لبالب از جواھر حکم - روح پرور ھوایش ربیعی اعتدال، و جدوال سطورش از ماء معین مالا مال - خاکش مشکیں، نفس و شمیش عنبرآگین، آبش خمار شکن و نسیمش مسیح آئین از صبوحی فیضے کہ ساقی کلکش پیمودہ - سیاہ مستان حروف سر درکنار ہم غنودہ اند، و از نشۂ ھوش پردازے کہ دست فکرت در جام و سبوئے الفاظش ریختہ - خرد مستان معنی نشید، شوق سرودہ بنام ایزد حسن لیلیٰ ست کہ از طرف خیام الفاظ سر برزدہ در جلوہ‌گری ست، یا شور مجنونے ست کہ از وادی تفسیدہ دل برخاستہ درپردہ دریست یوسفستانے ست از گل پیراھناں در موج، نگارستانے ست سمیں بدنانش فوج در فوج، سہی پیکرانند درخیابان سطور دوشا دوش، مغاں شیوہ دلبرانند از بادۂ ناز گرم نوشا نوش، نازک بدنانند حجاب پرورد گل پیرھانند تنہا گرد - پختہ مغزانند برشتہ پوست، بے گانہ نغزانند آشنا دوست - صوفیانند در وحدت خانہ عشق مست سماع، سوختگانند سپند آسامست

حزیں

وداع - درویشانند تجرد کیش ، فرد کیشانند از همه در پیش - شیر صولتانند از جوشن خط پلنگینه پوش ، دریا دلانند از شورش عشق در جوش و خروش - آئینه پیکرانند آئینه تاب ، پاکیزه گوهرانند یکسر خوشاب - گل برگہاے شبنم زده بہاری ست ، خراشیده نالہاے بلبل شاخساریست -

غالب

بنام ایزد و نخستیں نقابیست از روی شاهد هر هفت کردۂ معنی بجنبش نسیم بر آفتاده ؛ یعنی کشاکش دست ناکشیده - باز پسیں چراغیست از گرمی چراغان نیم سوخته پہلو رخ به افروختن داده ؛ یعنی داغ منت خس نادیده - کہن داغہائے جنون ست سراسر بناخن شوخی نفس خراشیده گرماگرم خون نابه درونست به تف پنہانی دل ناگه از ناسور تراویده کاغذی[1] پیرهنانند (یعنی داد خواهانند) چون پیکر تصویر از حیرت واقعه خاموش (یعنی اپنی بے قدری سے حیران هیں) مشعل بکف گرفتگانند (یعنی فریادیانند) چوں آذر از دود دل سیه پوش*** نگویم دود و چراغست

یا لاله و داغ ! امّا سوختگی را سرگزشت است و خستگی را روئداد - نگویم تجلی و طور است ، یا جنت و حور ، اما نازش را قلمروست و آرامش را سواد (نواح) طلسم شعلۂ و دودست باز بستۂ زردشت خیال ؛ شعله پنہاں ، و دود پیدا ، دل لوح طلسم ، و زباں طلسم کشا -

---

۱ - الفاظ کو اس لیے که وه کاغذ پر مرقوم هیں' کاغذی پیرهن' کہا هے اور کاغذی پیرهن داد خواه کو کہتے هیں - دوسرے فقرے میں معانی کو اس لیے که آن کی روشنی حروف کی سیاهی میں پوشیده هے مشعل بکف اور سیه پوش کہا هے - ۱۲

هنگامہ ابر و باد ست برانگیختہ جادوے فکر؛ ابر گہر پاش، و باد الماس فشاں، اندیشہ طومار نیرنگ، و لب افسوں خواں ۔ دود کبابیست بانداز پیچ و تابے کہ از شعلہ در دل افتادہ ست بر ہوا تتق بستہ خیل غزالے ست بسامان جنبشے کہ در کمیں گاہ روا دادہ است ۔ از دم بدرجستہ ۔ جالیست در پردہ نمائش خویش مشاطہ حقیقی را ستایش نگار ۔ نہالے درست سایہ برومندی خویش نخلبند ازل را سپاس گزار ۔

مرزا اور ابوالفضل کی طرز بیان کا مقابلہ

مرزا نے مہرنیمروز میں اکثر تاریخی واقعات وہی لکھے ہیں جو شیخ کے اکبر نامہ میں مذکور ہیں، مگر چونکہ مرزا نے اُن واقعات کو کسی قدر کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ اپنی خاص طرز میں لکھا ہے اس لیے دونوں کتابوں کی طرز بیان میں بہت فرق پایا جاتا ہے ۔ ہم یہاں ایک سیدھا سادہ واقعہ دونوں کتابوں سے نقل کرتے ہیں ۔

اکبر نامہ

ترک بزرگترین فرزندان یافث بود ۔ ترکاں او را یافث اوغلاں گویند و بہ ہوشیار دلی و کارگزاری و رعیت پروری از ہمہ برادراں امتیاز داشت ۔ بعد از رحلت پدر بر تخت فرماں روائی نشست، و داد مردمی و مردانگی و مظلوم پرستی داد ۔ و در جائے کہ ترکاں او را اسیلول باسلیکائی مے گفتند، و چشمہ ہاے آب سرد خوشگوار و گرم عافیت بخش و مرغزار ہاے دلکش داشت ۔ اقامت فرمودہ ۔ از چوب و گیاہ خانہ ہا اختراع کرد، و خرگاہ پدید آورد و از پوست بہایم و سباع لباس پوشیدنی دوخت، و نمک در زمان او ظاہر شد ۔ و در آئین آواں بود کہ پسر را جز شمشیرے میراث ندہند و تمام

خواسته دختر را باشد ـ وگویند که او معاصر کیومرث اول ملوک عجم ست ، و او اول سلاطین ترکستان ست ـ و عمر او دویست و چهل سال بود ـ النجه خان بهترین فرزندان ترکی بود ـ چون پهانهٔ زندگی ترکی پرشدن گرفت او را بمشورت بزرگان بر تخت سلطنت نشانده ـ او خرد دوربیں را پیشواے خود ساخت درعدالت‌گستری روزگا گزارند ـ چون پیر شد عزلت اختیار فرمود ـ دیباقچی بعد از عزلت پدر و اشارت عالیشں فرمان روا شد ـ کیوک خان فرزند رشید اوست پدرش در هنگام پدرود کردن جهان سریر خانی باو عنایت فرمود ـ او قدر سلطنت را دانسته در لوازم آن اهتمام بجائے آورد ـ النجه خان پسر اوست در آخر عمر پدر ولیعهد شد ـ داد و دهش را ز اندازه بیرون برد ، و ترکان در زمان دولت او مست دولت شده از راه خرد مندی عدول نمودند ـ و چون مدتے بران بگذشت او را دو پسر بیک شکم آمد ، یکے را مغل نام کرد و دیگرے را تاتار ـ و چون بحد کاردانی رسیدند ملک خود را به دو حصه بخش کرد ، یک نصف را به مغل داد و نصف دیگر را به تاتار ـ و چون پدر بزرگوار ایشان ودیعت حیات سپرد ، فرزندان با یک دگر موافقت نموده هر کدام در ولایت خویش خود آرائی مے کردند ـ

مهر نیمروز

ترک ابن یافث نشان جهانداری یافت و ترکان ایں والا شکوه را ازاں روکه به ترکی شهریار جوان را اوغلان گویند ، یافث اوغلان گفتند ـ داد و دانش آئین داشت ، و دریں هر دو شیوه روشهاے گزیں داشت ـ خانی و مرزبانی را فرهنگ ها پدید آورد ، و فرماندهی و فرمانبری را اندازه

برنهاد - و نزهت‌گاه سیلول باسلیقا را ، که چشمه هاے روان و گل و میوه فراوان داشت ، از بهر آرامش گزید - از - و علف و چوب وگیاه نشیمن ها افراختے ، و پوست دام و در را پوشش تن ساختے - گویند نمک بروزگار وے پدید آمد ؛ ورنه ازان پیش ترۂ و گوشت بے نمک همی خوردند - ترکان شمشیرزن را بفرمان فرزانه شیر افگن (یعنی نافث اوغلان) برنهاد (دستور) و قرار داد آن بود که ازان همه برگ و ساز که از مرده مروری (میراث) باز ماند جز شمشیر به پسر نه دهند و همه به دختر بازگزارند که هر آئینه تیغ جوهر دار فر و فهرست گنجینه سیم و رز بلکه کلید فتح هفت کشور ست - اگر بدین پلارک الماس گون دسترس ست مرد را دست مایه ناز بس ست - بالجمله این همه رسم و آئین نهاد و پایان کار پس از دویست و چهل ساله بیداری بخواب عدم سر بر زمین نهاد - بزرگان دوده پس از یافث اوغلان به فرزند بخت بلندش ایلنجه خان چشم روشنی گفتند - که کج نهاد و راستی پیشه‌گزید - بدی پیرامون دلش نگذشتے ؛ و بابدان هم زبان نگشتے - آزاده رو بود و دل بیاد یزدان در گرو داشت - تاج و تیغ و نگین در زندگانی خویش ، به نوباده باغ کامرانی خویش دیباقچی خان جوان بخت نوجوان سپرد ، و خود ازین خار زار دامن برچید - و بآفرین خانه ، که توآن را صومعه گوئی آرمید - دو صد و پنج سال پارۂ به نموداری اقبال و پاره به پرستاری ذوالجلال درجهان گذران ماند ، و به‌هنگام ناگزیر درگذشت - دیباقچی خان که هم در نظرگاه پدر اورنگ آرائے بود ، اورنگ خسروی را برنمطے تازه آراست ؛ امّا بدین دانشوری و دادگری که جز دانش نه جست و جز داد

نه کرد ، روز نامه عمرش چوں رقم یک صد و هشتاد و شش سالگی پذیرفت ، در نوشتند ؛ و بار نامه کج کاهی و گردن کشی بنام پسر فرخ اخترش کیوک خاں نوشتند ـ ستوده ستایش درخور بکار آگاهی آبروے پادشاهی افزود ـ و یک صد و چهل سال از مرگ اماں یافت ـ فرزانه تا از شاهی نشان یافت

جهاں را به خوشی و خشنودی و جهانیاں را به مهر و آزرم نگاه داشت و سرانجام کار جهاں و جهانیاں را بفرزند خویش ، النجه خاں گذاشت به تر دستی دریا کف ، و به بے دریغ بخشی ابر کردار بود ـ دهش را بر داد بیشی داد وفرودستاں (زیر دستاں) را به دهش از خواهش بے نیاز ساخت ـ سبک سراں به باد ثروت (یعنی به کبر و غرور) از جا رفتند ـ و از دائره کیش و آئیں بدر زدند ـ آرامشداد (یعنی انتظام) کنارگرفت ، وبت پرستی صورت پذیرفت ـ بانوی ایں فرمانروائے بابرگ ونوا دوپسر توام زاد ـ اورنگ نشیں (یعنی النجه خاں) یکے را مغل خاں و دیگرے را تاتار خاں نام نهاد ـ هر دو را بناز پرورد ـ چوں به برنائی رسیدند قلمرو خویش را دو نیم کرده نیمه به مغل و نیمه به تاتار نامزد کرد و خود یک صد و بست وهفت سال درگیتی درنگ درزیده پے رفتگاں برداشت ـ الله الله ایں را نیز چوں روز فرورفتگاں دگر روز فرو رفت :

ریزد آں برگ و ایں گل افشاند
هم خزاں هم بهار درگزر است

خاتمہ

مرزا غالب مرحوم کی لائف اور اُن کے کلام کا انتخاب، جس قدر کہ یہاں اُس کا دکھانا مقصود تھا، ختم ہوگیا مگر ابھی چند ضروری باتیں لکھنی باقی ہیں۔

ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ بات اُن تصنیفات میں شمار نہیں ہوسکتی جن کی آج کل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے اور جو اہل وطن کی موسمی بیماریوں کے لیے براہ راست دوا اور علاج کا کام دے سکتی ہیں کیوں کہ اس مضمون کے لکھنے پر ہم کو اس اندھی اور بہری دیوی نے مجبور کیا ہے جس کی زبردستی اور حکومت کے آگے مصلحت اندیشی کے پر جلتے ہیں۔

مستانہ سخن می رسد از دل بہ لب ما
عشق ست کہ بر بستہ زبان ادب ما

راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدو شعور سے آج تک برابر چلا جاتا ہے، اُس کو چاہو اُس معتقدانہ جوش عصبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے اور چاہو اُس یقین کا ثمرہ خیال کرو جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے، بہر تقدیر یہی وہ چیز تھی جس نے ہم کو اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا؛ پس نہ ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اس تالیف سے پبلک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے اور نہ یہ خیال ہے کہ محض ملک کی خیر خواہی اُس کے لکھنے کا باعث ہوئی ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ جو کام محض طبیعت کے اقتضا سے نہ کہ عقل کی صوابدید سے سرانجام کیا جائے، اُس

سے لوگوں کو بواسطہ کسی طرح کچھ فائدہ نہ پہنچے۔ ہوا جو اپنی موج میں چلتی ہے اور دریا جو اپنے جوش میں بہتا ہے، گو اُن کو خود خبر نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اُن کی سعی محض بے حاصل اور اُن کی کوشش سراسر بے سود ہے؛ اسی طرح کوئی ذرہ ذات عالم میں ایسا نہیں جو اپنی اضطراری حرکت سے نظام کلی میں کچھ نہ کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔

"اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بره تو روی نیست
در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری"

یادگار غالب کو ہم نے دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں مرزا کی لائف یعنی اُن کی زندگی کے حالات اور اُن کے اخلاق و عادات کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں اُن کے کلام کا انتخاب ہے۔ اگرچہ مرزا کی لائف میں جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں، کوئی مہتم بالشان واقعہ اُن کی شاعری و انشا پردازی کے سوا نہیں پایا جاتا با ایں ہمہ اُس میں بہت سی مفید نصیحتیں بھی اہل وطن کے لیے موجود ہیں۔

ناظرین کو یاد ہو گا کہ مرزا پانچ برس کے تھے جب باپ کا اور نو (۹) برس کے تھے جب چچا کا انتقال ہوا۔ اُن کی ننھیال جہاں اُنھوں نے پرورش اور نشو و نما پائی، آسودہ حال تھی، باپ اور چچا کے صغیر سن چھوڑ جانے سے نانا اور نانی کی الفت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہوگی۔ خود مرزا کی طبیعت میں گرمی اور جودت کی ایک آگ بھری ہوئی تھی جس کے بھڑکانے کے لیے تھوڑی سی اشتعلک کافی تھی۔ باپ

اور چچا کا سایۂ تربیت بچپن میں سر سے اُٹھ جانا ، ننھیال کی مرفہ‌الحالی ، نانا نانی کی نازبرداریاں اور خود مرزا کا ذکی‌الحس ہونا ؛ یہ تمام اسباب ایسے تھے کہ عنفوان شباب میں اُن کا جادہ مستقیم سے تجاوز نہ کرنا نہایت دشوار تھا ۔ مرزا کی ابتدا بگڑی اور ایسی بگڑی کہ جب تک ننھیال کی تمام املاک اور دیہات کی صفائی نہ ہولی ، نشے ہرن نہ ہوئے ۔ اگرچہ مرزا بہت دیر میں سنبھلے مگر وہ جو مشہور ہے کہ ''صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو بھولا نہ جانو'' انھوں نے اپنے فضل و کمال ، حسن معاشرت ، شریفانہ خصائل اور کریمانہ اخلاق سے جو کہ ان کے ذاتی جوہر تھے ، وہ عارضی دھبے اس طرح دھو ڈالے کہ گویا ان سے دامن آلودہ نہ ہوا تھا ۔ جس فن پر اُنھوں نے لڑکپن میں ہاتھ ڈالا تھا اس کو اخیر عمر تک نبھا دیا ، غفلت اور بدمستی کے عالم میں بھی اس کا خیال نہ چھوڑا اور باوجودیکہ زمانہ قدر دانوں سے خالی تھا اس کو اس درجے تک پہنچا کر چھوڑا جو اس کا منتہائے کمال تھا ۔

اگرچہ معاش کی طرف سے وہ کبھی زیادہ تنگ نہیں ہوئے مگر حوصلہ اور ہمت کے موافق کبھی استطاعت نصیب نہیں ہوئی بلکہ جن اللے تللوں میں بچپن اور جوانی گزری تھی اس کے لحاظ سے یہ کہنا چاہئے کہ وہ اخیر دم تک حور بعد الکور میں مبتلا رہے ؛ اس کے سوا امراض جسمانی سے کبھی فرصت نہ ملی اور اپنے ہنر کی کساد بازاری کا رنج ہمیشہ سوہان روح رہا ۔ باوجود اس کے زندہ دلی اور شگفتہ طبعی مرتے دم تک اُن کے رفیق حال رہی ۔ اگرچہ نظم و نثر میں جو زار نالیاں انھوں نے کی ہیں وہ بظاہر

بے صبری اور تنگ حوصلگی پر ، جو ایک اخلاقی کمزوری ہے ، دلالت کرتی ہیں لیکن در حقیقت یہ ان کی شاعری و انشا پردازی کے میدانوں میں سے ایک میدان تھا جس کی زمین ان کے پاؤں کو لگ گئی تھی ۔ اول تو خود یہ مضمون ہی ایشیائی شاعری کا جزو اعظم ہے دوسرے ہر شاعر ایک خاص راگنی کا کلاونت ہوتا ہے ؛ چنانچہ عرب کے شعراء میں امرء القیس گھوڑے اور عورت کی تعریف اور عیش کے بیان میں مشہور تھا ، امشیٰ حسن طلب اور وصف شراب میں ضرب المثل تھا اور اسی طرح ہر شاعر کی شہرت کسی خاص بیان کے ساتھ مخصوص تھی ، علیٰ ھذالقیاس ایران میں فردوسی رزم کا دھنی تھا ، نظامی بزم کا نور ، سعدی موعظت کا ۔ چونکہ مرزا خاص کر رنج و مصیبت کے بیان میں ید طولیٰ رکھتے تھے اس لئے یہ مضمون اکثر ان کے قلم سے تراوش کرتا تھا ۔

اگرچہ مرزا اپنی شاعری کا سکہ ، اس وجہ سے کہ زمانہ اس کا اندازہ کرنے سے عاجز تھا ، پبلک کے دلوں پر جیسا کہ چاہئے تھا نہیں بٹھا سکے[1] مگر وسعت اخلاق ، حسن معاشرت اور صلح کل سے انہوں نے ایک عالم کو مسخر کر لیا تھا ۔ قطع نظر شاگردوں اور مستفیدوں کے دوستوں

---

۱ ۔ مولانا حالی اسی کتاب کے صفحہ ۲ پر یوں رقم طراز ہیں :۔

"اگرچہ زمانے نے اپنی بساط کے موافق مرزا کی کچھ کم قدر نہیں کی ۔ ان کا تمام کلام اردو ، فارسی نظم اور نثر ان کے جیتے ہی جی اطراف ھندوستان میں پھیل گیا تھا ۔ ان کے ماننے والے اور مداح و ثنا خواں ملک کے ہر گوشے میں پائے جاتے تھے اور اب تک پائے جاتے ہیں ۔"

کیا یہ تضاد بیان نہیں ہے ؟

داؤدی

اور ہوا خواہوں کی تعداد بھی سینکڑوں سے گزر کو ہزاروں تک پہنچ گئی تھی اور ہر ایک کے ساتھ ان کے برتاؤ کا طریقہ ایسا مہر انگیز تھا کہ ہر شخص اپنے تیئیں ان کے مخصوص ترین دوستوں میں سے شمار کرتا تھا۔ غریبوں اور محتاجوں کی اپنی دسترس سے بڑھ کر خبر لینی، نوکروں اور لگے ملازموں کو عسرت کے وقت اپنے سے علیحدہ نہ کرنا، درماندگی میں دوستوں کی امداد کرنی اور ان کی مصیبت میں مثل یگانوں کے افسوس اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنا، ہر حال میں پاس وضع اور خود داری کو ہاتھ سے نہ دینا، مذہبی تعصبات سے پاک ہونا اور اور ہر مذہب اور ملت کے دوستوں کے ساتھ یکساں صفائی اور خلوص سے ملنا، یہ اور اسی قسم کی خوبیاں جو دارالخلافہ کی قدیم سوسائٹی کا زیور سمجھی جاتی تھیں ان کی ذات میں جمع تھیں؛ خصوصاً وفاداری، حق شناسی اور احسان مندی کی شریف خصلت جو ہندوستان کے قدیم خاندانوں کا شعار تھا، مرزا کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چونکہ ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں لارڈ لیک کی مہمات میں شریک رہے تھے اور ان وفات کے بعد گورنمنٹ نے ان کے پس ماندوں کے لئے جن میں ایک مرزا بھی تھے کئی ہزار روپیہ سالانہ بطور پنشن مقرر کر دیا تھا، مرزا نے جیسا کہ ان کی تحریرات سے ظاہر ہے اخیر عمر تک گورنمنٹ کے اس احسان کو فراموش نہیں کیا۔ تمام عمر ملکہ معظمہ اور ویسراؤں اور لفٹنٹ گورنروں اور دیگر حاکموں اور افسروں اور تمام انگلش قوم کی مدح سرائی میں بسر کی، بعض افسروں کی وفات پر درد ناک مرثیے لکھے

اور ہمیشہ فخر کے ساتھ اپنے تئیں وابستگاں دامن دولت انگلشیہ سے سمجھتے رہے - غدر کے زمانے میں فوج باغی کے ظلم و ستم سے جو اثر اُن کے دل پر ہوا تھا ، وہ اُن کی کتاب دستنبو سے ، جو غدر کے حالات پر اُسی شورش و فتنہ کے زمانے میں اُنھوں نے لکھی تھی ، ظاہر ہے - ۱۲۵۲ھ میں وایم فریزر صاحب رزیڈنٹ و کمشنر دھلی کے بے گناہ مارے جانے پر جو سخت صدمہ اُن کو پہنچا تھا ، وہ اُن کے اُس خط سے جو شیخ امام بخش ناسخ کو اس واقعہ کے ہوتے ھی اُنھوں نے لکھا تھا ، ظاہر ہے - وہ اس خط میں لکھتے ھیں : "یکے از ستمگران نا خدا ترس کہ بعذاب ابدی گرفتار باد ، ولیم فریزر را کہ رزیڈنٹ دھلی و غالب مغلوب را مربی بود ، در شب تاریکے بضرب تفنگ کشت ، و مرا غم مرگ پدر تازہ کرد - دل از جائے رفت ، دسترگ اندوھے سراپائے اندیشہ را فرو گرفت ، خرمن آرامیدگی پاکے بسوخت ، و نقش امید از صفحہ ضمیر سراسر سترده شد" -

اگرچہ مرزا کے کلام میں مدحیہ قصائد کی مقدار تمام اصناف سخن سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور اُنھوں نے جا بجا اس بات پر افسوس کیا ہے کہ عمر کا بہت بڑا حصہ اھل جاہ کی بھٹی میں صرف ہوا مگر ادنٰی تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو فن مرزا نے اختیار کیا تھا ، اُس کی تکمیل اُن کے زمانے کے خیالات کے موافق زیادہ تر اس خاص صنف یعنی قصیدے کی مشق و مہارت پر موقوف تھی کیوں کہ فارسی شاعری کی ابتداء اسی صنف سے ہوئی اور کوئی شاعر جس نے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا ، وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا گیا یہاں تک کہ حکیم سنائی ، شیخ سعدی اور

امیر خسرو جیسے بزرگوں کا دامن بھی اس آلودگی سے پاک نہیں رہا ۔ خود مرزا کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اُس کو شعرا میں شمار کرنا نہیں چاہیے اور اسی بناء پر وہ شیخ ابراہیم ذوق کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا جانتے تھے ۔ بڑی دلیل اس بات کی کہ مرزا نے جس قدر قصیدے اہل دنیا کی مدح میں انشاء کیے ہیں ، اُن سے محض فن کی تکمیل مقصود تھی ، یہ ہے کہ اُن کا ممدوح مخاطب صحیح ہو یا نہ ہو اور اُس سے حسن کلام کی داد ملنے کی توقع ہو یا نہ ہو وہ ہمیشہ قصیدوں کے سر انجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرتے تھے اور ہر قصیدے میں اپنا کمال شاعری اُسی طرح ظاہر کرتے تھے جیسے متنبی سیف‌الدولہ کی یا عرفی خانخاناں کی تعریف میں کرتا تھا ۔ مع ذالک چند قصیدوں کے سوا جو دوستوں کی ترغیب و تحریص سے اُنھوں نے کسی کسی امید یا توقع پر ہندوستان کے بعض رئیسوں کی مدح میں لکھے ہیں ، باقی اُن کے تمام قصائد یا توحید و نعت و منقبت میں ہیں یا اپنے معزز اور لائق ہمعصروں کی تعریف میں اور یا اُن لوگوں کی شان میں جن کو وہ اپنا مربی اور ولی نعمت سمجھتے تھے اور جن کی مدح سرائی کا فرض بطور شکرگزاری و منعم پرستی نہ بامید صلہ و انعام ادا کرتے تھے ، جیسے قلعہ دہلی کے بادشاہ و ولیعہد یا ملکہ معظمہ اور ویسرایان کشور ہند اور دیگر اعیان و ارکان سلطنت انگلشیہ ، یا فرمانروایان ریاست رامپور و الور وغیرہ ۔

با ایں ہمہ جس موثر طریقے سے مرزا نے اہل دنیا کی مدح سرائی پر افسوس کیا ہے ، وہ ملاحظہ کے قابل ہے ۔

وہ دیوان فارسی کے دیباچے میں اپنی شاعری کے متعلق بہت سے فخریہ فقرے لکھنے کے بعد لکھتے ہیں : ”در ہوائے کہ بال بالا خوانی زدہ، و در ادائے کہ خود را بہ شگرفی ستودہ ام (یعنی جس دیوان پر میں نے اس قدر فخر کیا ہے) نیمۂ ازاں شاہد بازی ست یعنی ہوا پرستی (اس سے مراد غزل سرائی ہے) و نیمۂ دیگر تونگر ستائی است یعنی باد خوانی (اس سے مراد قصیدہ گوئی ہے) بیداد ہیں ! کہ ہر جابہ شانہ ۔ خمے از زلف مرغولہ مویاں کشودہ شود بلاد رسن آویزد تا دل بہ بیچاک آں شکن بند سے و خواری نگر! کہ ہرگاہ ازخود غافل و از خدا فارغے بر اورنگ سروری کج نشیند ہوس مرا بر انگیز و تابہ پیشش بندہ دار راست ستمے ۔ شادم از آزادی کہ بسا سخن بہ ہنجار عشقبازاں گزارد ستم ؛ و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بکردار دنیا طلباں در مدح اہل جاہ سیاہ کرد ستم ۔ دریغا کہ عمر سبک خیر لختے بہ جامۂ پارہ و چنگ سرآمدو بدروغ و دریغ رفت“ یہاں تک جو کچھ مرزا کی لائف کے متعلق ہم کو لکھنا تھا لکھا گیا ۔ اب ہم چند سطریں اُن کے کلام انتخاب کی نسبت لکھنی چاہتے ہیں ۔

ہم نے اس کتاب میں ، جیسا کہ مکرر بیان ہو چکا ہے ، مرزا کے کلام کا انتخاب صرف اس غرض سے درج کیا کیا ہے کہ شاعری و انشا پردازی کی غیر معمولی استعداد جو مرزا کی فطرت میں رکھی گئی تھی ، جہاں تک کہ ان کی نظم و نثر اس پر شہادت دے سکتی ہے ، صاحبان ذوق سلیم پر واضح اور لایح ہو جائے ۔ اگرچہ فی الحقیقت طریقۂ مذکور سے اس غرض کا پورا ہونا نہایت دشوار ہے لیکن اگر بالفرض

اس کا پورا ہونا تسلیم کر لیا جائے تو بھی بظاہر اس سے کوئی فائدہ متصور نہیں ۔

زمانہ حال کی ترقیات نے جس طرح علمی دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کردیا ہے اسی طرح لٹریچر کی حالت بہت کچھ بدل ڈالی ہے ۔ قدیم طریقے کی شاعری (اگرچہ ابھی تک اس کا نعم‌البدل پیدا نہیں ہوا) روز بروز نظروں سے گرتی جاتی ہے ، نظم و نثر میں بجائے صنعت الفاظ اور محض خیالی باتوں کے سادگی اور حقیقت طرازی کی طرف طبیعتوں کا میلان زیادہ ہوتا جاتا ہے ۔ جو باتیں پہلے محاسن کلام میں‌داخل تھیں اب ان میں سے اکثر داخل عیوب سمجھی جاتی ہیں ۔ اگرچہ ہندوستان میں قدیم لٹریچر کا تسلط ابھی بہت کچھ باقی ہے اور پبلک کا مذاق عام طور پر نہیں بدلا مگر زمانے کا رخ قدیم شاہراہ سے یقیناً پھر گیا ہے اور آئندہ تمام قافلوں کو جو اس وادی میں قدم رکھنے والے ہیں زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنا ضرور ہے؛ پس اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا شاعر فرض کر لیا جائے تو بھی اس زمانے میں اُن کی نظم و نثر کے نمونے پبلک کے سامنے پیش کرنے اور اُن کے مبلغ کمال کو لوگوں سے روشناس کرانا بظاہر ایک ایسا کام معلوم ہوتا ہے جس کا وقت گزر گیا لیکن ہمارے نزدیک زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اُس کو قدیم نمونوں سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہو سکتا ، خصوصاً ہندوستان کی لٹریری ترقی جس قدر مشرقی زبانوں کے قدیم لٹریچر سے وابستہ ہے ایسی یورپ کے موجودہ لٹریچر سے نہیں ہے ۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے بعض نامور شعرا مشرقی شاعروں کے کلام سے ابتک استفادہ حاصل کرتے

اور اس سے صدھا اسلوب بیان اخذ کرتے ھیں تو ھمارے ھم وطن کیونکر اس سے استغنا کا دعویٰ کر سکتے ھیں۔ جس طرح زمانہ حال کے انجنیئر قدیم عمارتوں اور پرانے کھنڈروں سے انجنیئرنگ کے متعلق صدھا مفید نتیجے استخراج کرتے ھیں اسی طرح اس زمانے کے ناظم اور ناثر قدیم لٹریچر سے بہت کچھ لٹریری فائدے حاصل کرسکتے ھیں۔ ھم نے مانا کہ انگلش لٹریچر کی ترقی منتہائے کمال کو پہنچ گئی ھے اور ھمارے لٹریچر نے اسی کی بدولت کچھ عرصے سے آگے قدم بڑھانا شروع کیا ھے مگر جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں گے کہ ھم کو انگلش لٹریچر سے کونسی باتیں اخذ کرنی چاھئیں اور اپنے قدیم مشرقی لٹریچر سے کیا کیا سبق لینا چاھئے اس وقت تک ھمارا لٹریچر اصلی ترقی سے محروم رھے گا۔

مرزا کے فارسی کلام کا نمونہ جو ھم نے اس کتاب میں دکھایا ھے اگرچہ ممکن ھے کہ وہ زمانۂ حال کے مذاق کے موافق نہ ھو لیکن اس سے مرزا کے کمال شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا، خود ایران کے بڑے بڑے نامور شعرا جو اپنے زمانے میں مسلم الثبوت تھے آج اھل زبان اُن کی طرز شاعری کو نام رکھتے ھیں؛ خصوصاً متوسطین کے طبقے میں جو لوگ جامی کے بعد ھوئے ھیں اور جن میں تقریباً وہ تمام شعرا داخل ھیں جنھوں نے صفویہ اور مغلیہ کے عہد حکومت میں ایران یا ھندوستان میں علم امتیاز بلند کیا تھا، اُن کی شاعری کو جیسا کہ رضا قلی خان ھدایت نے اپنے تذکرۂ مجمع الفصحا میں تصریح کے ساتھ لکھا ھے، آج اھل زبان میں کوئی تسلیم نہیں کرتا، سب قدما کی روش کو پسند کرتے ھیں

اور اُنھیں کے تتبع کا دم بھرتے ھیں ، حالانکہ متوسطین کے طبقے میں بڑے بڑے نامور شعرا گزرے ھیں جن کے کمال اور اُستادی کا انکار نہیں ھوسکتا ۔ پس درحقیقت کسی کی شاعری یا انشاپردازی کا پبلک کے موجودہ مذاق کے خلاف ھونا اس کے سوا کچھ معنی نہیں رکھتا کہ جو شے پہلے ایک خاص وضع کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی ، وہ اب دوسری وضع کے سانچے میں نہیں سما سکتی ۔

اگرچہ مرزا کی شاعری نے شعرائے متوسطین کے محدود دائرے سے قدم باھر نہیں رکھا ، وھی چند میدان جن میں اُنھوں نے گھوڑے دوڑائے تھے ھمیشہ مرزا کے جولان گاہ رھے لیکن جس درجے کا ملکۂ شاعری اُن کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا اُس سے پایا جاتا ھے کہ جس طرح دریائے مواج جدھر رخ کرتا ھے اُدھر اپنا رستہ برابر نکالتا چلا جاتا ھے اسی طرح وہ جس میدان میں قدم رکھتے اُس کو کامیابی کے ساتھ طے کرجاتے ؛ وھی بارود جو آتشبازی میں بچوں کا جی لبھاتی ھے ، جب اُس کو دوسری طرح کام میں لایا جاتا ھے تو بڑے بڑے قلعوں اور پہاڑوں کو پرکاہ کی طرح اُڑا دیتی ھے اور وھی ایک چیز تھی جس نے کُبھیں صرف احباب کے جلسوں اور امیروں کے درباروں کو گرم کیا اور کبھیں ملکوں اور قوموں میں حب وطن اور قومی ھمدردی کی آگ لگادی ۔

اعلیٰ درجے کا ملکۂ شاعری کسی خاص زمانہ یا خاص ملک کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتا ؛ پس یہ سمجھنا بالکل غلط ھے کہ شاعری کی اعلیٰ قابلیت جیسی قدما میں ھوتی تھی ویسی

متاخرین میں نہیں ہوسکتی ، یا جیسی ایران کے شعرا میں ہوتی ہے ویسی ہندوستان کے شعرا میں نہیں ہوتی بلکہ شاعری کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسی مصوری کی قابلیت یا سریلی آواز ؛ جس طرح ان دونوں صفتوں کا ہر زمانے اور ہر ملک میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر پایا جانا ممکن ہے اسی طرح اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا ملکۂ شاعری ہر زمانے اور ہر ملک میں مختلف اسباب سے مختلف صورتوں اور مختلف شانوں میں ظہور کرتا ہے اور سب سے بڑا اور زبردست حاکم جو شاعر کو ایک خاص رنگ پر ڈال دیتا ہے وہ سوسائیٹی کا دباؤ اور مذاق ہے ۔ انیس اسی ملکۂ شاعری کے ساتھ جو اس کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا اگر چوتھی صدی ہجری میں ایران میں پیدا ہوتا اور اسی سوسائیٹی میں نشوونما پاتا جس میں فردوسی نے نشوونما پائی تھی تو ہمارے نزدیک اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ رزمیہ نظم میں وہی رتبہ پاتا جو فردوسی نے پایا تھا اور فردوسی اسی اعلیٰ قابلیت کے ساتھ جو قدرت نے اس کے دماغ میں ودیعت کی تھی اگر ہندوستان کی اس سوسائیٹی کے سائے میں پلتا جو انیس کو میسر آئی تھی تو یقیناً وہ شاعری میں وہی صنف اختیار کرتا جو انیس نے اختیار کی تھی اور اس میں انیس سے کچھ زیادہ قبولیت حاصل نہ کرتا ۔ اسی بنا پر ایران کا ایک متاخر شاعر کہتا ہے :

نیست اندر زمانہ محمودے
ورنہ ہر گوشہ صد چو عنصریست

اور اسی اصول پر غالب مرحوم کہتے ہیں :

تو اے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

مرزا نے جس وقت شعر فارسی کے میدان میں قدم رکھا تھا اس وقت ہندوستان میں دو طرزوں کا زیادہ رواج تھا؛ ایک نظیری و عرفی وغیرہ کی طرز جو اکبر کے زمانے سے چلی آتی تھی، دوسری مرزا بیدل کی طرز جو عالمگیر کے عہد میں شائع ہوئی اور علوی اور صہبائی پر آ کر ختم ہوگئی۔ جو لوگ شعر فارسی میں کمال بہم پہنچانا چاہتے تھے وہ انہیں دونوں میں سے کوئی طرز اختیار کرتے تھے۔ اگرچہ حافظ اور خسرو کی غزل آن سے بہت زیادہ مقبول خاص و عام تھی مگر ان وجوہات سے جو متاخرین کو طرز جدید اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور جن کا ذکر ہم دوسرے حصے میں کرچکے ہیں مرزا نے اول بیدل کی روش پر چلنا شروع کیا، پھر اس نظر سے کہ اہل زبان اس طرز کو ٹکسال باہر خیال کرتے تھے، نظیری و عرفی کی طرز اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ ایک ہندی نژاد شاعر جو ایسے ناپرساں زمانے میں پیدا ہوا ہو اور جس نے فارسی شاعری میں نظیری و عرفی وغیرہ کے کلام سے بہتر کوئی ممکن التقلید نمونہ نہ دیکھا ہو وہ سوا اس کے کہ ان کا اتباع اختیار کرے اور کیا کر سکتا تھا۔ رہی یہ بات کہ آس نے اس طرز شاعری میں کس قدر کامیابی حاصل کی ہے اور ان لوگوں کی پیروی کا کہاں تک حق ادا کیا ہے سو اس کو اس طرح ثابت کرنا تو ناممکن ہے جیسے دو اور دو چار، البتہ جو لوگ شعر اور فارسی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں وہ اکبری دور کے شعرا اور مرزا کے کلام کا مقابلہ کرنے کے بعد امید ہے کہ

مرزا کی اعلیٰ درجے کی قابلیت و استعداد کا اعتراف کریں گے اور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ زمانے کا اقتضا اور سوسائٹی کا دباؤ اس شخص کو جس روش پر ڈال دیتا وہ ضرور اس میں کامیاب ہوتا ۔ چنانچہ اخیر عمر میں جب حبیب قاآنی کے قصائد مرزا کی نظر سے گزرے تو اس کے کلام کی روانی اور بے ساختہ پن دیکھ کر ان کو قاآنی کی روش پر چلنے کا خیال پیدا ہوا تھا اور اسی لئے ان کے سب سے پچھلے قصیدوں اور قطعوں میں بہ نسبت پہلے قصائد اور قطعات کے زیادہ روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے لیکن چونکہ اب دوسری چال چلنے کا وقت نہیں رہا تھا اس لئے اس روش کی تکمیل ہونی نا ممکن تھی ۔

اس کتاب میں جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے ، مرزا کو شاعری کے لحاظ سے جابجا نظیری و عرفی وغیرہم کا جن کو مرزا خود اپنا پیش رو تسلیم کرتے ہیں ، ہم پلہ قرار دیا گیا ہے ؛ سو قطع نظر اس کے کہ کوئی قطعی دلیل اس دعوے پر قائم نہیں ہوسکتی اور ناظرین کے ذوق و وجدان کے سوا کوئی چیز اس کا فیصلہ نہیں کرسکتی کہ یہاں دو اور سوال پیدا ہوتے ہیں ؛ اول یہ کہ ایک زبان داں آدمی شاعری میں اہل زبان کے بھی برابر ہو سکتا ہے یا نہیں ؟ دوسرے یہ کہ ایک پیرو اپنے پیشروؤں کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل کرسکتا ہے یا نہیں ؟ سو دوسرے سوال کا جواب تو بالکل صاف ہے ۔ دنیا میں ابتدا سے آج تک نہ صرف شعر اور شاعری میں بلکہ ہر علم اور ہر فن اور ہر پیشے میں اکثر پیرو اپنے پیشروؤں کے صرف برابر ہی نہیں بلکہ ان سے فائق اور افضل ہوتے رہے ہیں ؛ فردوسی رزمیہ

مثنوی میں اسدی اور دقیقی کا پیرو ہے مگر دونوں سے گوئے سبقت لے گیا ہے ، خواجہ حافظ غزل میں سعدی کے قدم بقدم چلے ہیں مگر سعدی سے بہت آگے نکل گیے ہیں ، قاآنی قصیدے میں تمام قدما سے بڑھ گیا ہے ، میر تقی نے تمام اگلے ریختہ گویوں کو جو یقیناً اُس سے پیشرو تھے ، غزل میں اپنے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے، میر انیس تمام مرثیہ گویوں سے جو اُن سے پہلے ہوئے ، بازی لے گیے ہیں۔ پس اگر مرزا غالب کو فارسی شاعری میں نظیری و عرفی سے افضل نہیں بلکہ صرف اُن کا ہم پلہ قرار دیا جائے تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے ۔

رہا پہلا سوال ، سو ظاہر ہے کہ شاعری کا ہنر دو مختلف لیاقتوں سے مرکب ہے ؛ ایک امیجینیشن یعنی قوت متخیلہ کی بلند پروازی ، دوسرے مناسب الفاظ کے استعمال پر قدرت۔ ان میں سے پہلی لیاقت جیسا کہ ظاہر ہے ، ممکن ہے کہ ایک زبان دان بہ نسبت اہل زبان کے ، ایک کم علم به نسبت فاضل مبحر کے اور ایک دیہاتی گنوار به نسبت خواص اہل شہر کے بمراتب افضل اور اعلیٰ درجے کی رکھتا ہو ۔ دوسری لیاقت اگرچہ بظاہر اہل زبان کے ساتھ مخصوص معلوم ہوتی ہے لیکن اُس میں بھی مثلاً ایک ہندی نژاد اکتساب کے ذریعے سے خاص کر اُس حصہ زبان میں جو فارسی کی محدود شاعری میں مستعمل ہے ، اہل ایران کی برابری کرسکتا ہے ۔ علامہ ابن خلدون عربی زبان کی نسبت جو بمقابلہ فارسی کے نہایت وسیع زبان ہے ، لکھتے ہیں کہ "ایک عجمی (یعنی غیر عربی) فصحائے عرب کے کلام کی ممارست سے اہل زبان میں شمار ہو سکتا ہے" پس فارسی زبان جو به نسبت عربی کے

نہایت تنگ اور مختصر زبان ہے اس بات کے زیادہ قابل ہے کہ ایک ہندی نژاد فصحائے ایران کے کلام کی مزاولت سے اہل زبان میں شمار کیا جاوے۔

مذکورۂ بالا اصول کے موافق کچھ شک نہیں کہ ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ مرزا کو ملکہ شاعری کے لحاظ سے اکبری دور کے تمام شاعروں پر ترجیح دیں یا اُن سے کم سمجھیں یا اُن کے برابر قرار دیں۔ رہی دوسری لیاقت سو اُس کی نسبت پہلے حصے میں جا بجا ذکر کیا گیا ہے کہ مرزا نے ایک نہایت مستند صاحب زبان کی تعلیم و تلقین اور اپنے ذاتی تفحص اور کثرت مطالعہ اور غواصی فکر اور مشق سخن اور خاص کر اپنی خداداد لٹریری قابلیت سے یقیناً وہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا جس سے ایک زبان دان مثل اہل زبان کے مستند سمجھا جا سکتا ہے۔

لارڈ مکالے نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ کوئی شخص غیر مادری زبان میں اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں ہو سکتا۔ بے شک اُن کا ایسا سمجھنا یورپ کی شاعری کے لحاظ سے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یورپ کی شاعری در حقیقت نیچر کی ترجمانی ہے، اُس کا میدان اُسی قدر وسیع ہے جس قدر نیچر کی فضا، اُس کے فرائض مادری زبان کے سوا دوسری زبان میں جیسے کہ چاہئیں، ادا نہیں ہو سکتے بلکہ ایشیائی شاعر جو اس طریقہ شاعری سے نا بلد ہیں، وہ اپنی مادری زبان میں بھی اُس کی مشکلات سے عہدہ بر آ نہیں ہو سکتے، بخلاف ایشیائی شاعری اور خاص کر متاخرین کی فارسی شاعری کے۔ یہاں اُنہیں معمولی خیالات کو جو قدما سیدھے سادے طور پر بیان کر گیے ہیں

نیے اسلوبوں اور نئی نئی نزاکتوں کے ساتھ باندھنا یہی کمال شاعری سمجھا جاتا ہے ؛ اگرچہ یہ بھی فی نفسہ ایک بہت بڑا کمال ہے لیکن ایسی شاعری میں زبان کا صرف ایک محدود حصہ مستعمل ہوتا ہے جس کو غیر زبان والا آسانی سے سیکھ سکتا ہے اور بشرطیکہ اُس میں شاعری کی اعلیٰ قابلیت ہو اُس کو شعرائے اہل زبان کی طرح بلکہ بعض صورتوں میں اُن سے بہتر استعمال کر سکتا ہے ۔

مرزا کا موازنہ نظیری و عرفی کے ساتھ صرف قصیدے اور غزل میں ہو سکتا ہے کیونکہ مثنوی میں نظیری محض صفر ہے ؛ اس نے اُس صنف کو چھؤا تک نہیں ۔ عرفی نے بے شک چند مثنویاں لکھی ہیں ، مگر صاحب آتشکدہ نے اُن میں سے ایک کی نسبت لکھا ہے کہ ''بد نگفتہ است'' اور باقی کی نسبت اُس کا یہ قول ہے ''بسیار بد گفتہ''۔ حکیم ہمام کا بیٹا حکیم حاذق عرفی کی مثنوی کی نسبت کہتا ہے :

مثنویش طرز فصاحت نداشت
کان نمک بود و ملاحت نداشت

البتہ ظہوری کے ساقی نامہ نے ہندوستان میں بہت شہرت حاصل کی ہے مگر اُس کا قصیدہ چنداں وزن نہیں رکھتا ۔ بخلاف مرزا کے اُس کو مثنوی پر بھی تقریباً اُسی قدر شہرت ہے جیسی قصیدے اور غزل پر ۔ نثر میں نظیری و عرفی دونوں نے کوئی یادگار نہیں چھوڑی ۔ البتہ ظہوری کی سہ نثر کو ہندوستان میں بہت فروغ ہوا ہے ، مگر اُس میں اول سے آخر تک ایک بے مزہ کہانی ، یعنی ابراہیم عادل شاہ کی مدح و ستایش کے سوا دوسرے مضمون کا

نام نہیں جس سے لکھنے والے کی قدرت بیان معلوم ہو۔ پس اگر ظہوری کی طرز بیان اور طرز عبارت آرائی کے حسن و قبح سے قطع نظر کی جائے تو بھی اُس کے حق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس کو مدحیہ نثر لکھنی اچھی آتی تھی ۔ بخلاف مرزا کے کہ وہ اپنی طرز خاص میں ہر طرح کے مضامین لکھنے اور ہر طرح کے مقاصد ادا کرنے پر یکساں قدرت رکھتا تھا ؛ خصوصاً فخر و خودستائی ، غم و اندوہ اور شکایت و زارنالی کے مضامین جس خوبی و لطافت اور بانکپن کے ساتھ مرزا نے نثر میں بیان کیے ہیں ، اُس کی نظیر نہ صرف ہندوستانیوں کی نثر میں بلکہ متاخرین اہل ایران کی نثر میں مشکل سے دستیاب ہوگی ۔ مگر افسوس کہ ہم یہ باتیں ایسے زمانے میں لکھ رہے ہیں کہ گو ، ہر شخص آزادی سے اپنی رائے ظاہر کر سکتا ہے ، لیکن فارسی زبان ہمارے ملک میں بمنزلہ مردہ زبان کے ہوگئی ہے اور اس لیے لوگوں سے اپنے دعوے کے ثبوت میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ دیکھو ، پڑھو ، سمجھو اور جانچو ۔

الغرض مرزا کی فارسی نظم و نثر کے متعلق ہماری رائے کا ماحصل یہ ہے کہ اُن کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا ، مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے ۔ اگرچہ مرزا کی غزل میں کہیں کہیں پیچیدگیاں ہیں اور نثر میں بھی اکثر فقرے نہایت پیچیدہ نظر آتے ہیں جو ممکن ہے کہ اہل زبان کے نزدیک فصاحت کے درجے سے گرے ہوئے ہوں ، مگر

ایسی کسروں سے کسی زبان دان یا اہل زبان کا کلام پاک نہیں ہو سکتا اور نہ ایسی جزوی فروگذاشتوں سے کسی کی اُستادی میں فرق آ سکتا ہے ، وللہ رد القایل :

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
در ید بیضا همه انگشتها یک دست نیست

مرزا کے اُردو کلام کی نسبت ہم دوسرے حصے میں بقدر ضرورت بحث کر چکے ہیں ۔ مرزا کا موازنہ شعرائے اُردو زبان کے ساتھ صرف غزل میں ہو سکتا ہے ؛ کیونکہ غزل کے سوا دیگر اصناف میں اُن کا کلام کان لم یکن ہے اور اُردو کی نثر میں دیگر شعرا بمقابلہ مرزا کے صفر محض ہیں ؛ مرزا کی غزل کا ڈھنگ اگرچہ میر و سودا کی روش پر نہیں ہے ، مگر خواص اہل ملک جو تقلید کی قید سے آزاد ہیں ، اُن کے چیدہ و برگزیدہ اشعار کو میر و سودا کے انتخاب سے کچھ کم پسند نہیں کرتے ۔

مرزا کی نثر اُردو نے تمام ہندوستان میں شہرت حاصل کی ہے اور خاص و عام نے بالاتفاق اُس کو پسند کیا ہے ؛ اُنھوں نے اُردو خط و کتابت میں ایک خاص طرز کی ایجاد کی ہے جو تمام ملک میں مقبول ہوئی ہے اور اکثر لوگوں نے اپنی بساط کے موافق اُس کی پیروی کی ہے ۔

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد مرزا کی نسبت یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ لٹریری قابلیت کے لحاظ سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اُٹھا اور چونکہ

زمانے کا رخ بدلا ہوا ہے اس لیے آئندہ بھی یہ آمید نہیں ہے کہ قدیم طرز کی شاعری و انشا پردازی میں ایسے با کمال لوگ اس سر زمین پر پیدا ہوں گے ۔

تمت بالخیر

یادگار غالب

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۱	۳	روز	روزے
۳۱	۱۲	بہ جاں	بہ خان
۳۱	۱۳	تبے	بتے
۳۳	۱۷	بود اعم	بہ وداعم
۳۵	۸	صله	صلۂ
۳۵	۱۷	منی	منے
۳۵	۱۸	روزنی	روزنے
۳۶	۹	و داد	وداد
۴۵	۳	خوں ناب	خوناب
۴۵	۱۶	دیدی	دیدے
۴۵	۱۶	گفتی	گفتے
۷۳	۳	وی	وے
۸۰	۵	بحر	بہر
۸۲	۸	گرد	گرو
۸۳	۱	انجید	رنجید

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۱۰۹	۲	—	وان
۱۱۷	۱۲	بایک	یا به یک
۱۱۷	۱۳	خاتم تا	تا خاتم
۱۲۹	۵	به دست	بد است
۱۳۷	۲۰	بدل	بذل
۱۴۹	۳	با	به
۱۴۹	۱۹	اولئی	اوئی
۱۵۰	۲۱	رو	رد
۱۷۹	۱۵	راه گزر	ره گزار
۱۸۹	۱۴	گناه	گنه
۱۹۲	۴	نگهت	نکهت
۲۰۸	۵	کا	میں
۲۱۱	۹	یہاں	یاں
۲۱۴	۲۰	ناگریزی	ناگزیری
۲۱۶	۳	خط	قط
۲۱۹	۸	کیجیے	کیجے
۲۲۳	۱۸	هم گرفتار هوئے	گرفتار هم هوۓ
۲۳۰	۴	مرزا	میرزا
۲۳۹	۱	هنری	ـ. هنری
۲۷۴	۱۰	گفتگار	گفتار
۲۸۳	۴	نگارو	نگارد
۲۸۸	۵	پریری	پذیری
۲۹۰	۶	ودنیا	دنیا

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۲۹۱	۲	ور	در
۲۹۲	۱۶	یابنده	پا بنده
۲۹۳	۲۰	—	چناں
۲۹۴	۲۰	گرد بتی	گرو بتی
۲۹۹	۵	العین	اربعین
۳۰۳	۸	از	ار
۳۰۴	۲	سرور دان	سرو رواں
۳۰۴	۱۳	ئنه	آئنه
۳۰۴	۱۳	مہر	مہر است
۳۰۷	۶	ذوق	ذوقے
۳۰۷	۱۹	بعلت	لعلت
۳۰۷	۲۰	بزبان	بزبانے
۳۰۹	۶	کشیده	کشیدهٔ
۳۰۹	۹	ندیده	ندیدهٔ
۳۰۹	۱۶	نحواسته	نخواسته
۳۱۱	۸	از نیم	ازیم
۳۱۱	۱۵	گفت به	گفت و به
۳۱۳	۳	کوساله	گوساله
۳۱۳	۵	در موافق	ور موافق
۳۱۴	۱۹	در گرد گاں	ور گروگاں
۳۱۴	۲۲	در گروگاں	ورگروگاں
۳۱۵	۱	گرد	گرو
۳۱۷	۱	شهدو	شهد و شیر

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۳۱۹	۳	توسن تازیانه	توسن ز تازیانه
۳۲۴	۲۲	بر فشان	بر نشان
۳۲۵	۹	آے	در آے
۳۲۶	۲	موجم	و موجم
۳۲۷	۸	همه من	وهمه بین
۳۲۷	۱۸	جابهٔ سخن	جا به سخن
۳۲۷	۱۹	بحت	بخت
۳۲۸	۱۱	نعیا	یغما
۳۳۱	۲۰	که	گهٔ
۳۳۳	۲	در دوا	درد وا
۳۳۴	۵	بنگرد	بنگر و
۳۳۴	۶	وهل	وصل
۳۳۵	۱۷	آموزگار انند	آمـوز روزگارانند
۳۴۵	۱۹	زدرد	زور و
۳۴۷	۲۱	بتگه	بنگهٔ
۳۴۸	۸	داری	رادی
۳۴۹	۱۸	رود	رو و
۳۵۳	۸	در	ور
۳۵۳	۱۹	دنیا شامی	و نیا شامی
۳۵۳	۲۰	دست	اوست
۳۵۶	۴	زود کو	زود ز کو
۳۵۷	۱۶	رس	رسو
۳۶۲	۳	راه	ره

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۳۶۳	۸	زور	ز در
۳۶۵	۳	ولیے	دلے
۳۶۵	۴	فخر متضمن	فخر متضمن شکوه
۳۶۵	۱۱	شکوه	
۳۶۶	۱۵	و آن کس	وان کس
۳۶۶	۲۱	دانند	دانی
۳۶۷	۴	وگر هم	وگر مرهم
۳۷۵	۴	بگویش	بکویش
۳۷۷	۵	ور	در
۳۸۰	۸	جهان سان	جهانیان
۳۸۱	۲	رود و	رود
۳۸۱	۱۸	من به	من دل به
۳۸۲	۷	جوانی	جوانے
۳۸۲	۹	شناسی	شناسے
۳۸۲	۱۰	گزارے	مگزارے
۳۸۳	۹	نفس	نفسم
۳۸۳	۲۲	نهد دل	دل نهد تا
۳۸۹	۶	پائی درحنا	پاے درحنا
۳۸۹	۸	نه	به
۳۹۳	۳	پادشاه	پادشا
۳۹۹	۲۰	از	ار
۴۰۰	۱۹	دروعی	دروغے
۴۰۸	۲	وا به جو	وایه جو

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۳۰۹	۵	خم در	خم که در
۳۲۲	۲۳	قطع	نطع
۳۲۳	۲۴	در دانه	دردانه
۳۲۴	۲۴	وگر یا	—
۳۲۷	۱۰	ملک گر	ملک و گر
۳۲۹	۱۳	روشن	روش
۳۳۳	۸	دران	وران
۳۳۳	۸	دری	وری
۳۳۴	۱۲	هم راه	هم رهٔ
۳۳۴	۱۹	درد سر	درد ستوه
۳۳۴	۲۰	اگر دوست	اگر از دوست
۳۳۶	۱۳	مکه	ملکه
۳۳۶	۱۷	پیشه	بیشه
۳۴۰	۷	سن	به حسن
۳۴۰	۸	نشت	نبشت
۳۴۰	۲۸	آزمود گار	آموزگار
۳۴۴	۱۶	عید الضحیٰ	عید اضحیٰ
۳۴۴	۲۲	خزد	خزو
۳۴۶	۱۹	پرستاری وتن	پرستاری وثن
۳۴۷	۱	زنار دن	ز نارون
۳۴۷	۱۳	آدای	آوای
۳۴۸	۲۳	رسوئی	رسوائی
۳۴۸	۲۴	کوز	ثور

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۴۶۲	۲۰	از میوه گل و	از میوه و گل
۴۶۴	۱۱	ه	گه
۴۶۴	۱۳	تیره	تیرهٔ
۴۶۵	۱۶	شه	شد
۴۶۷	۲	کندش	کنندش
۴۶۷	۹	هیچ	پیچ
۴۶۷	۱۳	دادهم	و ادهم
۴۷۱	۳	کر	گر
۴۷۳	۱۹	شنا ساوری	شناساوری
۴۷۴	۲۲	برده	پرده
۴۷۵	۱۲	آفریندهٔ	آفرینندهٔ
۴۷۷	۱۷	درد نان	درو نان
۴۷۸	۱۹	نازنگان	نازندگان
۴۸۲	۱۳	امسگران	رامشگران
۴۸۶	۴	فرزانهٔ و خشور	فرزانه وخشور
۴۸۶	۱۵	بوے	به وے
۴۸۷	۱۴	صدایش	صدائیش
۵۲۳	۱۱	کشایت	کشائیت
۵۲۳	۱۲	خایت	خائیت
۵۶۲	۱۰	از رانی	ارزانی
۵۶۳	۱۶	شبلی تخت	شبلی و تخت

مجلس ترقی ادب لاہور